ملفوظاتِ رومی

فیہ ما فیہ

مولانا جلال الدین رومی

ترجمہ
عبدالرشید تبسم

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

فہرست مضامین

پیش لفظ

مولانا جلال ُ الدین جنہیں عام پڑھے لکھے لوگ مولوی رومی اور ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ مولائے روم کہہ کر پکارتے ہیں، اپنی شہرۂ آفاق مثنوی کی وجہ سے روشناسِ عالم ہیں۔ مثنوی کے بعد ان کے ضخیم مجموعہ ٔ غزلیات کا نمبر آتا ہے جو دیوانِ شمس تبریز کے نام سے مطبوع ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ فارسی نثر کی ایک کتاب بھی اُن سے منسوب ہے جو درحقیقت گذشتہ پچیس تیس سال کی دریافت ہے۔ اس سے قبل کم از کم پاک و ہندبر صغیر اور ایران کا عام پڑھا لکھا طبقہ اس تصنیف کے وجود سے قطعاً ناآشنا تھا۔ وہ تصنیف "فیہ ما فیہ" ہے، جس کا ترجمہ "ملفوظاتِ رومی" کی صورت میں آج پیش کیا جارہا ہے۔ عوام تو ایک طرف خواص کو بھی "فیہ ما فیہ" کے کسی نسخہ کی زیارت نصیب نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ کسی پرانے تذکرہ میں اس کا نام پڑھ لیا اور بس۔ مشہور مستشرق پروفیسر نکلسن، جس کی نظر سے فارسی ادب کا کوئی گوشہ چھپا ہوا نہ تھا، اپنے انگریزی مقدمہ ٔ انتخاب دیوان شمس تبریز مطبوعہ ٔ کیمبرج کے صفحہ ۷۰ اپر رقمطراز ہیں:

"جلال ُ الدین نثر کے بھی ایک رسالہ کے مصنف ہیں، جس کا نام "فیہ ما فیہ" ہے۔ یہ رسالہ تین ہزار شعروں پر مشتمل ہے۔ اس میں زیادہ تر معین ُ الدین پروانہ سے رومی کا خطاب ہے۔ اس رسالہ کے قلمی نسخے نایاب ہیں۔"

گویا پروفیسر نکلسن کے نزدیک "فیہ ما فیہ" نثر کی ایک ایسی کتاب تھی جس میں

تین ہزار شعر تھے۔ باقی رہے پاک و ہند بر صغیر کے محققین ادب، سو مولانا شبلی نعمانی سوانح مولانا رومی مطبوعہ کانپور کے صفحہ ۴۶ پر مولانا روم کی تصانیف کے عنوان کے ماتحت کہتے ہیں:

> "فیہ مافیہ" یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے، جو مولانا نے وقتاً فوقتاً معین الدین پروانہ کے نام لکھے۔ یہ کتاب بالکل نایاب ہے۔ سپہ سالار نے اپنے رسالہ میں ضمناً اس کا تذکرہ کیا ہے۔"

یہ دو اقتباس اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ صدیوں تک اہلِ علم حضرات کو "فیہ مافیہ" کے وجود کا صحیح علم نہ ہوا، اور نہ یہ کبھی باقاعدہ کتابی صورت میں عوام تک پہنچی۔

"فیہ مافیہ" کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں۔ یہ دراصل مولانا روم کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ آپ کے تجرِ علمی کی شہرت آپ کے حینِ حیات ہی میں دُور دور تک پہنچ چکی تھی۔ نزدیک و دور سے اہلِ علم آپ کی مجلس میں کھنچے آتے اور اپنے اپنے مسائل پیش کرتے۔ مولانا ان مسائل پر روشنی ڈالتے جس سے نہ صرف سائل ہی مطمئن ہوتا بلکہ دوسرے حاضرینِ مجلس بھی بہت کچھ استفادہ کرتے۔ ان علمی مجالس میں مولانا جو ارشادات فرماتے، آپ کے صاحبزادہ سلطان بہاء الدینؒ انہیں محفوظ کر لیتے۔ "فیہ مافیہ" اُنہی ارشاداتِ گرامی کا مجموعہ ہے۔ ان ملفوظات کا تخاطب زیادہ تر آپ کے ایک خاص مرید مُعین ُالدین پروانہ سے ہے، جو وزیرِ سلطنت تھے۔ لیکن ان کے علاوہ دوسروں کی طرف بھی رُوئے سخن ہے۔

مولانا جلال ُالدین رُوم ۶ ربیع الاوّل ۶۰۴ھ کو تولد ہوئے، اور ۵ رجمادی الثانی ۶۷۲ھ کو رحلت فرما گئے۔ سلطان بہاء الدین نے "فیہ مافیہ" کی تسوید ۴ رمضان

اا۷ھ کو مکمل کی[1]

سب سے پہلے اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کا سہرا مولانا عبدالماجد دریابادی کے سر ہے۔ انہوں نے اسے ۱۹۲۸ء میں اعظم گڑھ میں چھاپا۔ اس کے بعد پروفیسر بدیع الزمان فروزانفر نے ۱۹۵۰ء میں نسخ ٹائپ میں طہران سے شائع کیا۔ گویا اس وقت "فیہ ما فیہ" کے دو مختلف ایڈیشن بازار میں موجود ہیں۔ ایک ہندی ایڈیشن اور دوسرا ایرانی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے ایڈیشن کا جو دیباچہ لکھا، اس سے ہندی ایڈیشن کی یہ ہسٹری معلوم ہوتی ہے کہ ۱۹۲۰ء میں ریاست رام پور کے سرکاری کتب خانہ میں فیہ ما فیہ کا ایک بوسیدہ اور کرم خوردہ نسخہ ان کی نظر سے گزرا۔ اس سے ان کے دل میں تجسس پیدا ہوا۔ ۱۹۲۳ء میں انہیں حیدر آباد دکن میں دو نسخے ہاتھ آگئے۔ ان میں ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ کا تھا۔ تینوں نسخوں کا باہم مقابلہ کیا تو کتب خانہ آصفیہ والا نسخہ زیادہ صحیح نکلا۔ انہوں نے اس باب میں پروفیسر نکلسن سے خط وکتابت کی، اور کتب خانہ آصفیہ والے نسخے کی نقل انہیں ارسال کر دی۔ پروفیسر نکلسن نے وہ نقل اپنے ذی علم دوستوں کے پاس قسطنطنیہ بھیج دی جنہوں نے وہاں اس پر ریسرچ کی، اور ۱۹۲۴ء میں رسالہ مذکور کی ایک نہایت خوشخط اور صحیح نقل قسطنطنیہ سے مولانا دریابادی کے پاس پہنچ گئی۔ یہ نقل قسطنطنیہ کے چار قلمی نسخوں سے مقابلہ کے بعد تیار ہوئی تھی۔ مزید تسلی کے لیے مقابلہ و تصحیح میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے سات علماء سے مدد لی، جن میں سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی بھی شامل ہیں۔

ایرانی ایڈیشن کی سرگزشت بھی تقریباً ایسی ہی ہے۔ ایران کے پروفیسر بدیع

---

[1] سلطان بہاء الدین نے (فیہ ما فیہ ایرانی ایڈیشن، صفحہ ۲۳۵) عربی میں لکھا کہ وہ اس کتاب کی تسوید سے ۱۵۷۱ء میں فارغ ہوئے۔ ایران میں شمسی سال شمار ہوتا ہے۔ اس لیے ہجری سال ۷۱۱ ہوا۔

الزمان فروزانفر جب مولانا روم کا منظوم کلام، مثنوی اور دیوان شمس تبریز مطالعہ کرتے تو انہیں سمجھنے کے لیے "قران کے معنی قرآن ہی سے پوچھو" کے مصداق مولانا روم ہی کے ملفوظات یعنی فیہ ما فیہ کی طرف رجوع کرتے۔ ان کے پاس خطِ نسخ میں لکھا ہوا فیہ ما فیہ کا ایک نسخہ تھا، جس کی صحت کے متعلق وہ متردّد رہتے۔ آخر انہیں کتاب خانہ ملّی سے ایک معتبر نسخہ مل گیا، جس کی کتابت ۸۸۸ھ کی تھی۔ آقائے ڈاکٹر محمد مُعین سے انہوں نے ان دو نسخوں کا مقابلہ کرلیا، تو خطِ نسخ والے نسخے میں بہت تحریف و اضافۂ عبارات پایا۔ انہوں نے آقائے تقی تفضّلی سے جو کتاب خانہ مجلس شوریٰ ملّی سے متعلق تھے، مزید تحقیق کرائی تو معلوم ہوا کہ استنبول میں تین نسخے موجود ہیں۔ یہ وہی نسخے تھے جن سے مولانا عبدالماجد دریابادی نے پروفیسر نکلسن کی وساطت سے کتب خانہ آصفیہ والے نسخہ کا مقابلہ کرایا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر غاظنوی کی جدوجہد سے پروفیسر بدیع الزمان فروزانفر کو ان استنبولی نسخوں کے عکس مل گئے۔ ان نسخوں سے پروفیسر صاحب نے نسخۂ ملّی کا مقابلہ کیا۔ اور نتیجہ کے طور پر موجودہ ایرانی ایڈیشن معرضِ وجود میں آیا۔ پروفیسر صاحب نے کل آٹھ نسخوں سے نسخۂ ملّی کا مقابلہ کیا، لیکن زیرِ نظر ایرانی ایڈیشن کی بنیاد استنبولی نسخوں ہی پر رکھی۔

اوپر بیان کردہ واقعات سے ظاہر ہے کہ ہندی ایڈیشن اور ایرانی ایڈیشن کے متن استنبولی نسخوں پر مبنی ہیں۔ اس اعتبار سے ان دو ایڈیشنوں کے متن میں اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے متن میں جابجا اختلاف موجود ہے، یہاں تک کہ بعض جگہ ایک متن کے صفحوں کے صفحے دوسرے متن سے نہیں ملتے، اور بعض مقامات پر تو ان کا مطلب ایک دوسرے کی ضد ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم طوالت کے خوف سے یہاں صرف پانچ پانچ اقتباس ان ایڈیشنوں سے پیش کرتے ہیں، جن سے یہ اختلاف واضح ہو

جائے گا۔

۱۔ ہندی ایڈیشن، صفحہ ۸۹ :

"اکنوں اگر دربیت مبالغہ کنیم در حق عاشق آں مبالغہ نباشد۔"

ایرانی ایڈیشن، صفحہ ۹۸ :

"اگر دربیت مبالغہ کنیم در حق معشوق آں مبالغہ نباشد۔"

۲۔ ہندی ایڈیشن، صفحہ ۲۱ :

"ہمچنیں علمائے ایں زماں در علوم موی می شگافند و چیزہائے دیگر راکہ بایشاں تعلق دارد بغایت دانستہ اند۔"

ایرانی ایڈیشن، صفحہ ۱۷ :

"اکنوں ہمچنیں علماء اہلِ زماں در علوم موئ شگافند و چیزہائے دیگر راکہ بایشاں تعلق ندارد بغایت دانستہ اند۔"

۳۔ ہندی ایڈیشن، صفحہ ۳۵ :

"ہر کہ از دُور نظر کند علم تنہا بیند اما آنکہ از نزدیک نظر کند وزیرِ علم خلقے بیند و ایں دُوری و نزدیکی بہ مسافت نیست یعنی غافل ہمیں تن بیند و دانا چوں نظر کند بداند کہ دروچہ گوہرہا وچہ معنی ہاست۔"

ایرانی ایڈیشن :

"ہر کہ از دُور نظر کند عَلم تنہا بیند تا آنکہ از نزدیک نظر کند بداند کہ دروچہ گوہرہاست وچہ معنی ہاست۔"

۴۔ ہندی ایڈیشن، صفحہ ۵ :

"چنانچہ عرب مثل می گوید نحن تعلّمنا ان نُعطیَ مَا تعلّمنا اَن فاخذ پس علی کل حال ایشاں مزور باشند و امرا زائر خدا تعالیٰ فرمود بر علم خود و قوت و قدرت خود تاکید مکید و عالم و قوی و قادر مرادانید شما از استعانت بغیر و التجا بامرا و سلاطین نگاہ دارم ایاك نستعین بگوئید۔ در خاطرم چوں چنیں می آید کہ ایں را تفسیرے می کنم اگرچہ مناسب ایں مقال نیست اما در خاطرم چو چنیں می آید پس بگوئم تا برود۔"

ایرانی ایڈیشن، صفحہ ۲ :

"چنانک عرب مثل می گوید نحن تعلّمنا اَن نُعطیَ مَا تعلّمنا اَن فاخذ پس علی کل حال ایشاں مزور باشند وامرا زائر۔ در خاطرم می آید کہ ایں آیت را تفسیر کنم اگرچہ مناسب ایں مقال نیست گفتم اما در خاطر چنیں می آید پس بگوئم تا برود۔"

۵۔ ہندی ایڈیشن، صفحہ ۱۱ :

"تمیز آں یک صفست مخفی در آدمی۔ نمی بینی کہ دیوانہ ہم جسد و دست و پا دارد و اما تمیز ندارد۔ بہر نجاست دست می بر دو می گیر دو می خورد و اگر ایں تمیز دریں وجود ظاہر بودے نجاست وانگرفتے پس دانستم کہ تمیز آں معنی لطیف است کہ در تست۔"

ایرانی ایڈیشن :

"تمیز آں یک صفت است نمی بینی کہ دیوانہ در دست و پاہست

اما تمیز نیست۔ تمیز آں معنی لطیفست کہ در گست۔"

غرضیکہ فیہ ما فیہ کے ہندی ایڈیشن کا متن اور ایرانی ایڈیشن کا متن ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ ہمارے سامنے نہ تو کتب خانہ آصفیہ والا نسخہ ہے، نہ ایران کا نسخۂ ملی، اور نہ استنبولی نسخوں تک ہماری رسائی ہے۔ اس لیے ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ ان میں زیادہ معتبر متن کونسا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں مولانا عبدالماجد دریابادی کی رائے ایرانی ایڈیشن کے متعلق کیا ہے۔ لیکن پروفیسر بدیع الزمان فروزانفر نے اپنے ایڈیشن کے دیباچہ میں کہا ہے کہ "مولانا دریابادی والے نسخے کی بنیاد قدیم نسخوں پر نہیں، اس لیے وہ قابلِ اعتماد نہیں، اور یہ کہ اس میں حشو و زوائد راستہ پا گئے ہیں۔" پروفیسر صاحب کا یہ بیان غلط ہو یا صحیح، دو باتیں واضح ہیں۔ ایک یہ کہ مولانا عبدالماجد دریابادی اس وادی میں پیش رَو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ان کا ہندی ایڈیشن جیسا بھی ہے، معرضِ وجود میں نہ آتا، تو آج ایرانی ایڈیشن بھی موجود نہ ہوتا۔ دوسرے یہ کہ فیہ ما فیہ کو صحیح ترین صورت میں شائع کرنے کے لیے ابھی ریسرچ کی ضرورت ہے۔ اس ریسرچ کا صحیح طریق یہ ہے کہ کوئی صاحبِ ذوق اور صاحبِ توفیق ریسرچ سکالر یہاں سے اور ایران سے وہ اصل مواد حاصل کرنے کے بعد جسے مولانا عبدالماجد اور پروفیسر بدیع الزمان نے استعمال کیا، ترکی کا سفر اختیار کرے اور وہاں بیٹھ کر تمام قلمی نسخوں سے خود استفادہ کرے۔ اس قبیل کے نسخوں کی "نقلوں" اور "عکسوں" میں ہمیشہ اختصار اور کفایت شعاری سے کام لیا جاتا ہے جس سے مسودہ کامل اعتبار کے درجہ سے گر جاتا ہے۔

متن کی صحت کے بعد کتابت کی صحت کا نمبر آتا ہے۔ ہندی ایڈیشن لیتھو پریس میں چھپا اور لیتھو کی چھپائی کتابت کی غلطیوں کے لیے صحیح طور پر بدنام ہے۔ ہزار کوشش کے باوجود لیتھو میں کتابت کی غلطیاں ضرور رہ جاتی ہیں۔ ہمارے یہاں کے کاتب

الا ماشاء اللہ فارسی عربی سے قطعاً نابلد ہوتے ہیں۔ اس لیے بالخصوص فارسی اور عربی مضامین کی کتابت میں ان سے زیادہ غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ فیہ ما فیہ میں بھی کتابت کی غلطیوں کی بھرمار ہے، جس سے پڑھنے والے کا دل یقیناً برا ہوتا ہے۔ ٹائپ کی چھپائی میں اگر پوری توجہ دی جائے تو اس قسم کی غلطیوں کا امکان نہیں رہتا۔ لیکن فیہ ما فیہ کا ایرانی ایڈیشن جو ٹائپ سے چھپا ہے، ٹائپ کی بے شمار غلطیوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ غلطیاں کسی صورت سو سوا سو سے کم نہیں۔ نمونہ کے طور پر اس میں سے صرف ایک فقرہ نقل کیا جاتا ہے، جو ٹائپ سے یوں چھپا ہے:

"لبن عطا گوید انبیاء و لولیاء را علیہم السلّام بگناہ بتلا کرد۔"

(ایرانی ایڈیشن، صفحہ ۳۸۳)

ایرانی ایڈیشن ان خامیوں کے باوجود چونکہ ہندی ایڈیشن سے تقریباً ربع صدی بعد کی پیداوار ہے، اور اس وقت تک یہ آخری نسخہ ہے۔ اس لیے ہم نے ترجمہ اسی ایڈیشن کا کیا ہے۔ ہمارا ترجمہ ایرانی ایڈیشن کے بالکل مطابق ہے اور اس کی صحت و عدم صحت دیکھنے کے لیے اس کا مقابلہ ایرانی ایڈیشن ہی سے کرنا چاہیے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، فیہ ما فیہ مولانا روم کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ مولانا جو رموز و اسرار اپنی علمی مجلسوں میں مریدوں سے بالمشافہ بیان فرماتے یا مریدوں کے سوالات پر تشریحات کرتے، وہ محفوظ کر لی جاتیں۔ ان اسرار و رموز کے اردو ترجمہ یعنی "ملفوظاتِ رومی" کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا کہ فیہ ما فیہ میں بیان کردہ مسائل تقریباً وہی ہیں، جنہیں مولانا نے اپنی ضخیم مثنوی میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے۔ پھر دیوانِ شمس تبریز میں جو تغزل ہے، وہ بھی انہیں رموز و اسرار سے مملو ہے۔ یہ تمام صورتِ حال اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ مثنوی مولانا رومؒ اور دیوانِ شمس تبریز کو

سمجھنے کے لیے فیہ ما فیہ کا مطالعہ بے حد مفید ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو لوگ کسی وجہ سے مولانا کی مثنوی اور دیوان کا مطالعہ نہ کر سکیں، وہ صرف فیہ ما فیہ کو پڑھ کر مولانا کے بنیادی تصورات سے بڑی حد تک روشناس ہو سکتے ہیں۔ فیہ ما فیہ کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ جہاں مولانا کا منظوم کلام مختلف اصناف میں ہزار ہا ابیات اور کئی جلدوں پر مشتمل ہے، وہاں یہ مولانا کی واحد نثر ہے۔ اس کے علاوہ مولانا کی کوئی نثر موجود نہیں۔ بالفاظِ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس شخص نے فیہ ما فیہ کو نہیں پڑھا، مولانا رومی کے متعلق اس کا مطالعہ ادھورا اور نامکمل ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ فیہ ما فیہ کے سارے فارسی اور عربی متن کو سمجھ سکنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں، بلکہ بعض فقروں کو سمجھ سکنا شاید کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا شمار ان چند علم دوست بزرگوں میں ہے، جن کا مطالعہ نہایت وسیع اور جو فارسی، عربی ادبیات پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

"اصل کتاب میں متعدد فقرے ایسے ہیں، جن کا کوئی مطلب میں نہیں سمجھ سکا ہوں۔" (فیہ ما فیہ، صفحہ ۷)

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مولانا رومی کے زمانہ میں شارٹ ہینڈ یا زود نویسی کی کوئی دوسری ترکیب موجود نہ تھی۔ نوٹ لینے والے صاحبان محض اپنی یادداشت کے لیے اپنی سمجھ کے مطابق مقرر کے بعض خاص خاص الفاظ جلدی میں نوٹ کر لیتے ہوں گے، جنہیں لمبا عرصہ گزرنے کے بعد اگر مربوط عبارت میں پیش کرنا مقصود ہوتا ہو گا تو اچھی خاصی دقت ہوتی ہو گی۔ مولانا رومیؒ کے ملفوظات ہی کو لیجیے۔ مولانا روم کا انتقال ۶۷۲ھ میں ہوا، اور سلطان بہاء الدین نے ان ملفوظات کو جو ان کے ذہن میں یا مختصر نوٹوں کی صورت میں ہوں گے، ۷۱۱ھ میں مسودہ کی صورت میں منتقل کیا۔ فیہ ما فیہ کی عبارت

کئی مقامات پر ٹیلیگرافک قسم کی عبارت ہے، جس کا مفہوم واضح نہیں۔ پھر یہ ٹیلیگرافک قسم کی عبارت بھی مرتب کو جس حال میں میسر آئی، وہ یہ تھا:

"ہر فصل کی عبارت کو مختلف پیراگرافوں میں توڑنے کی جرأت بھی میں نے ہی کی ہے، ورنہ ہر نسخہ میں ہر فصل کی عبارت مسلسل تھی، اور ہندی نسخوں میں تو فصلیں ہی نہ تھیں۔ فصلیں صرف استنبولی نسخہ میں تھیں۔ (فیه ما فیه، ہندی ایڈیشن، صفحہ ٦)

یہی وجہ ہے کہ ہندی ایڈیشن اور ایرانی ایڈیشن کی فصلیں منطبق نہیں۔ ایک ایڈیشن میں کوئی فصل عبارت کے کسی حصہ سے شروع ہوتی ہے تو دوسرے ایڈیشن میں وہی فصل عبارت کے کسی قطعاً دوسرے مقام سے چل نکلتی ہے۔

فیه ما فیه کے ایرانی ایڈیشن میں کُل ٧٤ فصلیں ہیں، ان میں سے ٦٨ فصلیں فارسی میں ہیں اور ٦ فصلیں عربی میں۔ بعض فصلوں کی عبارت کسی خاص مسئلہ سے تعلق نہیں رکھتی، یا ایسے مبہم اشارات و کنایات پر مشتمل ہے کہ معلوم ہوتا ہے، حاضرینِ مجلس کو اصل مسئلہ کا علم تھا۔ مولانا نے اشارت میں اس مسئلہ کے کسی پہلو پر رائے زنی کر دی جس سے حاضرین کو فائدہ پہنچ گیا ہو گا۔ مگر سات سو سال کے بعد جب وہ عبارت ہم تک پہنچی تو ہمارے لیے ایک معمہ ثابت ہوئی۔ فیه ما فیه کی ایسی عبارتوں کو سامنے رکھ کر اگر کسی سے پوچھا جائے کہ ان میں کیا مطلب پوشیدہ ہے، تو جواب دینے والا بہت کچھ سر کھجانے کے بعد عربی میں زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکے گا کہ فیه ما فیه، اس میں وہی کچھ ہے، جو ہے۔ غالباً مطالب کی یہی ژولیدگی فیه ما فیه کی وجہ تسمیہ ہے۔ اس کتاب میں شروع سے لے کر اخیر تک جو بات ادبی مذاق پر بہت گراں گزرتی ہے، وہ یہ ہے کہ اکثر فقروں کے آدھے حصہ میں مخاطب کو "تو" کہہ کر خطاب کیا گیا اور آدھے حصہ میں "شما"

سے خطاب ہے۔ اسی طرح فقرہ کے آدھے حصے میں متکلم "من" ہے اور آدھے میں "ما"۔

فیہ ما فیہ کے بعض مقامات پر فارسی اور عربی عبارات کی بے ربطی، ژولیدگی اور مطالب کے فقدان سے قارئین کا دل منغّض نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ مولانا رُوم کو انتقال فرمائے سات سو برس سے اوپر ہو چکے ہیں۔ کیا یہ غنیمت نہیں کہ ان کے ملفوظات کا تبرک کسی حالت میں سہی، اتنے انقلاباتِ زمانہ کے باوجود ہمارے ہاتھوں تک پہنچ گیا۔ آخر کتاب کے بہت بڑے حصہ کی عبارت صاف ہے اور اس کے مطالب واضح ہیں۔

فیہ ما فیہ کو اُردو میں ترجمہ کر کے اسے ملفوظاتِ رومی کی شکل میں پیش کرنے میں ہمیں بہت عرق ریزی کرنا پڑی ہے۔ اصل کتاب میں کسی فصل کا کوئی عنوان نہیں، صرف "فصل" لکھ کر عبارت شروع کر دی گئی ہے۔ بہت کم فصلوں میں پیراگراف موجود ہیں۔ چھ چھ صفحہ کی بعض فصلیں ایک ہی پیراگراف میں ہیں۔ ہم نے مضامین کے اعتبار سے عنوان مقرر کر دیئے ہیں اور ہر فصل کو متعدد پیروں میں توڑ دیا ہے۔ اس سے قارئین کو مطالعہ میں بہت سہولت ہو جائے گی۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ بعض فصلوں میں مولانا نے بیک وقت کئی مسائل پر دو دو چار چار فقروں میں رائے زنی فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سب مختلف مسائل کو ایک ہی عنوان کے تحت لانا ممکن نہ تھا۔ اور ہر دو فقروں کے بعد نیا عنوان مقرر کرنا بھی کچھ بھدا سا لگتا۔ ایسے مقامات پر اس مسئلہ کے متعلق عنوان دے دیا گیا ہے، جس سے عبارت کا زیادہ تعلق تھا۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فِیهِ مَا فِیهِ

عالم اور صحبتِ اُمراء

حضور سرورِ کائنات نے فرمایا:

شر العلماء من زار الامراء و خیر الامراء من زار العلماء نعم الامیر علی باب الفقیر رئیس الفقیر علی باب الامیر.

علماء میں سے بدترین عالم وہ ہے جو امراء کی ملاقات کو جائے اور امراء میں سے بہترین امیر وہ ہے جو عالم کی زیارت کو جائے۔ بہتر ہے وہ امیر جو فقیر کے دروازہ پر ہو اور بدتر ہے وہ فقیر جو امیر کے دروازہ پر ہو۔

لوگوں نے ارشادِ نبوی کا یہ مطلب لیا ہے کہ عالم کو کسی امیر کی زیارت کے لیے نہیں جانا چاہیے، تاکہ اس کا شمار بدترین علماء میں نہ ہو۔ اصل مطلب وہ نہیں جو یہ لوگ سمجھے ہیں، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ عالموں میں سے بدترین عالم وہ ہے جو امراء سے مدد لے، جس کی بہتری اور استحکام امراء کے توسط سے ہو اور جو ان کے ڈر سے اچھے کام کرے۔ درحقیقت ایسا آدمی پہلے اس نیت سے علم حاصل کرتا ہے کہ امراء اسے صلہ دیں۔ اس کی عزت کریں اور اسے منصب عطا کریں۔ پس اس نے محض امراء کی وجہ سے اپنے آپ کو بہتر بنایا اور جہالت کو چھوڑ کر علم حاصل کیا۔ جب وہ عالم بن گیا تو امراء کے خوف اور تحکم سے مؤدب ہوا۔ وہ کامیاب ہو یا ناکام، ان کے موافق طریق پر چلتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب عالم کی یہ کیفیت ہو تو خواہ امیر اس کی زیارت کو جائے اور خواہ وہ امیر کی زیارت کرے، ہر حالت میں زائر عالم ہی ٹھہرتا ہے۔ اور امیر مزور رہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر عالم نے امراء کی وجہ سے علم حاصل نہیں کیا، بلکہ اوّل سے آخر تک اس نے تحصیلِ علم خُدا کی خاطر کی اور اس کا طریقِ کار اور جدوجہد نیکی کے لیے تھی، کہ یہ اس کی طبیعت کا تقاضا تھا۔ اور وہ علم کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا، جس طرح مچھلی پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ تو ایسے عالم کی راہنمائی اور تادیب عقل کرتی ہے، بلکہ اس کے زمانہ میں ساری دُنیا اس کی ہیبت سے ادب کرتی ہے اور اس کے سایہ اور پرتو تک سے مدد چاہتی ہے۔ خواہ وہ اس سے آگاہ ہو یا نہ ہو۔ ایسا عالم اگر امیر کے پاس جائے تو امیر زائر ہے اور وہ مزور۔ کیونکہ ہر حالت میں امیر ہی اس سے کچھ لیتا اور فائدہ اٹھاتا ہے اور مدد حاصل کرتا ہے۔ اور وہ علام اس امر سے بے نیاز ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے آفتاب نور بخشنے والا ہے۔ اس کا کام عطا اور بخشش ہے۔ اس کا عام طریقہ ہے کہ وہ پتھروں کو لعل یاقوت بناتا ہے اور مٹی کے پہاڑوں کو تانبا، سونا، چاندی، لوہا بنا دیتا ہے۔ مٹی کو سرسبز اور تازہ کرتا ہے۔ اور درختوں کو قِسم قِسم کے پھل بخشتا ہے۔ آفتاب کا پیشہ عطا ہے۔ وہ بخشش کرتا ہے خود کچھ قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ ایک عربی ضرب المثل ہے:

نحنُ تعلّمنا ان نعطي وما تعلمنا ان ناخذ۔ ہم نے دینا سیکھا ہے، ہم نے لینا نہیں سیکھا

مولانا عبدالماجد والے نسخے میں اس سے آگے یوں ہے:

خدا تعالیٰ نے فرمایا اپنے علم، طاقت اور اختیارات پر تکیہ نہ کرو۔ مجھے ہی علام قوی اور قادر سمجھو، تاکہ تمہیں غیر سے مدد مانگنے اور امیروں اور بادشاہوں کے سامنے التجا کرنے سے بچاؤں۔ کہو:

ایاکَ نعبد و ایاک نستعین.
ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

ایک آیت کی تفسیر:

میری طبیعت چاہتی ہے کہ میں اس آیت کی تفسیر کروں۔ اگرچہ یہ میری اس گفتگو کے مناسبِ حال نہیں۔ پھر بھی میری طبیعت کا یہ اقتضا ہے تو میں تفسیر کر ہی دیتا ہوں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

یآ ایها النبی قل لمن فی ایدیکم من الاسری ان یعلم الله فی قلوبکم خیرا یوتکم خیرا ممآ اخذ منکم ویغفرلکم والله غفور الرحیم (الانفال: ع ا)

اے پیغمبر (ﷺ)! ان قیدیوں سے جو تم مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں، یہ کہہ دو کہ اگر خدا تمہارے دلوں میں نیکی دیکھے گا تو جو کچھ تم سے چھینا گیا ہے، اس سے بہتر تمہیں عطا کرے گا اور تمہیں بخشے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت کی شانِ نزول یہ تھی کہ حضور سرورِ کائنات ﷺ نے کافروں کو شکست فاش دی تھی۔ ان میں سے کچھ قتل ہو گئے تھے اور ان میں سے بہت سے کافر دست وپابستہ کر کے قیدی بنا لیے تھے۔ اور ان اسیروں میں حضور ﷺ کے ایک چچا عباسؓ تھے۔ یہ لوگ قید وبند اور عجز و مذلت میں ساری رات گریہ وزاری کرتے رہے۔ ان کی ہر اُمید منقطع ہو چکی تھی۔ اور وہ قتل کیے جانے کے انتظار میں تھے۔ حضور سرورِ کائنات ﷺ نے انہیں دیکھا اور ہنس دیئے۔ کافر بولے، دیکھا؟ اس میں بشریت ہے۔ یہ جو دعویٰ کرتا تھا، مجھ میں بشریت نہیں ہے، سچ نہ تھا۔ اس نے ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا ہے اور ہمیں طوق و زنجیر میں جکڑے ہوئے اپنے قیدی پایا ہے تو بہت خوش ہوا

ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے اہلِ نفس لوگ دشمن پر فتح پا کر اسے پنجۂ قہر میں دیکھتے ہیں تو بہت شادماں ہوتے ہیں اور خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ حضور سرورِ کائنات ﷺ نے ان کے دل کی بات سمجھ لی۔ اور فرمایا، "نہیں! میں ہر گز اس وجہ سے نہیں ہنسا کہ دشمنوں کو اپنے زبردست دیکھ رہا ہوں، یا یہ کہ تم گھاٹے میں ہو، اس لیے خوش ہؤا ہوں۔ بلکہ مجھے اس بات پر ہنسی آئی ہے کہ چشمِ باطن دیکھ رہا ہوں کہ ایک قوم کو غلاظت کی جگہ دوزخ اور دُودانِ سیاہ سے میں طوق و زنجیر میں جکڑ کر بہشت، دربانِ خلد اور گلستانِ ابدی کی طرف زبردستی کھینچے لیے جاتا ہوں اور وہ قوم آہ و فغاں اور گریہ و زاری کر رہی ہے کہ ہمیں اس مہلک اور خطرناک جگہ سے تو اس باغِ بہشت اور امن کی جگہ کیوں لے جا رہا ہے۔ اس ساری بات پر مجھے ہنسی آ رہی ہے۔ چونکہ تمہیں ابھی وہ نظر حاصل نہیں جس سے تم وہ سب دیکھ سکو، جو میں کہہ رہا ہوں، اس کو سمجھو اور صاف طور پر دیکھو۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اسیروں سے کہہ دے کہ پہلے تم نے لشکر جمع کیے، بہت شوکت دکھائی۔ اپنی جوانمردی، پہلوانی اور شان و سطوت پر پوری پوری خود اعتمادی ظاہر کی۔ اور تم نے اپنے آپ سے کہا، ہم یہ کر دیں گے، ہم وہ کر دیں گے۔ ہم مسلمانوں کی طاقت کو توڑ کر رکھ دیں گے۔ ان پر قہر نازل کریں گے۔ تم نے اپنے آپ سے کسی کو قوی تر نہ سمجھا۔ اور نہ اپنے آپ سے کسی کو زیادہ زبردست اور سخت گیر تسلیم کیا۔ لیکن تم نے جو بھی منصوبہ باندھا کہ اس سے یوں ہو جائے گا اور یوں ہو جائے گا، نتیجہ اس کے برعکس ہی نکلا۔ اب تم پر خوف طاری ہے۔ پھر بھی تم نے اپنی اس حرکت سے توبہ نہیں کی۔ تم مایوس ہو چکے ہو۔ اور تمہیں اپنے آپ پر قدرت حاصل نہیں رہی۔ تو اب چاہیے کہ تم مجھے قوت اور شوکت کی حالت میں دیکھو اور اپنے آپ کو میرے مقہور سمجھو، تاکہ تمہارے کام آسان ہوں۔ اور خوف کی حالت میں تم میری طرف سے اپنی اُمید منقطع نہ کرو۔ کیونکہ میں قادر ہوں

کہ تمہیں اس خوف سے رہائی بخشوں اور امان دوں۔ جو ہستی سفید گائے سے سیاہ گائے بر آمد کرتی ہے۔ وہ یہ بھی کر سکتی ہے کہ سیاہ گائے سے سفید گائے بر آمد کر دے :

تولج الّیل فی النهار وتولج النهار فی الّیل وتخرج الحی من المیّت وتخرج المیّت من الحی (سورۂ آلِ عمران :ع ۲)	تو داخل کرتا ہے، رات کو دن میں اور دن کو رات میں اور تو نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے، اور مردہ کو زندہ سے۔

اب کہ تم اسیری کی اس حالت میں ہو، میرے حضور سے امید منقطع نہ کرو۔ تاکہ میں تمہاری دستگیری کروں۔

انه لاییٔس من روح الله الاالقوم الکفرون. (یوسف :ع ۱۰)	خدا کی رحمت سے تو کافروں کے سوا اور کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

اب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے اسیرو! اگر تم اپنے پہلے مذہب سے پھر جاؤ اور خوف کی حالت میں میری طرف دیکھو۔ اور ہر حالت میں اپنے آپ کو مقہور سمجھو، تو میں تمہیں اس خوف سے نجات دوں گا۔ اور تمہارا ہر وہ مال جو لٹ گیا ہے اور ضائع ہو چکا ہے۔ وہ سب کا سب تمہیں دوں گا۔ بلکہ اس سے دگنا اور اس سے بہتر دوں گا۔ اور اس کے ساتھ ہی تمہیں بخشا ہوا سمجھوں گا۔ اور آخرت کی دولت کے ساتھ ملا دوں گا۔

عباسؓ نے کہا، میں نے توبہ کی۔ اور میں جو کچھ تھا اس سے باز آیا۔ حضور سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ تو جو یہ دعویٰ کرتا ہے، اس کے جواز میں اللہ تعالیٰ ثبوت طلب کرتا ہے۔

ترجمہ شعر : عشق کا دعویٰ آسان ہے، لیکن اسے ثابت کرنے کے لیے دلیل و برہان چاہیے۔

عباسؓ نے جواب دیا۔ بسم اللہ۔ فرمایئے آپ کو کیا ثبوت مطلوب ہے؟

حضور ﷺ نے فرمایا، تیرے وہ اموال جو بچ رہے ہیں، لشکر اسلام کے لیے ان کا ایثار کر، تاکہ لشکر اسلام طاقت حاصل کرے۔ اگر تو سچے دل سے مسلمان ہوا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی چاہتا ہے تو یہ کر۔

عباسؓ نے کہا، یارسول اللہ (ﷺ)! میرے پاس باقی کیا رہ گیا ہے؟ سب کچھ ہی تو لٹ گیا۔ پرانی چٹائی تک بھی تو انہوں نے باقی نہیں چھوڑی۔

حضور سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا، دیکھا! تو ابھی درست نہیں ہوا۔ اور تو جو کچھ تھا اس سے سرِ مو نہیں پھرا۔ میں تجھے بتاؤں کہ تیرے پاس کتنا مال ہے؟ اور تو نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے؟ اور کس کے سپرد وہ مال تو نے کیا ہے؟ اور کس مکان میں تو نے اسے دفن کیا ہے؟

عباسؓ نے جواب دیا، حاشا کہ مال نہیں ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا، کیا تو نے اتنی معیّن مقدار میں مال ماں[1] کے سپرد نہیں کیا؟ اور کیا فلاں دیوار میں تو نے اسے دفن نہیں کیا؟ اور کیا تو نے تفصیل کے ساتھ وصیت نہیں کی کہ اگر میں واپس آجاؤں تو مال مجھے لوٹا دینا اور اگر میں سلامت واپس نہ آؤں، تو اس میں سے اتنا مال فلاں مصلحت پر صرف کرنا، اتنا فلاں آدمی کو دینا اور اتنا مال تم رکھ لینا؟

عباسؓ یہ سن کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ اور سچے دل سے ایمان لے آیا۔ اور بولا، اے خدا کے سچے رسول (ﷺ)! میں سمجھا تھا کہ تیرا اقبال دورِ فلک کی وجہ سے ہے، جیسے ہامان، شداد اور نمرود جیسے بادشاہوں کا تھا۔ اب جو کچھ آپ نے فرمایا ہے، اس سے مجھے

---

[1] نسخہ مرتبہ مولانا عبدالماجد میں جو عبارت ہے، اس کا ترجمہ یوں ہے، "...مال اُمِ فضل کے سپرد نہیں کیا؟"

صحیح علم ہوا اور حقیقت معلوم ہوئی کہ تیرا یہ اقبال ایک خدائی بھید ہے اور باقی ربانی راز ہے۔

حضور سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا، تو نے سچ کہا۔ اس مرتبہ میں نے سنا کہ شک کا زنار جو تیرے اندر تھا، وہ ٹوٹ گیا۔ اس شکستِ زنار کی آواز میرے کان میں آئی ہے۔ میری روح کے عین اندر ایک پوشیدہ کان ہے۔ جب کوئی شخص اپنے شک و شرک اور کفر کا زنار توڑتا ہے تو میں یہ آواز اپنے گوشِ نہاں سے سنتا ہوں اور اس کے ٹوٹنے کی آواز میری روح کے کان میں پہنچتی ہے۔ اب یہ حقیقت ہے کہ تو درست ہو گیا اور ایمان لے آیا۔

مولانا نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ میں نے میر پروانہ[1] سے یہ اس لیے کہا کہ پہلے تُو اسلام کے لیے پشت پناہ بنا کہ اپنے آپ کو اسلام پر فدا کروں۔ اپنی عقل، رائے اور تدبیر کو بقائے اسلام اور کثرتِ اہلِ اسلام پر نثار کروں۔ تاکہ اسلام سلامت رہے۔ اور چونکہ تو نے اپنی رائے پر اعتماد کیا اور حق کو نہ دیکھا اور حق میں سے کچھ بھی نہ سمجھا۔ پس خداتعالیٰ نے عین اس سبب اور کوشش کو نقص اسلام کی وجہ بنا دیا کہ تو تاتاریوں میں گھل مل گیا ہے۔ تو مدد دے رہا ہے تاکہ شامیوں اور مصریوں کو تو فنا کر دے۔ اور مملکت اسلام کو تہس نہس کر دے۔ پس وہ ذریعہ جو اسلام کی بقا کے لیے تھا، اسلام کو نقصان پہنچانے والا بن گیا۔ پس اپنی اس حالت میں خدائے عزوجل کی طرف رجوع کر کہ یہ خوف کا مقام ہے۔ اور صدقات وغیرہ دے تاکہ تجھے اس حالتِ بد سے کہ جو خوف کا مقام ہے، تجھے نجات دے، اور تو اس سے امید منقطع نہ کر۔ اگرچہ تجھے ایسی طاعت نے اس قسم کی معصیت میں

---

[1] امیر پروانہ معین الدین سلیمان بن مہذب الدین علی دیلمی سلجوقیانِ روم کے ممتاز ترین امرا اور وزرا و سلاجقہ میں سے تھے۔ انہیں ۱۲۷۵ء میں اباقاخان کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ مولانا رومی سے میر پروانہ کو بہت عقیدت تھی۔

ڈالا گیا۔ اس طاعت کو تو نے خود دیکھ لیا۔ اس کے لیے تو معصیت میں گر۔ اب اس معصیت میں بھی اُمید کو ہاتھ سے نہ دے اور الحاح وزاری کر۔ وہ قادر ہے کہ اس نے اس طاعت سے معصیت پیدا کر دی۔ اس معصیت سے وہ طاعت پیدا کر دے اور تجھے اس سے پشیمانی بخشے اور ایسے سامان پیدا کر دے، کہ تو ایک دفعہ پھر کثرتِ اہلِ اسلام کے لیے کوشاں ہو اور تو اسلام کی قوت بن جائے۔ مایوس نہ ہو کہ:

انه لاییاس من رحمة الله الّا القوم الکافرون (یوسف: ع ۱)	خدا کی رحمت سے تو کافروں کے سوا اور کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

میری غرض یہ تھی کہ وہ اسے سمجھے اور اس حالت میں صدقات دے۔ الحاح و زاری کرے کہ وہ بڑی بلندی سے پستی میں گر چکا ہے۔ اس حالت میں امیدوار ہو تو اللہ تعالیٰ ـــ خوب تدبیر کرنے والا ہے۔ وہ کئی اچھی صورتیں دکھاتا ہے، جن کے پیٹ میں بد صورتیں ہوتی ہیں، تاکہ آدمی مغرور نہ ہو جائے کہ میری رائے اور میرا کام ہی اچھی صورتیں پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ جو کچھ رونما ہوا ویسا ہی تھا۔ کیا خدا کے رسول حضور سرورِ کائنات ﷺ نے اتنی تیز نظر کے باوجود جو خود منور تھی، اور دوسروں کو منور کرنے والی تھی، یہ فریاد نہ کی کہ:

ارنی الاشیاء کما ھی[1]	اے خدا مجھے سب چیزیں اس حالت میں دکھا، جس حالت میں وہ در حقیقت ہیں۔

---

[1]
اے میسر کردہ بر ما در جہاں ۔۔۔ سخرہ و بیگار مارا وا رہاں
طعمہ بنمودہ بما وآں بودہ است ۔۔۔ آں چناں بنما بما آں را کہ ہست
اے خدائے رازدانِ خوش سخن ۔۔۔ عیب کار بد زما پنہاں مکن
راست بینی گر بدی آساں وزب ۔۔۔ مصطفیٰ کے خواستے آں راز رب
گفت بنما جزو جزو از فوق و پست ۔۔۔ آں چنانکہ پیش تو آں چیز ہست
اے خدا بنمائی تو ہر چیز را ۔۔۔ آں چنانکہ ہست در خدعہ سرا

(بقیہ اگلے صفحے پر)

تو ایک خوبصورت چیز دکھاتا ہے اور وہ در حقیقت بدصورت ہوتی ہے۔ اور تو بدصورت چیز دکھاتا ہے تو وہ دراصل خوبصورت ہوتی ہے، پس ہمیں ہر چیز اس طرح دکھا جیسے کہ وہ در حقیقت ہے، تاکہ ہم دھوکا نہ کھا جائیں اور مسلسل گمراہ نہ ہوتے رہیں۔

اب اگرچہ تیری رائے صائب اور روشن ہے۔ لیکن اس کی رائے سے یہ بہتر نہیں۔ اس نے ایسا ہی کہا ہے تو ہر صورت اور ہر رائے پر اعتماد نہ کر۔ الحاح وزاری کر اور خوف کھا۔ میرا مطلب یہی تھا۔ اور اس نے اپنی ارادت اور رائے سے اس آیت اور اس کی تفسیر کی تاویل کر دی کہ اس گھڑی ہم لشکر لے جا رہے ہیں۔ نہیں چاہیے کہ اپنی رائے اور لشکر پر تکیہ کریں۔ اور اگر ہمیں شکست ہو تو اس خوف اور بیچارگی کی حالت میں بھی امید منقطع نہیں کرنی چاہیے۔ اس نے بات کو اپنے مقصد کے مطابق لیا۔ میری غرض یہی تھی جو میں نے کہہ دی۔

حقیقت، وحدت اور کثرت

ایک آدمی نے کہا کہ مولانا بات نہیں کرتے۔ میں نے کہا آخر اس شخص کو میرا خیال میرے نزدیک لایا ہے۔ میرے اس خیال نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ تو کیسا ہے اور تیرا حال کیا ہے۔ اگر میری حقیقت بات کیے بغیر میرے پاس کھینچ لائی۔ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے آئی۔ تو اس میں تعجب کیا ہے۔ بات حقیقت کا سایہ ہے اور حقیقت کی شاخ ہے۔ جب سایہ نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ تو حقیقت اسے اس سے بہتر طریق پر اپنی

(بقیہ) زیں سبب درخواست حق از مصطفیٰ — زشتہا را زشت و حق را حق نما
اگر اشیاء ہمیں بودے کہ پیداست — کلامِ مصطفیٰ کے آمدے راست
کہ باحق سرور دیں گفت الٰہی — من نمائی اشیا را کماھی
(فرید الدینؒ عطار)

طرف کھینچ لاتا ہے، نہ کہ بات۔ بلکہ اگر لاکھ معجزہ[1]، بیان اور کرامت بھی دیکھے تو جب تک اس میں اس نبی یا ولی کا جزو مناسب نہ ہو فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ جزو ہی ہے جو اسے جوش اور بے قراری کی حالت میں رکھتا ہے۔ کاہ میں اگر کہربا کا جزو نہ ہو تو وہ کہربا کی طرف ہرگز کھینچا نہ جائے۔ وہ جنسیت ان کے درمیان نہاں ہے اور نظر نہیں آتی۔ آدمی کو ہر چیز کا خیال اسی چیز کی طرف لے جاتا ہے۔ باغ کا خیال اسے باغ میں لے جاتا ہے۔ اور دوکان کا خیال دوکان میں۔ لیکن ان خیالات میں فریب پوشیدہ ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تو ایک جگہ جاتا ہے اور پشیمان ہوتا ہے اور کہتا ہے میں نے اس جگہ کو اچھی سمجھا تھا، مگر یہ ویسی نہیں۔ یہ خیالات چادر کی مثال ہیں۔ چادر میں چھپے ہوئے آدمی کے ذہن میں خیالات آتے ہیں، اور حقائق بھی اس کے سامنے رونما ہوتے ہیں۔ لیکن چادر میں لپٹا ہوا آدمی اس کے خیالات تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے مقابلہ میں بغیر چادر والے آدمی کے خیالات قیامت ہوتے ہیں۔ جہاں آدمی چادر میں نہ چھپا ہو حالات سے بے خبری نہیں ہوتی۔ اس لیے وہاں شرمندگی نہیں ہوتی۔ ہر حقیقت جو تجھے اپنی طرف کھینچتی ہے، وہ کوئی اور شے نہیں۔ وہ وہی حقیقت ہے جس نے تجھے اپنی طرف کھینچا:

یوم تبلی السرائر (طارق : ع ۱) — جس دن راز جانچے جائیں گے۔

میں جو کہتا ہوں اس میں کلام نہیں کہ در حقیقت کھینچنے والا ایک ہی ہے۔ لیکن وہ کئی ہو کر نظر آتا ہے۔ تو نہیں دیکھا کہ آدمی کو سو رنگا رنگ چیزوں کی خواہش ہوتی ہے۔

---

[1] در دلِ ہر کہ کہ کز حق مزہ است — وحی و آوازِ پیمبر معجزہ است
چوں پیمبر از بروں بانگے زند — جانِ امت در دروں سجدہ کند
موجبِ ایمان نباشد معجزات — بوئے جنسیت کند جذبِ صفات
معجزات از بہرِ قہرِ دشمن است — بوئے جنسیت سوئے دل بردن است
قہر گردد دشمن اما دوست نے — دوست کے گردد بستہ گردنے
(مثنوی مولانا روم)

کہتا ہے مجھے شوربا چاہیے۔ مجھے سنبوسہ چاہیے۔ مجھے حلوا چاہیے۔ مجھے قلیہ چاہیے۔ مجھے پھل چاہیے۔ مجھے خرما چاہیے۔ یہ چیزیں کئی عدد بن جاتی ہیں۔ وہ کہتا ہے یہ سب لاؤ۔ لیکن اس کی اصل ایک ہی ہے، اور وہ ہے بھوک۔ کیا تُو نے نہیں دیکھا؟ جب وہ ایک ہی چیز سے سیر ہو جاتا ہے تو کہتا ہے، بس۔ اب مجھے ان میں کچھ نہیں چاہیے۔ پس معلوم ہوا کہ دراصل دس یا سو چیزیں نہیں تھیں، صرف ایک ہی تھی :

وما جعلنا عدتھم الا فتنة. (سورۂ مدثر: رکوع ۲) ہم نے ان کا تعدد فتنہ ہی کی غرض سے رکھا ہے۔

خلقت کا یہ شمار فتنہ ہے۔ کہتے ہیں یہ ایک ہے اور وہ سو ہیں۔ یعنی ولی کو ایک کہتے ہیں اور بہت سی خلقت کو ایک لاکھ۔ یہ ایک بڑا فتنہ ہے۔ یہ نظر اور یہ فکر جو انہیں بہت سارے سمجھتے ہیں اور اسے ایک، بہت بڑا فتنہ ہے۔ وما جعلنا عدتھم الا فتنہ۔ کون سو، کون پچاس اور کون ساٹھ؟ مجبور، بے ہوش اور بے جان قوم کی قوم طلسم، پارے اور سیماب کی طرح جنبش کرتی ہے۔ اب تُو انہیں ساٹھ یا سو ہزار کہتا ہے اور اسے ایک۔ بلکہ یہ متعدد قوم کچھ بھی نہیں۔ اور وہ ایک ہزار، لاکھ اور کروڑ ہا کروڑ ہے :

قليل اذا عدوا كثير اذا شدّوا. جب گنو تو وہ تھوڑا ہے، لیکن شدت میں بہت زیادہ۔

ایک بادشاہ نے ایک آدمی کو ازراہِ عنایت سو نان مرحمت فرمائے۔ لشکر اس پر سخت برہم ہوا کہ اس شخص کی یوں خاص حوصلہ افزائی کیوں کی گئی۔ بادشاہ نے اپنے آپ سے کہا، وہ دن آنے والا ہے، جب میں تمہیں دکھا دوں گا کہ تم جان لو گے میں نے ایسا کیوں کیا۔ چنانچہ جب لڑائی کا دن آیا، یہ سب بھاگ گئے۔ اور وہ شخص اکیلا لڑا۔ بادشاہ نے کہا، میری وہ عنایت اس مصلحت سے تھی۔

آدمی کو چاہیے کہ اپنی قوتِ ممیزہ کو خود غرضی سے مبّرا رکھے۔ اور دین میں دوست کو تلاش کرے۔ کیونکہ دین دوست شناسی ہے۔ لیکن جب عمر کو قوتِ ممیزہ کے دروازہ سے گزار دیا، تو قوتِ ممیزہ کمزور ہو گئی۔ اب اس یارِ دین کو نہیں پہچانا جا سکتا، تو اپنے اس وجود کی پرورش کرتا رہا، جس میں تمیز نہیں۔ تمیز ایک صفت ہے۔ تو نہیں دیکھتا کہ پاگل آدمی کے بھی ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں، لیکن اس میں تمیز[۱] نہیں ہوتی۔ تمیز وہ معنیٔ لطیف ہے کہ جو تجھ میں ہے اور تو بے تمیز جسم کی پرورش میں رات دن لگا ہے۔ تُو یہ بہانہ کرتا ہے کہ تمیز جسم ہی سے قائم ہے، آخر جسم بھی تو تمیز ہی سے قائم ہے۔ یہ کیا کہ تیری ساری توجہ جسم کی دیکھ بھال پر مرتکز رہی، اور تمیز کو تُو نے بالکل بھلا دیا۔ حالانکہ وہ اس سے قائم ہے۔ یہ اس سے قائم نہیں۔ وہ نور آنکھ اور کان وغیرہ کے ان دریچوں ہی سے باہر آتا ہے۔ اگر یہ دریچے نہ ہوں۔ تو وہ دوسرے دریچوں سے نکل آتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہے کہ تُو سورج کے سامنے چراغ لے آیا ہے کہ میں اس کی مدد سے سورج کو دیکھوں۔ حاشا کہ اگر تو چراغ نہ لاتا، تو بھی سورج اپنے آپ کو دِکھا ہی دیتا۔ چراغ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ خدا کی طرف سے اُمید منقطع نہیں کرنی چاہیے۔ اُمید سرِ راہ محفوظ و مامون ہے۔ اگر تو راستہ پر چل نہیں رہا تو سرِ راہ دیکھ ہی لے۔ یہ نہ کہہ کہ میں ٹیڑھا چلتا رہا ہوں۔ تُو راستی کو سامنے رکھ۔ ٹیڑھا پن نہیں رہے گا۔ راستی عصائے موسوی کی طرح ہے۔ وہ کجیاں ایک جادو کی مانند ہیں۔ جب راستی سامنے آتی ہے، تو وہ سب کچھ نگل جاتی ہے۔ اگر تو نے بدی کی ہے، تو اپنے آپ ہی سے کی ہے۔ تیرا ظلم اس

[۱] اس سے آگے مولانا عبدالماجد والے نسخہ میں عبارت کا ترجمہ یوں ہے۔ جو غلاظت اس کے ہاتھ میں آئے اٹھا کر رکھ لیتا ہے۔ اگر یہ تمیز اس ظاہری جسم میں ہوتی تو وہ غلاظت نہ اٹھاتا۔ پس ہم نے سمجھ لیا کہ تمیز وہ معنیٔ لطیف ہے۔

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں (غالب)

کا کیا بگاڑ سکتا ہے[1] ایک پرندہ تھا کہ پہاڑ پر بیٹھا اور اُڑ گیا۔ دیکھو اس سے نہ تو اس پہاڑ میں کچھ اضافہ ہوا اور نہ کمی ہی ہوئی۔

جب تو راہِ راست پر آگیا، تو باقی کچھ بھی نہ رہا۔ امید کو ہرگز ہاتھ سے نہ دے۔

بادشاہوں کی ہم نشینی سے خطرہ

بادشاہوں کی ہم نشینی اس وجہ سے خطرے کا موجب نہیں کہ اس میں سر جاتا رہتا ہے، کیونکہ سر تو بہر حال مٹنے والی چیز ہے۔ آج نہ گیا کل جائے گا۔

البتہ خطرہ اس وجہ سے ہے کہ بادشاہ اپنے اختیارات و طاقت کے احساس سے قوی نفس ہوتے ہیں، بالکل اژدہے کی طرح۔ جو شخص ان کی صحبت اختیار کرے، ان سے دوستی کا دعویٰ کرے اور ان کا مال قبول کرے، اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر بات ان کی مرضی کے مطابق کہے۔ وہ ان کی بری رائے کی طرف دل کو مائل کر کے اسے قبول کرتا ہے۔ وہ اس کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے خطرہ ہے، کیونکہ اس سے دین کو نقصان پہنچتا ہے۔ اگر تو ان کے ساتھ مشغول رہے گا تو دوسری جہت جو اصل ہے، تجھ سے بیگانہ رہے گی۔ جب تک تو اس راستے پر چلتا رہے گا، تیرا معشوق جو کہ اس راستہ پر ہے تجھ سے روگردان رہے گا۔ اور جب تک تو دُنیا سے صلح کیے رہے گا، تیرا معشوق تجھ سے بے حد برہم رہے گا۔

ومن اعان ظالماً یسلطه الله علیه. جو شخص کسی ظالم کی مدد کرتا ہے، خدا اسی ظالم کو اس پر مسلط کر دیتا ہے۔

---

[1] برخوانِ ازل گرچہ زلقان غوغاست خوردند و خوردند کم نعد خوں برجاست
مرغے کہ بر آں کوہ نشست و برخاست بنگر در اں کوہ چہ افزود وچہ کاست
(مولانا رومیؒ)

انتہائی افسوس ہے کہ آدمی پانی کے بھرے ہوئے دریا تک پہنچ جائے مگر اس میں سے صرف ایک پیالہ پانی بھر کر ہی قناعت کرے۔ آخر دریا میں موتی، پتھر اور لاکھوں قیمتی چیزیں ہوتی ہیں۔ دریا میں سے صرف پانی لے آنا کیا وقعت رکھتا ہے؟ عقل مند آدمیوں کو اس پر کیا فخر ہو گا؟ اور کیا فخر ہوا ہو گا؟ حقیقت یہ ہے کہ دنیا بالکل جھاگ کی مانند ہے۔ اور پانی کا یہ دریا اولیاء کے علوم ہیں۔ موتی خود کہاں ہے؟ یہ دُنیا بے حقیقت تنکوں سے بھری ہوئی جھاگ ہے۔ لیکن ان لہروں کی گردش، جوشِ دریا کی مناسبت اور لہروں کی حرکت اس جھاگ میں ایک خوبی پیدا کر دیتی ہے۔

زیّن للناس حب الشهوات من النساء والبنين والقناطير المقنطرة من الذهب والفضة والخيل المسومة والانعام والحرث ذٰلك متاع الحيٰوة الدنيا.
(سورہ آلِ عمران: ع ۲)

انسان کی مرغوب چیزوں مثلاً بیویوں، بیٹوں، سونے اور چاندی کے ڈھیروں، پلے ہوئے گھوڑوں، مویشیوں اور کھیتوں کی محبت انہیں خوشنما بنا کر دکھائی گئی ہے۔ یہ سب کچھ اس دُنیا کا عارضی سامان ہے۔

پس جب "زیّن" (خوشنما بنا کر دکھائی گئی ہے) فرمادیا تو وہ دراصل اچھی نہیں۔ بلکہ اس کی خوبی مستعار لی ہوئی ہے۔ اور دوسری جگہ ہے۔ یہ جھوٹا سونا ہے، یعنی یہ دنیا صابن کی جھاگ ہے، کھوٹی ہے۔ اس کی کوئی قدر ہے نہ قیمت۔ ہم نے اسے سنہری کر دیا ہے، تاکہ انسانوں کے لیے زینت ہو۔

انسان خدا کا اصطرلاب ہے

آدمی خدا کا اصطرلاب ہے۔ لیکن نجومی چاہیے جو اصطرلاب کو جانتا ہو۔ اگر کسی

کنجڑے یا ترکاری بیچنے والے کے پاس اصطرلاب ہو تو وہ اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ آسمانوں کا حال، ان کی گردش، برج، ان کی تاثیریں اور انقلابات کی آمد اس اصطرلاب سے کیسے جانچی جاتی ہے۔ پس منجّم کے حق میں اصطرلاب فائدہ مند ہے کہ :

من عرف نفسهٗ فقد عرفه ربّهٗ. — جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا، اس نے خدا کو پہچان لیا۔

جس طرح تانبے کا اصطرلاب آسمانوں کا آئینہ ہے۔ آدمی کا وجود جس کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

ولقد كرمنا بنی آدم. (بنی اسرائیل) — ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی۔

خدا کا اصطرلاب ہے۔ چونکہ خود خدا تعالیٰ نے اسے علم دیا، دانائی دی اور آشنائی بخشی۔ وہ اپنے وجود کے اصطرلاب سے خدا کی تجلی اور بے مثال حسنِ مطلق کو ہر لحہ اور ہر لحظہ دیکھتا ہے اور وہ حسن اس آئینہ سے ہرگز خالی نہیں ہوتا۔ خداوند تعالیٰ جل جلالہٗ کے بعض ایسے بندے بھی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو حکمت، معرفت اور کرامت سے آراستہ کیا ہوا ہے۔ اگرچہ خلقت کو وہ نظر عطا نہیں ہوئی کہ انہیں دیکھے۔ لیکن انتہائی غیرت کی بناء پر وہ اپنے آپ کو چھپاتے ہیں۔ چنانچہ متنبّی کہتا ہے ؎

لبسن الوشی لا متجملات — ولكن كما يصن به الجمالا

ان مخدرات نے آرائشِ جمال کے لیے زیور نہیں پہنا بلکہ وہ حفاظتِ جمال کے لیے استعمال کیا ہے۔

عبادت کی اصل روح استغراق ہے

کہا میرا دل اور میری جان رات دن خدمت میں مصروف ہے۔ میں مغلوں کے معاملات اور مشاغل میں مصروف ہونے کی وجہ سے آپ کی خدمت میں نہیں پہنچ سکا۔ فرمایا یہ کام اور مشاغل بھی دراصل خدا ہی کے کام ہیں۔ کیونکہ یہ اسلام کے لیے امن و امان کا ذریعہ ہیں۔ آپ نے اپنا مال اور جسم فدا کیا ہے، تاکہ مسلمانوں کے دل کو آرام ملے۔ پس جب تک چند مسلمان بھی امن اور چین کے ساتھ عبادت میں مصروف ہیں، یہ کارِ خیر ہی ہے۔ خدا تعالیٰ نے آپ کا میلانِ طبع اس کارِ خیر کی طرف کیا ہے۔ اور اس میلان کی افراط اس کی عنایت کی دلیل ہے۔ پس اس میلانِ طبع میں فتور آجانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے، کہ اس کی وہ عنایت نہیں رہی کیونکہ خدا تعالیٰ نہیں چاہتا کہ اتنی بڑی نیکی آپ کے ذریعہ سے ہو اور آپ ثواب اور بلند درجات کے مستحق ہوں۔ اس کی مثال حمام کی سی ہے کہ وہ گرم ہوتا ہے۔ لیکن اس کی گرمی وہ گھاس پھوس، سوکھی لکڑی اور گوبر وغیرہ ہوتا ہے جو حمام کو گرم کرنے کے لیے جلایا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ سامان پیدا کر دیتا ہے۔ کہ اگرچہ وہ سامان یعنی گھاس پھوس اور گوبر دیکھنے میں برے اور مکروہ ہوتے ہیں۔ جب ان سے حمام گرم ہوتا ہے تو اس سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچتا ہے۔

اس اثناء میں کچھ دوست آگئے۔ آپ نے معذرت فرمائی کہ اگر میں تمہیں ٹھہراؤں نہیں، تم سے بات نہ کروں اور تمہاری خیریت نہ پوچھوں تو یہ احترام ہے۔ کیونکہ ہر چیز کا احترام وقت کے مطابق ہوتا ہے۔ نماز کی حالت میں باپ یا بھائی کی خیریت پوچھنی اور ان کی تعظیم کرنی مناسب نہیں۔ نماز کی حالت میں دوستوں اور عزیزوں سے بے التفاتی کرنا ہی التفات اور عین نوازش ہے۔ کیونکہ نماز پڑھنے والا اگر ان کی وجہ سے

عبادت اور استغراق نہیں چھوڑے گا اور مشوش نہیں ہو گا تو ان پر خدا کا عتاب اور عذاب نازل نہیں ہو گا۔ پس نماز پڑھنے والے کا دوستوں اور عزیزوں کی طرف توجہ نہ کرنا ہی ان کے لیے بڑی مہربانی ہے کیونکہ اس طرح وہ ایک ایسی حرکت سے باز رہا جس میں ان کے لیے عذاب تھا۔

سوال کیا کہ کیا خدا تک پہنچنے کے لیے نماز سے قریب تر بھی کوئی راستہ ہے؟ فرمایا صرف نماز ہی۔ لیکن نماز صرف اس ظاہری صورت میں نہیں ہے۔ اس کی یہ ظاہری صورت نماز کا قالب ہے۔ کیونکہ اس میں نماز کا اوّل اور آخر ہے۔ اور جس چیز کا آغاز اور انجام ہو وہ قالب ہے۔ کیونکہ نماز کا آغاز تکبیر ہے۔ اور اس کا آخر سلام۔ اس طرح شہادت یہ نہیں ہے کہ صرف حرفِ زبان سے کہا جائے۔ کیونکہ اس کا بھی اوّل اور آخر ہے۔ اور جو چیز کہ حرف اور صورت میں سما جائے۔ اس کا اوّل اور آخر ضرور ہوتا ہے۔ وہ صورت اور قالب ہے۔ جان بے مثل اور بے انتہا ہے۔ اس کا اوّل اور آخر نہیں۔ یہ نماز انبیاء کی پیدا کردہ ہے۔ اب وہ نبی جس نے نماز پیدا کی ہے، یوں کہتا ہے :

لی مع الله وقت لا یسعٰی فیه نبی مرسل ولا ملك مقرب.	میرے اور خدا کے درمیان ایک ایسا وقت آتا ہے جس میں کسی مرسل اور فرشتۂ مقرب کی گنجائش نہیں ہوتی۔

پس ہمیں معلوم ہو گیا کہ نماز کی جان صرف ظاہریت نہیں، بلکہ استغراق ہے، بے ہوشی ہے کہ یہ تمام صورتیں باہر ہی رہتی ہیں۔ وہاں یہ نہیں سماتیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی، حالانکہ معنیٔ محض ہیں، وہاں نہیں سماتے۔

سلطان العلماء قطب العالم مولانا بہاء الحق والدین قدس اللہ سرہٗ العزیز کے متعلق حکایت ہے۔ ایک دن ان کے دوستوں نے دیکھا کہ وہ عالمِ استغراق میں ہیں۔ نماز کا

وقت ہو گیا۔ بعض مریدوں نے آواز دی کہ مولانا! نماز کا وقت ہو گیا۔ مولانا نے ان کی آواز کی پرواہ نہ کی۔ یہ مرید اُٹھے اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ دو مریدوں نے مولانا کی پیروی کی اور نماز کے لیے کھڑے نہ ہوئے۔ جو مرید نماز کے لیے کھڑے ہوئے تھے، ان میں سے ایک کا نام خواجگی تھا۔ اس کی آنکھوں پر حقیقت کا راز کھل گیا۔ اس نے عالمِ کشف میں، دیکھا کہ جو مرید امام کے پیچھے کھڑے نماز ادا کر رہے تھے، وہ در حقیقت قبلہ کی طرف پیٹھ کیے ہوئے ہیں۔ اور وہ دو مرید جنہوں نے مولانا کی پیروی کی تھی، وہ قبلہ رو کھڑے ہیں۔ کیونکہ مولانا ما و من سے گزر چکے تھے اور ان کی ہستی اس وقت فنا ہو گئی تھی۔ مولانا باقی نہ تھے۔ خدا کے نور نے انہیں ہلاک کر دیا تھا۔

موتوا قبل ان تموتوا۔ موت کے آنے سے پہلے ہی مر جاؤ۔

کے مصداق مولانا خدا کے نور بن کر رہ گئے تھے۔ اور جو شخص خدا کے نور کی طرف پیٹھ پھیر لے اور منہ دیوار کی طرف کرے، وہ دراصل قبلہ ہی کی طرف منہ پھیرے ہوئے ہے کیونکہ وہ نور قبلہ کی جان ہے۔ آخر وہ لوگ جو کعبہ کی طرف منہ کرتے ہیں، انہوں نے اس کعبہ کی بنیاد رکھی ہے کہ وہ قبلہ گاہِ عالم بن گیا ہے۔ پس اگر اس کی ذات قبلہ بن جائے، تو یہ بہتر ہے جیسے کہ وہ اس کا قبلہ بنا ہے۔[1]

حضور سرورِ کائنات ﷺ ایک دوست سے خفا ہوئے کہ جب میں نے تجھے بلایا تو آیا کیوں نہیں؟ اس نے جواب دیا، میں نماز پڑھ رہا ہوں۔ بولے آخر کیا میں نے تجھے بلایا نہ تھا؟ اس نے کہا میں مجبور ہوں۔ فرمایا یہ اچھا ہے کہ تو ہر وقت ہی مجبور رہے۔ قدرت رکھتے ہوئے بھی ہر حال میں تو اپنے آپ کو مجبور ہی سمجھے۔ جیسا کہ تو عجز کی حالت میں مجبور ہوتا ہے کیونکہ تیری طاقت سے بالاتر ایک طاقت ہے۔ تو ہر حالت میں اس قاہر اور

---

[1] بقول غالب:
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں (مترجم)

بالاتر طاقت کے تابع ہے۔ تو دو شمہ نیستی ہے۔ کبھی تو مجبورِ محض ہے اور کبھی صاحبِ اختیار۔ اس کی قدرت پر نگاہ رکھ۔ اور ہمیشہ اپنے آپ کو مجبور سمجھ۔ اور بے دست وپا، عاجز مسکین اور کمزور خیال کر۔ انسان ایک طرف، شیر چیتے، اژدر سب اس کے خوف سے لرزتے ہیں۔ تمام آسمان اور زمین اس کے سامنے مجبور اور اس کے مسخر ہیں۔ وہ بہت بڑا بادشاہ ہے۔ اس کا نور چاند اور سورج کے نور کی طرح نہیں۔ چاند سورج کے نور کے سامنے ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔ لیکن جب اس کا نور پردہ سے نکلتا ہے تو نہ آسمان باقی رہتا ہے نہ زمین، نہ آفتاب باقی رہتا ہے اور نہ چاند۔ اس بادشاہ کے سوا کوئی باقی نہیں رہتا۔

کل شیئ ھالك الاّ وجھہٗ اس کی ذات کے سوا ہر شے فنا ہونے والی ہے۔

ایک بادشاہ نے ایک درویش سے کہا، جب تجھ پر خدا کی تجلی نازل ہو اور تو خدا کے قرب میں ہو تو مجھے یاد کرنا۔ درویش نے جواب دیا۔ جب میں اس کے حضور میں پہنچتا ہوں اور اس آفتابِ جمال کی تاب مجھ پر تجلی ڈالتی ہے تو میں خود بھی اپنے آپ کو یاد نہیں رہتا۔ تمہیں کیسے یاد کروں؟ لیکن خداوند تعالیٰ جب خود کسی انسان کو پسند کر کے لسے اپنے آپ میں مستغرق کرتا ہے تو اگر کوئی اس انسان کا دامن پکڑ لے اور اپنی حاجت روائی کے لیے اس سے درخواست کرے، اور وہ حضوری کے وقت اس حاجت مند کے لیے خدا سے عرض کرے تو خدا تعالیٰ وہ حاجت پوری کر دیتا ہے۔

حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک بادشاہ تھا۔ ایک بندۂ خاص اس کا بہت مقرب تھا۔ وہ غلام جب بادشاہ کے محل سرائے کی طرف جانے لگتا تو حاجت مند لوگ اپنی حاجتیں لکھ کر رقعے اسے دیتے کہ وہ بادشاہ کے حضور میں پیش کر دے۔ وہ ان رقعوں کو

چمڑے کی تھیلی میں ڈال لیتا۔ لیکن جب وہ بادشاہ کے حضور میں پہنچتا، توبادشاہ کے جمال کی تاب نہ لاسکتا۔ اور بے ہوش ہو جاتا۔ بادشاہ معشوقانہ انداز سے اس کے سینہ، جیب اور چمڑے کی تھیلی کی تلاشی لیتا کہ یہ بندہ جو میرے حسن و جمال میں مستغرق ہے، آخر اس کے پاس کیا ہے؟ رقعے نکال لیتا اور ہر رقعہ کی پشت پر حاجت روائی کا حکم لکھ دیتا۔ اور تمام رقعے پھر چمڑے کی تھیلی میں ڈال دیتا۔

چنانچہ جس کسی نے اپنے رقعہ میں جو کچھ لکھا ہوتا، وہ اسے مل جاتا۔ بلکہ جو کچھ لکھا ہوتا، اس سے ڈگنا مل جاتا اور کوئی محروم نہ رہتا۔ بادشاہ کے دوسرے بندے جو ہوش و حواس میں ہوتے، انہیں سمجھ میں نہ آتی کہ حاجت مندوں کی حاجتیں وہ کس طرح بادشاہ کے سامنے پیش کریں۔ جب وہ ایسی درخواستیں بادشاہ کے سامنے پیش بھی کرتے تو سو میں سے بمشکل ایک حاجت مند کی حاجت روائی ہوتی۔

خودی کی اہمیت

ایک شخص نے کہا، میں یہاں ایک چیز بھول گیا ہوں۔ فرمایا کہ دُنیا میں صرف ایک چیز ایسی ہے جسے کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ اگر تجھے باقی سب چیزیں بھول جائیں اور یہ ایک چیز یاد رہے تو کوئی ڈر نہیں۔ اور اگر تو باقی سب چیزوں کو خاطر میں لائے اور یاد رکھے اور اس ایک چیز کو فراموش کر دے۔ تو تو نے کچھ بھی نہ کیا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک بادشاہ نے تجھے ایک خاص کام کے لیے کسی گاؤں بھیجا، تو گیا۔ اور تجھے راستہ میں سو کام بھول گئے۔ مگر وہ کام جس کے لیے بادشاہ نے تجھے بھیجا تھا، وہ تجھے نہ بھولا۔ تو یوں سمجھ کہ تو نے کوئی بھی کام فراموش نہیں کیا۔ پس انسان اس دنیا میں ایک خاص کام کے لیے آیا

ہے۔ اور وہی ایک مقصد ہے، اگر وہ اسے نہ بھولا تو گویا وہ کچھ بھی نہیں بھولا

انا عرضنا الامانة علی السموٰات والارض والجبال فابین ان یحملنها واشفقن منها وحملها الانسان انه کان ظلومًا جهولا. (سورۂ احزاب : ع ۹)

ہم نے یہ خاص امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کو پیش کی، توانہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے خوف کھایا اور انسان نے اسے اٹھا لیا۔ بے شک وہ (اپنے حق میں) ظالم اور جاہل تھا۔

وہ امانت ہم نے آسمانوں کو پیش کی، وہ اسے قبول نہ کر سکے۔ دیکھو اس سے کئی کام ایسے ہوتے ہیں جن سے عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ پتھر کو لعل اور یاقوت بنا دیتا ہے۔ پہاڑوں کو سونے اور چاندی کی کانیں بناتا ہے۔ اور زمین کی نباتات کو جوش میں لاتا اور زندہ کرتا ہے۔ اور اسے بہشت عدن بنا دیتا ہے۔ زمین بھی دانوں کو قبول کرتی ہے۔ اور پھل دیتی ہے۔ عیبوں کو چھپاتی ہے اور صدہا عجائبات ایسے پیدا کرتی ہے کہ ان کی شرح نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح پہاڑ بھی گوناگوں معدنیات پیدا کرتے ہیں۔ یہ سبھی کچھ کرتے ہیں۔ لیکن ان سے ایک کام نہیں ہوا۔ اور وہ کام انسان نے کر لیا۔ چنانچہ خدا نے کہا:

ولقد کرمنا بنی آدم. — ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی۔

اس لیے یہ نہیں کہا:

ولقد کرمنا السماء والارض. — ہم نے بزرگی دی، آسمانوں اور زمین کو۔

پس انسان نے وہ کام کر دکھایا جو نہ آسمانوں سے ہو سکا، نہ زمینوں سے اور نہ پہاڑوں سے۔ جب وہ کام کر لیا، تو "ظلم" اور "جہالت" کی خود ہی نفی ہو گئی۔ اگر تو یہ کہے کہ اگر میں وہ ایک کام نہیں کرتا، تو نہ سہی۔ بے شمار دوسرے کام تو کرتا ہوں۔ یاد رکھ کہ انسان کو ان دوسرے کاموں کے لیے نہیں پیدا کیا گیا۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ تو ہندوستانی

فولاد کی انمول تلوار جو بادشاہوں کے خزانوں ہی میں ملتی ہے، لائے اور اسے گوشت کاٹنے کا چھرا بنالے، کہ میں اس تلوار کو بیکار نہیں رکھتا۔ اس سے یوں کام لینے میں مصلحت ہے۔ یا تو سونے کی ایک دیگ لے آئے اور اس میں شلغم پکانے لگے۔ حالانکہ اس کے ایک ذرہ سے سو دیگیں ہاتھ آتی ہوں۔ یا ایک جوہر دار تلوار کو ٹوٹا ہوا برتن لٹکانے کے لیے کھونٹی بنالے۔ اور کہے میں مصلحت اسی میں دیکھتا ہوں کہ برتن کو اس پر لٹکاؤں، تلوار میرے پاس بیکار نہیں ہے۔ کیا یہ افسوس اور ہنسی کا مقام نہیں کہ جبکہ برتن لکڑی کی کھونٹی سے یا ایک پیسے والی لوہے کی میخ سے لٹکایا جاسکتا ہے۔ تو ناحق سو دینار والی تلوار سے یہ کام لیا جائے۔ کیا یہ عقل کی بات ہے؟

خدا تعالیٰ نے تیری بڑی قیمت مقرر کی ہے۔ وہ فرماتا ہے:

ان الله اشتریٰ من المؤمنین انفسهم واموالهم بان لهم الجنّة. (سورۂ توبہ: ع ۱۴)

خدا تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جان اور مال کو خرید لیا ہے کہ ان کے بدلے میں انہیں جنت دے گا۔

ترجمہ شعر: قیمت میں تو دو جہانوں سے بھی زیادہ ہے، کیا کروں تو خود اپنی قدر و قیمت نہیں جانتا۔

ترجمہ مصرع: اپنے آپ کو سستا نہ بیچ، کیونکہ تیری قیمت بہت زیادہ ہے۔

خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے تمہیں، تمہارے اوقات، تمہاری جانیں، تمہارے مال اور تمہارے روزگار تم سے خرید لیے ہیں۔ کہ اگر یہ سب چیزیں مجھ پر صرف کرو گے اور مجھے دو گے تو ان کے بدلہ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے بہشت دوں گا۔ میرے نزدیک تیری قیمت یہ ہے۔ اگر تو اپنے آپ کو دوزخ کے بدلے فروخت کر دے، تو اس حالت میں تو اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ اگر تو ایسا کرے تو یہ اسی طرح ہو گا جس نے سو

دینار سے خریدی ہوئی تلوار دیوار میں نصب کر کے اس پر کوئی برتن لٹکا دیا۔

ہم اصل بات کی طرف آتے ہیں۔ تو بہانہ پیش کرتا ہے کہ میں اپنے آپ کو دُنیا کے کاموں میں لگائے ہوئے ہوں۔ میں فقہ، حکمت، منطق، نجوم، طب وغیرہ جیسے علوم حاصل کر رہا ہوں۔ آخر یہ سب کچھ تیرے ہی لیے ہے۔ اگر فقہ ہے تو وہ اس لیے کہ کوئی تیرے ہاتھ سے روٹی نہ چھین لے، تیرے کپڑے نہ اتار لے اور تجھے مار نہ ڈالے۔ اور تو سلامت رہے۔ علم نجوم کی پوچھتا ہے تو افلاک کا حال۔ زمین پر ان کا اثر۔ امن اور خوف کی زیادتی یا کمی۔ ان سب باتوں کا تعلق تیرے حالات سے ہے۔ اور اگر ستارہ کو لو تو سعد اور نحس کا تعلق تیرے طالع سے ہے، یہ بھی تیرے ہی لیے ہے۔ تو غور کرے تو اصل چیز تو خود ہے۔ اور یہ سب کچھ تیری شاخیں ہیں۔ جب تیری شاخوں کی تفاصیل، عجائبات، احوال اور حیران کر دینے والے علوم کی کوئی حد نہیں تو سوچ کہ تو جو اصل ہے تیرا کیا حال ہے؟ جب تیری شاخوں کا عروج، ہبوط، سعد اور نحس ہے تو تو کہ ان شاخوں کا اصل ہے، عالم ارواح میں تیرا عروج، ہبوط، سعد، نحس، نفع اور نقصان کیا ہو گا؟ کہ فلاں رُوح کی یہ خصوصیت ہے اور وہ یہ کچھ کر سکتی ہے۔ اور فلاں کام اس کے لیے مناسب ہے۔

اس نیند اور خورش کے علاوہ تیری اصل خوراک کچھ اور ہے:

ابیت عند ربّی یطعمنی ویسقینی. — میں اپنے پروردگار کے حضور میں رہتا ہوں، وہی مجھ کو کھلاتا اور پلاتا ہے۔

اس دُنیا میں تو اس خوراک کو بھول گیا ہے اور یہ خوراک کھا رہا ہے۔ رات دن تو تن پروری میں مصروف ہے۔ آخر یہ جسم تیرا گھوڑا ہے۔ اور یہ دُنیا اس کا اصطبل ہے۔ گھوڑے کی خوراک سوار کی خوراک نہیں ہوتی۔ اسے تو اپنے سے بہتر خواب و خورش کی نعمتیں مہیا کر رہا ہے۔ لیکن اس وجہ سے کہ حیوانیت اور بہیمیت تجھ پر غالب ہے۔ تو

گھوڑے کا سوار ہوتے ہوئے سب گھوڑوں سے بھی پیچھے رہ گیا ہے۔ اور عالمِ بقا کے بادشاہوں اور امیروں کی صف میں تیری جگہ نہیں ہے۔ تیرا دل وہیں ہے، جسم تجھ پر غالب ہے۔ اس لیے تو جسم ہی کا حکم مانتا ہے۔ اور اسی کا تو قیدی بن گیا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے مجنوں نے لیلیٰ کے شہر جانے کا ارادہ کیا، جب تک مجنوں کو ہوش رہا، وہ اونٹ کو اس طرف دوڑاتا رہا۔ جب وہ لیلیٰ کے خیال میں مستغرق ہو گیا۔ تو اپنے آپ کو اور اونٹ کو بھول گیا۔ گاؤں میں اس اونٹ کا بچہ تھا۔ اونٹ کو موقع ملا تو اس نے گاؤں کا رُخ کر لیا اور وہاں لوٹ آیا۔ جب مجنوں کو ہوش آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی مسافت صرف دو دن کی تھی۔ مگر سفر میں اسے تین مہینے لگ چکے ہیں۔ مجنوں چلایا کہ یہ اونٹ میرے لیے مصیبت ہے۔ اونٹ پر سے کود کر اتر آیا اور پیدل روانہ ہوا:

هوی ناقتی خلفی وقدامی الهوی وانی وایاها لمختلفان.

میری اونٹنی تو میرے پیچھے پیچھے چل رہی ہے اور میرے آگے آگے محبت کا قافلہ رواں ہے، اس لیے میں اور میری اونٹنی دو مختلف راستوں پر گامزن ہیں۔

فرمایا سید برہان الدین محقق قدس سرہٗ نے ارشاد کیا کہ کسی نے ان سے کہا، فلاں آدمی سے میں نے آپ کی تعریف سنی ہے۔ بولے دیکھوں تو وہ شخص کون ہے؟ کیا اس کا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مجھے پہچان لے؟ اور میری تعریف کرے؟ اگر اس نے میری باتوں سے مجھے پہچانا ہے تو وہ مجھے نہیں پہچان سکا۔ کیونکہ نہ یہ باتیں رہیں گی، نہ حرف نہ آواز اور نہ لب و دہن رہیں گے۔ یہ سب چیزیں قائم الذات نہیں بلکہ "عرض" ہیں۔ ان کی اصل کچھ نہیں۔ اور اگر اس نے مجھے میرے فعل سے پہچانا ہے تو بھی ایسا ہی ہے۔ اور اگر اس نے میری ذات پہچانی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ میری تعریف کر سکتا ہے اور وہ

تعریف میری ہی ہے۔

حکایت : کہتے ہیں، ایک بادشاہ نے اپنا بیٹا ایک اہلِ ہنر جماعت کے سپرد کر رکھا تھا کہ وہ اہلِ ہنر اسے علمِ نجوم اور رمل وغیرہ سکھائیں۔ انہوں نے اسے لکھا پڑھا کر مسلم الثبوت استاد بنا دیا۔ بیوقوفی اور احمق پن اس میں بکمال موجود تھا۔ ایک دن بادشاہ نے انگوٹھی اپنی مٹھی میں دبائی اور بیٹے کا امتحان لیا۔ کہا بیٹا مجھے بتاؤ تو میری مٹھی میں کیا ہے؟ اس نے جواب دیا آپ کی مٹھی میں کوئی ایسی چیز ہے جو گول ہے، زرد ہے اور اندر سے خالی ہے۔ بادشاہ نے کہا، جب تم نے ساری نشانیاں ٹھیک ٹھیک بتا دی ہیں، تو اب حکم لگاؤ کہ وہ کیا چیز ہے؟ وہ بولا اسے دف ہونا چاہیے۔ بادشاہ نے کہا، بیٹا! تو نے کئی بڑی مشکل نشانیاں بتا دیں، جن سے عقل ورطۂ حیرت میں پڑ گئی۔ لیکن یہ چھوٹی سے بات تیرے علم اور عقل میں کیوں نہ آئی کہ دف جتنی بڑی چیز مٹھی میں نہیں آسکتی!

اسی طرح ہمارے زمانے کے علماء کئی علوم میں موشگافیاں کرتے ہیں اور جن چیزوں کا تعلق ان سے نہیں، انہیں خوب سمجھتے ہیں۔ اور ان پر بہت حاوی ہیں اور جو چیز سب سے بڑی اور سب سے قریب تر ہے، وہ ان کی اپنی خودی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی خودی کو نہیں جانتا۔ چیزوں کی حرمت و حلت کے متعلق یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ یہ چیز جائز ہے اور وہ ناجائز۔ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام۔ لیکن ان میں سے اپنے آپ کو کوئی جانتا ہے کہ وہ حلال ہے یا حرام؟ جائز ہے یا ناجائز؟ پاک ہے یا ناپاک؟ پس اس کا یہ خلاء، زردی، نقش اور گولائی سب عارضی ہیں۔ تو اسے آگ میں ڈال دے۔ تو ان میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہتا، ذات ان سب سے معرا ہے۔

وہ جس چیز کی نشانی بتاتے ہیں۔ وہ علم، فعل اور قول سے ایسی ہی ہوتی ہے اور جوہر یعنی اصل ذات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان سب کے بعد باقی رہنے والی چیز

ذات ہی ہے۔ ان کی بتائی ہوئی نشانیاں ایسی ہی ہیں۔ یہ وہ سب نشانیاں بتا دیتے ہیں۔ اور ان نشانیوں کی تشریح خوب کرتے ہیں۔ اور آخر میں حکم لگاتے ہیں کہ مٹھی کے اندر دف ہے۔ جو چیز کہ اصل ہے، اس کی انہیں خبر نہیں ہوتی۔ میں پرندہ ہوں، بلبل ہوں یا طوطی ہوں۔ اگر وہ مجھے کہیں تم کسی اور قسم کی آواز نکالو تو مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میری یہی آواز ہے۔ میں کسی دوسری طرز پر نہیں بول سکتا۔ اس کے برعکس اگر کسی نے پرندہ کی آواز سیکھی ہے تو وہ خود پرندہ نہیں ہے۔ وہ صیاد ہے اور پرندوں کا دشمن ہے۔ وہ پرندوں جیسی آواز اس لیے نکالتا ہے کہ اسے پرندہ سمجھیں۔ اگر انہیں حکم دیا جائے کہ اس آواز کے علاوہ تو کسی اور رنگ کی آواز نکال تو وہ بھی نکال سکتا ہے۔ چونکہ پہلی آواز بھی اس کی مانگی ہوئی تھی اور اس کی اپنی نہیں تھی۔ وہ کسی دوسری قسم کی آواز بھی نکال سکتا ہے۔ چونکہ اس نے دوسرے لوگوں کا مال چرانا سیکھ لیا ہے۔ وہ ہر گھر کا مال اپنا ظاہر کر کے دکھاتا ہے۔

[چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے، داغ اپنا کلی کلی کو
وہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا
اقبال]

ارتقاء

کہا یہ کتنی مہربانی ہے کہ مولانا تشریف لے آئے۔ مجھے اس کی توقع نہ تھی۔ اور مجھے یہ وہم تک نہ تھا۔ میں اس لائق کہاں۔ مجھے چاہیے میں رات دن ہاتھ باندھے ان کے نوکروں اور خادموں کے زمرہ اور حلقہ میں رہوں۔ ابھی میں اس قابل نہیں ہوں، یہ ان کی

مہربانی ہے۔

فرمایا منجملہ ان باتوں کے یہ ایک ہے کہ تمہاری ہمت بلند ہے۔ ہر چند کہ تمہارا مرتبہ نہایت بلند ہے۔ اور تم بڑے بڑے کاموں میں مشغول ہو اپنی بلندیٔ ہمت کی وجہ سے تم اپنے آپ کو قاصر سمجھتے ہو۔ اور موجودہ صورت حال سے خوش نہیں ہو۔ اور تم بیشمار کام اپنے آپ پر فرض سمجھتے ہو۔ اگرچہ ہمارا دل ہمیشہ ان کی خدمت میں تھا۔ ہم نے چاہا کہ صورت دیکھنے کا شرف بھی حاصل کریں۔ کیونکہ صورت بھی بڑا اعتبار رکھتی ہے۔ اعتبار کا مقام مغز کے ساتھ مشارکت ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ بے مغز چیز پھولتی پھلتی نہیں۔ چھلکے کے بغیر بھی کسی چیز کو نشوونما نہیں ہوتی۔ اگر بغیر چھلکے کا دانہ زمین میں بو دیا جائے تو وہ نہیں اُگتا۔ اگر اسے چھلکے سمیت بویا جائے تو اگ آتا ہے۔ اور وہ بڑا درخت بن جاتا ہے۔ پس اس لحاظ سے جسم بھی ایک عظیم اصل ہے۔ اور ضروری ہے۔ اور اس کے بغیر کوئی کام سرانجام نہیں پاتا۔ اور مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

ای واللہ۔ اصل معنی ہے۔ اس سے پیشتر کہ وہ معنی کو سمجھے وہ خود سراپا معنی بن جاتا ہے۔ یہ جو کہتے ہیں:

رکعتان من الصلوٰۃ خیر من الدنیا وما فیھا۔ — نماز کی دو رکعت دنیا سے اور دنیا میں جو کچھ ہے اس سے بہتر ہیں۔

ہر ایک کے مدنظر نہیں ہوتا۔ یہ صرف اس کے مدنظر ہوتا ہے جس کی دو رکعتیں قضا ہو جائیں تو وہ سمجھے کہ دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب اسی کا ہے۔ مگر اس سب کچھ کا ضائع ہو جانا دو رکعت کے ضائع ہو جانے کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

ایک درویش ایک بادشاہ کے پاس گیا۔ بادشاہ نے اس سے کہا "اے زاہد!" اس

نے جواب دیا. "زاہد تُو ہے" کہا "میں زاہد کیسے ہوا؟ کہ دنیا کا سب کچھ میری ملکیت ہے۔" بولا، نہیں۔ تو عکس دیکھتا ہے۔ دنیا آخرت اور تیرا ملک سب میری ملکیت ہیں۔ اور دنیا میرے تصرف میں ہے۔ تو ہے کہ ایک لقمہ اور چغہ پر قانع ہے :

فاینما تولوا فثم وجه الله (سورۂ بقرہ : ۱۱۴) — جدھر منہ کرو، ادھر ہی اللہ کا چہرہ ہے!

اللہ کا چہرہ ہی رائج و مجریٰ ہے۔ صرف وہی ہے جو منقطع ہونے والا نہیں اور باقی رہنے والا ہے۔ عاشقوں نے اپنے آپ کو اس چہرہ پر فدا کر دیا ہے۔ وہ اس کے عوض کچھ نہیں مانگتے۔ باقی لوگ ڈھور ڈنگروں کی طرح ہیں۔ فرمایا اگرچہ وہ ڈھور ڈنگر ہیں مگر انعام کے مستحق ہیں۔ اور اگرچہ وہ گھوڑوں کی گھاس ہیں لیکن میر اصطبل کے قبول کردہ ہیں۔ اگر وہ چاہے تو اس گھاس کو یہاں سے اپنے طویلۂ خاص میں لے جائے۔ جیسے اس کا آغاز عدم تھا، ویسے ہی اسے اب وجود میں لے آئے۔ وجود کے طویلہ سے اسے جمادات میں لے آئے۔ اور جمادات کے طویلہ سے اسے نباتات کے طویلہ میں لے آئے۔ نباتات سے حیوانات میں، حیوانات سے انسانوں میں اور انسانوں سے فرشتوں میں لے آئے :

الی مالا نهاية. — وہاں تک جہاں کی انتہا نہیں۔

پس یہ سب اس لیے ہوا تاکہ تو اقرار کرے کہ اس جنس کے لیے اس کے بے شمار طویلے ہیں، ایک دوسرے سے بڑھ کر :

تركبن طبقًا عن طبق. فما لهم لایؤمنون. (الشقاق : ۱۴) — تم لوگ چڑھتے رہو گے درجہ بدرجہ۔ ان لوگوں کو کیا ہوا کہ ایمان نہیں لاتے؟

یہ اس لیے ظاہر کر دیا ہے کہ دوسرے طبقات جو آنے والے ہیں تو ان کا اقرار کرے۔ یہ اظہار اس لیے نہیں کیا کہ تُو انکار کرے۔ اور کہہ دے "صرف یہی ہے"۔ ایک

استاد اس لئے اپنی صنعت اور فرہنگ کی نمائش کرتا ہے کہ اس کے معتقد ہو جائیں۔ اور ان دوسرے فرہنگوں پر جو اس نے انہیں نہیں دکھائے ہیں، ان کا بھی اقرار کرنے لگیں۔ اور اس پر ایمان لے آئیں۔ اسی طرح ایک بادشاہ کسان کو خلعت اور صلہ دیتا اور نوازتا ہے کہ اس سے اور بہت سی باتوں کی توقع کرے۔ اور وہ اپنی امید کا دامن اور پھیلائے۔ بادشاہ اس لئے نوازش نہیں کرتا کہ کسان کہدے۔ "بس یہی کچھ ہے۔ بادشاہ اور انعام نہیں دے گا۔ اس نے اسی پر بس کر دی ہے۔" بادشاہ کو اگر معلوم ہو جائے کہ کسان ایسا کہے گا اور ایسا سمجھے گا تو وہ اسے ہر گز انعام نہ دے۔

زاہد وہ ہے جو آخرت کو دیکھتا ہے۔ اور دنیادار لوگ جانوروں کی طرح کھانے کی چیزوں پر جو گھاس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں نظر رکھتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو خاص تر اور عارف ہیں۔ وہ آخر (آخرت) پر نظر رکھتے ہیں۔ نہ آخر (دنیا کے توشہ) پر۔ ان کی نظر اوّل پر پڑتی ہے۔ وہ ہر کام کا آغاز جانتے ہیں۔ جیسے گندم کی حقیقت کو جاننے والا گندم بو کر جانتا ہے کہ گندم اگے گی۔ اس نے آغاز سے انجام کو دیکھا۔ اسی طرح جو اور چاول وغیرہ۔ جس نے اوّل کو دیکھا۔ اس کی نظر آخر پر نہیں۔ کیونکہ اوّل ہی سے آخر معلوم ہو گیا۔ یہ لوگ نادر ہیں جو آخر کو دیکھتے ہیں۔ درمیانہ درجہ کے لوگ ہیں۔ یہ جو آخر میں ہیں۔ یہ چوپائے اور ڈھور ڈنگر ہیں۔

ہر کام میں درد آدمی کی راہنمائی کرتا ہے۔ جب تک اس کے دل میں اس کام کے لیے لالچ اور محبت پیدا ہو کر اس کے اندر درد پیدا نہ کر دیں، وہ اس کام کا قصد ہی نہیں کرتا۔ اور وہ بغیر درد کے اسے میسر بھی نہیں آتا۔ خواہ دنیا ہو خواہ آخرت۔ سوداگری ہو یا بادشاہی۔ علم ہو خواہ نجوم۔ جب تک حضرت مریم کو دردِ زہ شروع نہ ہوا، وہ درخت کے پاس نہ گئیں۔

فجآء ها المخاض الی جذع النخلة. دردزہ انہیں درختِ خرما کے پاس لے پہنچا۔
(سورۂ مریم : ع ۲) انہیں وہ درد درخت کے پاس لے آیا۔ اور
درخت خشک میوہ دار بن گیا۔

جسم مریم کی طرح ہے اور ہم میں سے ہر آدمی حضرت عیسیٰؑ کی طرح ہے۔ اگر ہمیں درد پیدا ہوتا ہے تو ہمارا عیسیٰ جنم لیتا ہے۔ اور اگر درد نہیں ہوتا۔ تو عیسیٰؑ بھی جس چھپے راستہ سے آیا پھر اپنے اصل سے مل جاتا ہے۔ اور ہم اس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور بے بہرہ رہتے ہیں۔

ترجمہ شعر : اندر روح فاقہ کر رہی ہے اور باہر جسم کو ساز و سامان حاصل ہے۔ شیطان نے اتنا کھالیا کہ اسے ہیضہ ہو رہا ہے۔ اور جمشید بھوکا مر رہا ہے۔

اب علاج کر کیونکہ مسیحا زمین پر موجود ہے۔ جب وہ آسمان کی طرف چل دیا تو ساتھ دوائی بھی گئی۔

مقصود، خود شناسی، انانیت

یہ بات اس شخص کے لیے ہے جو اس بات کا محتاج ہو کہ بات کہی جائے تو اسے سمجھ آئے۔ لیکن جو شخص بات سنے بغیر ہی سمجھ جائے، اسے بات کی حاجت نہیں۔ جس شخص کو ادراک ہو اس کے نزدیک سارے آسمان اور زمین ایک بات ہی تو ہیں اور بات ہی سے پیدا ہوئے ہیں :

کن فیکون. (سورۂ یٰسین : ع ۵) ہو جا، پس وہ ہو جاتا ہے۔

پس وہ شخص جو نہایت دھیمی آواز سے سن لیتا ہے۔ اس کے سامنے شور اور بلند

آواز کی کیا ضرورت ہے۔

عربی زبان میں شعر کہنے والا ایک شاعر ایک بادشاہ کے پاس آیا۔ وہ بادشاہ ترک تھا۔ عربی زبان کجا، وہ فارسی بھی نہ جانتا تھا۔ شاعر عربی زبان میں اس کے لیے شعر کہہ کر لایا۔ جب بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ اور اہلِ دیوان امراء وزراء اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق بیٹھ گئے۔ تو شاعر کھڑا ہوا اور شعر پڑھنے شروع کیے۔ شعروں کے ان مقامات پر جہاں کہ تحسین و داد دی جانی چاہیے تھی، بادشاہ سر ہلاتا اور حیرانی اور تعجب کے مقامات پر وہ ششدر نظر آتا۔ جہاں اور فروتنی کا موقع ہوتا، وہاں التفات کرتا۔ تمام درباری حیران رہ گئے کہ ہمارا بادشاہ تو عربی زبان کا ایک لفظ تک نہیں جانتا۔ پھر مجلس میں وہ عین مناسب موقعوں پر وہ کیسے سر ہلانے لگا۔ شاید وہ عربی زبان جانتا ہے۔ اور اس نے یہ بات کئی سال ہم سے چھپائے رکھی۔ اور اگر ہم عربی زبان میں باہم باتیں کرتے وقت اس کی بے ادبیوں کے مرتکب ہوئے ہوں تو ہم پر ہزار افسوس! بادشاہ کا ایک خاص غلام تھا۔ تمام درباری جمع ہوئے۔ اور اسے بہت سے گھوڑے، اونٹ اور اموال دیئے کہ وہ پتہ لگا کر بتائے بادشاہ عربی جانتا ہے یا نہیں۔ اور اگر وہ عربی نہیں جانتا تو موقع کے مطابق کیسے سر ہلاتا رہا؟ یہ کوئی کرامت تھی یا الہام؟ ایک دن شکار کے وقت بادشاہ بہت خوش تھا، غلام کو موقع مل گیا۔ بادشاہ نے بہت سا شکار مار لیا تو غلام نے بات چھیڑ دی۔ بادشاہ بہت ہنسا اور بولا، خدا کی قسم میں عربی نہیں جانتا۔ لیکن میں نے مناسب موقعوں پر جو سر ہلایا وہ یوں تھا کہ میں جان لیتا تھا کہ اس شعر سے کیا مقصد ہے۔ مقصد سمجھ لینے پر میں سر ہلا دیتا اور تحسین و آفرین کرتا تھا۔

پس معلوم ہوا کہ اصل چیز مقصود ہے۔ وہ شعر اس مقصود کی فرع ہے۔ اگر مقصود نہ ہوتا تو شعر نہ کہا جاتا۔ پس اگر مقصود پر نظر کریں، تو دوئی نہیں رہتی۔ دوئی فرع

نیں ہے۔ اصل ایک ہی ہے۔ اسی طرح اگرچہ صورت کے اعتبار سے مشائخ رنگ رنگ کے ہیں۔ ان کے مقال اور حال واحوال ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ لیکن مقصود کے لحاظ سے ایک ہی چیز ہیں۔ اور وہ خدا کی طلب ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے اس دنیا میں ہوا چلتی ہے تو قالین کا گوشہ اس سے ہلتا ہے۔ کمبل اس طرح ہلتے ہیں کہ انہیں انتہائی اضطراب ہے، خس و خاشاک کو ہوا اڑا کر لے جاتی ہے۔ پانی کے حوض میں لہریں پیدا کر دیتی ہے۔ درختوں، شاخوں اور پتوں کو ہوا رقص میں لے آتی ہے۔ یہ تمام احوال ایک دوسرے سے گوناگوں اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن مقصود، اصلیت اور حقیقت کے لحاظ سے یہ ایک ہی چیز ہیں کہ ان سب کی جنبش ایک ہی ہوا سے ہے۔

کیا ہم قصوروار ہیں، فرمایا جس کسی کو یہ فکر ہو، اور جو اپنے آپ سے ناراض ہو کہ آہ میں کیا ہوں اور میں ایسی حرکتیں کیوں کرتا ہوں، تو یہ دوستی اور عنایت کی دلیل ہے۔

محبت باقی رہتی ہے، عتاب باقی نہیں رہتا

کیونکہ وہ عتاب ہمیشہ دوستوں پر کرتے ہیں۔ بیگانوں پر عتاب نہیں کرتے۔ اب عتاب بھی متفاوت ہے۔ اگر کسی پر عتاب کیا جائے اور پھر اس کی خبر گیری اور غم خواری کی جائے تو یہ عتاب عنایت اور محبت کی دلیل ہے اور ایسا عتاب روا ہے۔ اور اگر کسی سے خفگی کا اظہار کیا جائے۔ مگر اس کی غم خواری نہ کی جائے۔ تو ایسا عتاب محبت کی دلیل نہیں۔ غالیچہ کو لکڑی سے پیٹتے ہیں تاکہ اس میں سے مٹی اور گرد جھڑ جائے۔ اس مار پیٹ کو عقل مند لوگ عتاب نہیں کہتے۔ لیکن اپنے بیٹے یا اپنے محبوب کو پیٹا جائے تو یہ عتاب

کہلائے گا۔ یہی وہ صورت ہو گی جس میں عتاب محبت کی دلیل ہو گا۔ پس جب تو اپنے آپ کو شرمندہ اور پشیمان دیکھے، یہ سچی دوستی اور عنایت کی دلیل ہے۔ اور اگر تو اپنے بھائی میں کوئی عیب دیکھے تو وہ عیب تیرے بھائی کا عیب نہیں بلکہ تیرا عیب ہے۔ دُنیا آئینہ کی مثال ہے۔ اس میں تجھے اپنا ہی عکس نظر آتا ہے۔

المؤمن مرآة المؤمن (بخاری) مومن، مومن کا آئینہ ہوتا ہے۔

اس عیب کو اپنے آپ سے جدا کر دے۔ کیونکہ تُو اس سے ناراض ہوتا ہے تو گویا اپنے آپ سے ناراض ہوتا ہے۔

کہا ایک ہاتھی کو پانی پلانے کے لیے پانی کے چشمہ پر لائے۔ پانی میں اپنا عکس دیکھا تو ہاتھی بھاگنے لگا۔ وہ یہ سمجھا کہ کسی دوسرے ہاتھی سے وہ دُور بھاگ رہا ہے۔ اسے یہ سمجھ نہ آئی کہ وہ خود اپنے آپ سے بھاگا ہے۔ ظلم، بغض، حسد، حرص، بے رحمی اور غرور سے پیدا شدہ تیری بداخلاقی تجھے تکلیف نہیں دیتی۔ جب یہی کچھ تو دوسرے میں دیکھتا ہے تو بھاگتا ہے اور تجھے تکلیف ہوتی ہے۔ آدمی کو اپنے چہرہ کے بدنما کیل اور مہاسے برے نہیں لگتے۔ وہ اپنے زخمی ہاتھ کو بے تکلف، آش میں ڈالتا ہے۔ اور اپنی انگلی کو چاٹنے لگتا ہے۔ اپنی اس حرکت سے وہ ناراض نہیں ہوتا۔ یہی کیل مہاسے بالکل تھوڑی مقدار میں یا اس سے آدھا زخم بھی وہ اگر کسی دوسرے کے چہرے پر دیکھے تو اسے سخت ناگوار ہوتا ہے۔ اور اسے نفرت ہوتی ہے۔ اسی طرح کیل مہاسوں جیسی مکروہ بداخلاقی اپنے آپ میں ہو تو بری نہیں لگتی۔ اور اسے نفرت نہیں ہوتی۔ اس کا تھوڑا سا حصہ بھی دوسرے میں نظر آ جائے تو وہ بے حد برا لگتا ہے اور آدمی بیزار ہو جاتا ہے۔ جس طرح تو اس سے بھاگتا ہے، اسی طرح اسے بھی معذور سمجھ۔ اگر وہ تجھ سے بھاگے اور اسے تجھ سے تکلیف ہو تو تیری تکلیف ہی اس کا عذر ہے۔ کیونکہ تجھے اس کو دیکھنے سے ہوئی تھی۔ وہ بھی تو دیکھتا

ہے۔ اسے تجھ کو دیکھ کر بیزاری ہوتی ہے۔ **المومن مراۃ المومن**۔ مومن، مومن کا آئینہ ہے۔ یہ نہیں کہا، **الکافر مراۃ الکافر**، کہ کافر، کافر کا آئینہ ہے۔ کیونکہ کافر اس وجہ سے کافر نہیں کہ اس کے پاس آئینہ نہیں۔ بلکہ وہ اس لیے کافر ہے کہ اسے اپنے آئینے کی خبر نہیں۔

ایک بادشاہ رنجیدگی کی حالت میں ندی کے کنارے بیٹھا تھا۔ امراء اس سے بیحد خائف اور ترساں تھے۔ بادشاہ کی طبیعت کسی طرح خوش نہ ہوتی تھی۔ ایک مسخرہ اس کا بڑا مقرب تھا۔ امراء نے اس کی طرف رجوع کیا کہ اگر تو بادشاہ کو ہنسادے تو تجھے یہ کچھ دیں گے۔ مسخرہ بادشاہ کے قریب آیا اور بے انتہا کوشش کی۔ مگر بادشاہ نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اگر بادشاہ ایک نظر بھی دیکھ لیتا تو مسخرہ مضحکہ خیز شکل بنا کر اسے ہنسا دیتا۔ مسخرہ نے پانی میں جھانکا تو بھی بادشاہ نے سر نہ اٹھایا۔ آخر مسخرہ نے کہا۔ بادشاہ سلامت! پانی میں آپ کو کیا نظر آرہا ہے؟ بادشاہ بولا میں ایک دیوث کو دیکھ رہا ہوں۔ مسخرہ نے جواب دیا، جہاں پناہ آپ کا یہ غلام بھی اندھا نہیں۔ بالکل ایسا ہی ہے۔ اگر تو اس میں کوئی بات دیکھتا ہے جو تجھے تکلیف دیتی ہے تو آخر وہ بھی اندھا نہیں ہے۔ وہ بھی وہ سب کچھ دیکھتا ہے جو تُو دیکھتا ہے۔

اس کے سامنے دو "انا" (میں) کی گنجائش نہیں۔ تُو "انا" کہتا ہے اور وہ بھی "انا" کہتا ہے۔ یا تُو اس کے سامنے مر جائے یا وہ تیرے سامنے مر جائے، تاکہ دوئی نہ رہے۔ لیکن یہ کہ وہ مر جائے؟ اس کا امکان نہیں۔ نہ ظاہر میں نہ باطن میں۔

هو الحی الذی لایموت. وہ زندہ ہے، وہ کبھی نہیں مرتا۔

اس میں یہ خوبی ہے کہ اگر ممکن ہوتا تو تیری خاطر وہ ضرور مر جاتا۔ تاکہ اس کے اور تیرے درمیان سے دوئی اٹھ جاتی۔ اب جب کہ اس کا مرنا ممکن نہیں، تُو مر جا،

تاکہ وہ تجھ پر اپنی تجلی ڈالے اور درمیان سے دوئی اٹھ جائے۔ دو پرندوں کو جنسیت کے وجود سے باہم باندھ دیا جائے تو دونوں کے دو دو پر مل کر چار پر ہو جائیں گے۔ لیکن اس طرح وہ اڑ نہیں سکتے کیونکہ دوئی قائم ہے۔ لیکن اگر ایک زندہ پرندہ سے دوسرا مرا ہوا باندھ دیا جائے تو وہ زندہ پرندہ اسے بھی لے اڑے گا۔ کیونکہ دوئی باقی نہ رہی۔ آفتاب کو یہ خوبی حاصل ہے کہ وہ چمگادڑ کی خاطر مر جائے۔ چونکہ یہ ممکن نہیں، اس لیے وہ کہتا ہے اے چمگادڑ! میرا لطف و کرم سب پر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تجھ پر بھی احسان کروں۔ تو مر جا، کیونکہ مرجانا تیرے لیے ممکن ہے، تاکہ تو میرے جلال کے نور سے بہرہ مند ہو۔ خفاشی سے تو باہر آئے اور قافِ قرب کا عنقا بن جائے۔

خدا کے بندوں میں سے ایک بندہ کو یہ قدرت ہوئی کہ اس نے اپنے آپ کو دوست کی خاطر فنا کر دیا۔ (وہ اس طرح ہوا کہ) اس بندے نے خدا سے اس دوست کو مانگا۔ خدا نے اس کی درخواست قبول نہ کی۔ ندا آئی کہ میں اسے نہیں چاہتا کہ تو دیکھے۔ خدا کے اس بندے نے الحاح و زاری کی اور برابر التجا کرتا رہا کہ اے خدا تو نے اس کی جو خواہش میرے دل میں پیدا کر دی ہے، وہ کسی طرح مجھ سے چھوٹتی نہیں۔ وہ گریہ وزاری کرتا رہا، آخر بارگاہِ ایزدی سے ندا آئی، اگر تو چاہتا ہے کہ تیری یہ خواہش ضرور پوری ہو تو اپنا سر فدا کر، اور اپنے آپ کو مٹا دے، اور باقی نہ رہ، اور اس دنیا سے گزر جا۔

اس بندۂ خدا نے کہا، "اے خدا! میں اس پر راضی ہوں۔" چنانچہ اس نے یہی کیا۔ اپنے دوست کی خاطر اپنا سر دے دیا تاکہ اس کا کام بن جائے۔

جب ایک بندے میں یہ خوبی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی ایسی عمر کو جس کا ایک دن تمام دنیا کی اوّل سے لے کر آخر تک عمر کے برابر ہے، فدا کر دے۔ تو کیا وہ خدا جو ہر احسان اور لطف و کرم کا منبع ہے، ایسے نہیں کرے گا؟ لیکن یاد رکھ کہ اس کے لیے فنا

ممکن نہیں۔ بس تو ہی فنا ہو۔

اولیاء کا کلام

ثقیلی آیا، اور ایک بزرگ سے اوپر بیٹھ گیا۔ فرمایا اس سے ان میں کیا فرق آگیا۔ یہ اوپر ہوں، یا نیچے، چراغ ہیں۔ اگر چراغ اونچائی طلب کرے تو وہ اپنی ذات کے لیے اونچائی نہیں چاہتا۔ اس سے اس کی غرض یہ ہو گی کہ دوسروں کو اس سے زیادہ فائدہ پہنچے، اور لوگ اس کے نور سے فائدہ اٹھائیں۔ ورنہ چراغ ہر حالت میں چراغ ہی ہے۔ اسے اونچی جگہ پر رکھ دو یا نیچی جگہ پر، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ پھر وہ ایسا چراغ ہے، جو آفتابِ ابدی ہے۔ یہ آفتابِ ابدی اگر جاہ و بلندی کے طلب گار ہوں تو ان کی غرض قطعاً یہ ہوتی ہے کہ عوام میں اتنی بصیرت نہیں ہوتی کہ ان کا بلند مقام انہیں معلوم ہو سکے۔ اس لیے خدا کے یہ برگزیدہ بندے اہلِ دنیا کو دُنیا ہی کے جال سے شکار کرتے ہیں، تاکہ وہ اس طرح بلندی حاصل کریں اور پھر آخرت کے پھندے میں آجائیں۔

اسی طرح حضور سرورِ کائنات ﷺ نے مکہ اور دیگر بلاد اس لیے فتح نہیں کیے تھے کہ انہیں ان کی ضرورت تھی۔ انہوں نے انہیں محض اس لیے فتح کیا کہ انہیں نئی زندگی بخشیں، روشنی اور بصیرت دیں۔

هذا كف معودان يعطى وما هو معودان ياخذ.	یہ کفِ دست تو عطا بخشش کی عادی ہے۔ لیکن وہ اس کا عادی نہیں کہ قبول کرے۔

وہ خلقت سے اس لیے فریب کرتے ہیں کہ عطا اور بخشش کریں، اس لیے نہیں کہ کسی سے کوئی چیز لیں۔ جو شخص جال بچھا کر پرندوں کو دھوکا دیتا ہے تاکہ انہیں

پکڑ کر کھا جائے اور پیچ ڈالے اسے مکار کہتے ہیں۔ لیکن اگر ایک بادشاہ اس غرض سے جال بچھاتا ہے کہ وہ اس بیش قیمت عجمی باز کو پکڑے جسے اپنی خوبیوں اور طاقتوں کی خبر نہیں۔ اور اپنے ہاتھ سے اس کی پرورش کر کے اسے اپنی کلائی پر جگہ دے تاکہ اس کا شرف بڑھے اور وہ معلّم و مؤدب بن جائے۔ تو یہ مکر نہیں۔ اگرچہ بظاہر مکر ہی معلوم ہوتا ہے۔ بادشاہ کا یہ فعل عین راستی، عطا اور بخشش ہے۔ یوں سمجھو کہ اس نے مردہ زندہ کر دیا۔ پتھر کو لعل بنادیا۔ مردہ آب پشت کو آدمی بنادیا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوگا۔ اگر باز کو علم ہو کہ اسے کیوں پکڑ رہے ہیں۔ دام اور دانہ کا محتاج نہ ہو۔ اور دل و جان سے وہ دام کا جویا ہو اور بادشاہ کے ہاتھ پر پرواز کرے۔

لوگ بظاہر ان کی بات کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہم نے یہ باتیں بہت سنی ہیں۔ اور ہمارا اندر ان باتوں سے تہ در تہ بھرا ہوا ہے۔

وقالوا قلوبنا غلف بل لعنهم الله بکفرهم. (سورۂ بقرہ: ع ۱۱)	وہ کہتے ہیں ہمارے دل غلافوں کے اندر محفوظ ہیں۔ یہ نہیں، بلکہ خدا نے ان کے انکار کی پاداش میں ان پر لعنت کر رکھی ہے۔

کافر کہتے ہیں ہمارے دل اس قبیل کی باتوں کے غلاف ہیں۔ اور ہم ان سے پُر ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کے جواب میں فرماتا ہے کہ یہ ہرگز ان باتوں سے پُر نہیں ہیں۔ ان کے اندر وسوسہ، شرک، شک اور خیالِ فاسد سے پُر ہیں۔ بلکہ وہ لعنت سے پُر ہیں:

بل لعنهم الله بکفرهم.	بلکہ ان کے انکار پر خدا کی لعنت ہے۔

کاش کہ وہ ان ہذیانات سے خالی ہوتے۔ وہ کسی قابل ہی ہوتے کہ ان کی پذیرائی ہو سکتی۔ وہ کسی قابل بھی تو نہیں۔ خدا تعالیٰ نے ان کے کان، آنکھ اور دل پر مہر لگا دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آنکھ کو رنگ کچھ کا کچھ دکھائی دیتا ہے۔ یوسف ان کو بھیڑیا نظر

آتا ہے اور ان کے کان کچھ اور ہی سنتے ہیں۔ دانائی اور حکمت کو بیہودگی اور ہذیان شمار کرتے ہیں۔ دل کی یہ حالت کہ ان میں سوائے خیالِ فاسد اور وسوسہ کے اور کچھ نہیں آتا۔ ان کے دل کی حالت موسمِ سرما جیسی ہے کہ خیالاتِ فاسد سردی کے مارے تہ در تہ ایک دوسرے سے چمٹے پڑے ہیں۔ تکلیف اور سردی کے مارے وہ جمع ہو گئے ہیں۔

ختم الله علیٰ قلوبهم وعلی سمعهم وعلیٰ ابصارهم غشاوة. (سورۂ بقر : ع ۱) — خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔

ان برگزیدہ لوگوں کی باتوں سے ان کا اندر پُر ہونا تو ایک طرف ان کی بو تک بھی تو ساری عمر انہیں حاصل نہیں ہوئی۔ نہ اِنہیں نہ اُنہیں جو ان پر فخر کرتے ہیں، نہ ان کے باپ دادا کو۔

اولیاء کا کلام کوزہ کی طرح ہے، بعض لوگوں کو خدا تعالیٰ اسے یوں دکھاتا ہے کہ وہ پانی سے پُر معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ اس سے اپنی تشنگی مٹا لیتے ہیں۔ بعض لوگوں کو خدا اسے خالی دکھاتا ہے۔ چونکہ انہیں وہ اس کوزہ کو خالی دکھاتا ہے، یہ کیا شکریہ ادا کریں۔ شکر تو وہ کرے جسے پانی کا کوزہ بھرا ہوا دکھایا جائے۔ خدا تعالیٰ نے جب آدم کو پانی اور مٹی سے بنایا:

خمرت طینة ادم بیدی اربعین صباحاً. — میں نے آدم کی مٹی چالیس دن اپنے ہاتھ سے گوندھی۔

تو اس کا سارا جسم بنا کر کچھ عرصہ اسے زمین پر پڑا رہنے دیا۔ ابلیس، اس پر خدا کی لعنت ہو، آیا اور اس جسم میں گھس گیا۔ وہ اس کی ایک ایک رگ میں پھرا اور اسے اچھی طرح سے دیکھا۔ خون سے بھری ہوئی رگوں اور خلطوں کو دیکھا تو بولا آہ! عجب نہیں ہے

کہ وہ ابلیس جو میں نے عرش کے ستون میں دیکھا پیدا ہونے لگا ہے، وہ ابلیس اگر اس دُنیا میں ہے تو یہی ہے۔

انسان کا ظرف

اتابک کا بیٹا مولانا کے پاس آیا۔ مولانا نے فرمایا، تیرا باپ ہمیشہ حق میں مشغول ہے۔ اس کا اعتقاد غالب ہے، اور اس کی باتوں سے معلوم ہوا ہے کہ ایک دن روم کے کافر کہتے تھے۔ ہم بیٹی تاتاریوں کو دیں، تاکہ ہمارا اور ان کا دین ایک ہو جائے۔ اور یہ نیا مذہب جسے اسلام کہتے ہیں، مٹ جائے۔ میں نے کہا یہ دین کیسے ایک ہو سکتا ہے؟ دین ہمیشہ دو تین ہوتے رہے ہیں۔ اور ان کے درمیان لڑائی جھگڑا قائم رہا ہے۔ تم دین کو ایک کیسے کر سکو گے۔

دُنیا کا ایک ہی مذہب تو وہیں ہو گا یعنی قیامت میں۔ لیکن یہ جگہ جسے دُنیا کہتے ہیں یہاں ممکن نہیں۔ کیونکہ یہاں ہر شخص کی مراد اور خواہش مختلف ہے۔ یہاں سب کا ایک ہونا ممکن نہیں۔ لیکن قیامت کو یہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ساری مخلوقِ خدا ایک جگہ موجود ہو گی۔ سب کے سب ایک ہی طرف دیکھیں گے۔ یک گوش اور یک زبان ہوں گے۔ آدمی میں کئی چیزیں ہیں۔ چوہے اور پرندے کو لیجئے۔ پرندہ پنجرے کو اوپر لے جاتا ہے۔ اور چوہا اسے نیچے کی طرف کھینچتا ہے۔ آدمی میں سو ہزار مختلف جانور ہیں۔ لیکن جب یہ سب وہاں جائیں گے جہاں چوہا، چوہا نہ رہے گا اور پرندہ، پرندہ نہ رہے گا، تو سب ایک ہو جائیں گے۔ کیونکہ مطلوب نہ اوپر ہے اور نہ نیچے۔ جب مطلوب ظاہر ہو جائے نہ اوپر رہا نہ نیچے۔ ایک شخص کی کوئی چیز گم ہو گئی، وہ اسے کبھی دائیں ڈھونڈتا ہے، کبھی بائیں

طرف۔ وہ آگے دیکھتا ہے، پیچھے دیکھتا ہے۔ جب وہ چیز مل گئی، تو نہ وہ اوپر تلاش کرتا ہے، نہ نیچے، نہ وہ دائیں طرف ڈھونڈتا ہے نہ بائیں طرف۔ نہ آگے تلاش کرتا ہے، نہ پیچھے۔ پس اس روز سب خلقِ خدا کی نظر، زبان، کان، ہوش ایک ہو جائیں گے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے دس آدمی ایک باغ یا دوکان کی ملکیت میں شریک ہوں، ان کی بات ایک ہو گی۔ ان کا غم ایک ہو گا۔ ان کی مصروفیتیں ایک ہوں گی۔ چونکہ ان کا مطلوب ایک ہے، ان کی ہر چیز ایک ہو گی۔ پس قیامت کے دن جب سب کا واسطہ خدا سے پڑے گا۔ یہ سب ایک ہو جائیں گے۔ دُنیا میں ہر شخص انہی معنوں میں کسی نہ کسی کام میں مشغول ہے۔ کوئی عورت کی محبت میں ہے۔ کوئی مال کی محبت میں۔ کوئی اکتساب میں ہے اور کوئی علم میں۔ سب کا اعتقاد یہ ہے کہ میرا علاج، میرا ذوق، میری خوشی، میری راحت اسی میں ہے۔ اور یہی خدا کی رحمت ہے، جب اس جگہ جاتا ہے، تلاش کرتا ہے۔ مگر اپنا علاج اور راحت نہیں پاتا تو واپس لوٹتا ہے۔ کچھ عرصہ انتظار کرتا ہے اور پھر کہتا ہے، وہ ذوق اور رحمت جستجو سے حاصل ہوتی ہے۔ میں نے پوری جستجو نہیں کی۔ پھر تلاش کرتا ہوں۔ پھر ڈھونڈتا ہے۔ لیکن پھر بھی اسے گوہرِ مقصود ہاتھ نہیں آتا۔ یہاں تک کہ کسی وقت رحمت بے پردہ ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اب اسے سمجھ آتی ہے کہ جس راستہ پر وہ چل رہا تھا، وہ صحیح نہ تھا۔ لیکن خدا تعالیٰ کے ایسے بندے بھی ہیں کہ قیامت سے پہلے ہی دیکھ لیتے ہیں۔ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں:

لو کشف الغطاء ماازددت یقیناً۔ جب حشرِ اجساد ہو گا اور قیامت برپا ہو جائے گی، ہمارے یقین میں اضافہ نہ ہو گا۔

اس کی مثال یوں ہے کہ ایک قوم اندھیری رات میں ایک اندھیرے گھر کے اندر نماز پڑھ رہی ہے۔ کسی کا منہ کسی طرف ہے اور کسی کا کسی طرف۔ جب صبح کی روشنی

نمودار ہوگی، تو سب کے سب اپنا منہ ایک ہی طرف پھیر لیں گے۔ لیکن ان میں سے جن کے منہ پہلے ہی قبلہ کی طرف تھے، اس رات وہ منہ کدھر پھیریں گے؟ پس جب سب نے قبلہ کی طرف منہ کر لیا، تو ان کا منہ پہلے ہی قبلہ کی طرف تھا۔ پس ان کا منہ اسی طرف اور وہ ہر دوسری طرف سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ جہاں تک ان کا تعلق ہے، قیامت ان کے سامنے موجود ہے، اور حاضر ہے۔ بات تو ختم ہونے والی نہیں۔ لیکن طالبوں کے ظرف کے مطابق آیا ہے کہ :

وان من شيءٍ الا عندنا خزائنهٗ وما ننزلهٗ الا بقدرٍ معلوم. (سورۂ حجر، ع ۲)

کوئی شے ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے ہاں نہ ہوں۔ لیکن ہم اس میں سے ایک مقدار معین کے مطابق اتارتے رہتے ہیں۔

حکمت بارش کی طرح ہے۔ یہ اپنی کان میں بے انتہا ہے۔ لیکن وہ مصلحت کے مطابق آتی ہے۔ سرما میں، بہار میں، گرما میں، خزاں میں۔ مصلحت کے مطابق زیادہ یا کم آتی ہے۔ لیکن جس جگہ سے وہ آتی ہے، وہاں اس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ شکر کو کاغذ میں لپیٹتے ہیں، یا عطار دوائیوں کو کاغذ میں باندھتے ہیں۔ لیکن یہ شکر صرف اتنی ہی نہیں ہوتی جتنی کہ کاغذ میں لپیٹی گئی۔ شکر کی کانیں اور دواؤں کی کانیں بے حد ہیں۔ ان کا کوئی شمار نہیں۔ یہ کاغذ میں کیسے سما سکتی ہیں۔ بعض لوگوں نے طعنہ دیا کہ قرآن آیت آیت ہو کر کیوں نازل ہوتا ہے؟ پوری سورت کی سورت کیوں نازل نہیں ہوتی؟ حضور سرور کائنات ﷺ نے فرمایا، یہ احمق لوگ کیا کہتے ہیں۔ اگر پوری سورت مجھ پر بیک وقت نازل ہو تو میں گداز ہو جاؤں اور باقی نہ رہوں۔ کیونکہ واقفیت رکھنے والا آدمی تھوڑے سے بہت زیادہ سمجھ جاتا ہے۔ ایک چیز سے بہت سی چیزیں اور ایک سطر سے کتابیں۔

اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ ایک جماعت بیٹھی ہے اور ایک حکایت سن رہی

ہے۔ لیکن ان میں وہ شخص جو تمام حال جانتا ہے اور جو کچھ کہ واقع ہوا وہ ایک اشارہ ہی سے سب کچھ سمجھتا ہے، اس کا چہرہ کبھی خوف کے مارے زرد ہو جاتا ہے اور کبھی فرطِ جوش سے سرخ ہو جاتا ہے۔ اس کا حال کبھی کچھ ہوتا ہے اور کبھی کچھ۔ لیکن باقی اہلِ مجلس صرف اتنی بات ہی سمجھتے ہیں جتنی کہ انہوں نے سن لی۔ کیونکہ وہ پورے حال سے واقف نہیں۔ جو پورے حال سے واقف تھا، اس نے ان کے مقابلہ میں بہت کچھ سمجھ لیا۔

اب ہم اصل مطلب کی طرف آتے ہیں۔ تو عطار کے پاس جائے تو اس کے پاس شکر بہت ہے۔ لیکن وہ یہ دیکھتا ہے کہ تو پیسے کتنے لایا ہے۔ ان پیسوں کے مطابق وہ تجھے شکر دیتا ہے۔ پیسے یہاں ہمت اور اعتقاد ہیں۔ ہمت اور اعتقاد کے مطابق بات ہوتی ہے۔ جب تو شکر خریدنے کے لیے آتا ہے، تو دیکھتے ہیں کہ تیرے کیسہ میں کتنی نقدی ہے۔ نقدی کے مطابق پیمانہ سے شکر ناپ کر دیتے ہیں۔ ایک پیمانہ یا دو پیمانے۔ لیکن اگر تو شکر لادنے کے لیے اونٹوں کی قطاریں اور نقدی کے بےشمار کیسے لایا ہے تو کہیں گے کہ بھئی بڑے پیمانے لاؤ۔ اسی طرح بعض آدمیوں کو دریا بھی تھوڑا ہوتا ہے۔ اور بعض آدمیوں کو چند قطرے بھی بہت ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کے لیے مضر ہوتا ہے۔ یہ بات صرف عالمِ معنی، علم اور حکمت ہی میں نہیں، ہر چیز کا یہی حال ہے۔ مال، زر، معادن بے حد اور بے پایاں ہیں۔ لیکن ہر شخص کو اس کے ظرف کے مطابق ملتا ہے۔ کیونکہ زیادہ کی وہ تاب نہیں لا سکتا اور پاگل ہو جاتا ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ عاشقوں میں سے مجنوں اور فرہاد جو پہاڑوں اور جنگلوں میں خاک چھانتے پھرے، جب عورت کے عشق میں ان کی شہوت ان کی طاقت سے بڑھ گئی، تو وہ اپنے آپ میں نہ رہے۔

اسی طرح کیا تجھے معلوم نہیں کہ فرعون کو جب ملک اور مال زیادہ دے دیا گیا تو اس نے خدائی کا دعویٰ کر دیا۔ وان من شیٔ الا عندنا خزائنہ۔ اچھی اور بری کوئی چیز ایسی

نہیں جو ہمارے پاس اور ہمارے خزانہ میں بے حد اور بے پایاں نہ ہو۔ لیکن ہم ہر چیز انسان کے ظرف کے مطابق اسے دیتے ہیں کیونکہ مصلحت اسی میں ہے۔

ہاں یہ شخص معتقد تو ہے، لیکن وہ اپنے اعتقاد کو نہیں جانتا۔ جیسے ایک بچہ روٹی کا معتقد ہے، لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ کس چیز کا معتقد ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے نامیات میں سے درخت پیاس کی وجہ سے زرد اور خشک ہو جاتا ہے، مگر وہ نہیں جانتا کہ پیاس کسے کہتے ہیں۔ آدمی کا وجود ایک جھنڈے کی طرح ہے۔ جھنڈے کو پہلے ہوا میں لہراتے ہیں۔ اس کے بعد خدا ہر طرف سے عقل، فہم، غصہ، غضب، حلم، کرم، خوف، امید اور بیشمار حالات اور ان گنت صفات کو بروئے کار لا کر لشکروں کو اس جھنڈے کے نیچے بھیج دیتا ہے۔ جو شخص بھی اس صورتِ حال کو دور سے دیکھتا ہے، اسے اکیلا جھنڈا ہی نظر آتا ہے۔ لیکن جو شخص زیادہ نزدیک آ کر دیکھتا ہے، اسے جھنڈے کے نیچے کیا کیا موتی اور کیا کیا معنی نظر آتے ہیں۔

ایک شخص آیا، مولانا نے پوچھا تُو کہاں تھا؟ ہم تیرے مشتاق تھے تُو دور کیوں رہا؟ بولا اتفاق ایسا ہی ہو گیا۔ فرمایا ہم نے بھی دُعا کی تھی کہ یہ اتفاق درمیان میں پلٹ جائے اور زائل ہو جائے۔ وہ اتفاق جو ہجر کا باعث بنتا ہے، نازیبا ہے۔ واللہ سب کچھ خدا ہی کی طرف سے ہے۔ لیکن خدا سے ہر چیز کی نسبت نیک ہے۔ لیکن ہم سے نہیں۔ سچ کہتے ہیں، خدا سے سب نسبت نیک اور بہ تمام و کمال ہے۔ لیکن ہم سے نہیں۔ زنا، پاکبازی، بے نمازی، نماز، کفر، اسلام، شرک، توحید کی خدا سے نسبت نیک ہے۔ لیکن ہم سے زنا، چوری، کفر، شرک کی نسبت بد ہے۔ توحید، نماز، خیرات کی نسبت نیک ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک بادشاہ کے ملک میں قید خانہ، پھانسی کا پھندا، خلعت، مال، املاک، حشم، شادی، طبل، علم سبھی کچھ ہوتا ہے۔ بادشاہ سے ان سب چیزوں کی نسبت نیک ہے۔

خلعت اس کے ملک کا کمال ہے۔ پھانسی کا پھندا، قتل اور قید خانہ بھی اس کے ملک کا کمال ہے اور اس کے ساتھ ان سب کی نسبت کمال ہے۔ لیکن جہاں تک رعایا کا تعلق ہے، خلعت اور پھانسی کا پھندا کیسے ایک ہو سکتے ہیں۔

نماز اور ایمان

سوال کیا کہ نماز سے فاضل تر کیا ہے؟ اس کا ایک جواب ہم نے یہ دیا کہ نماز کی جان، نمازِ مع تقریرہ سے بہتر ہے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ ایمان نماز سے بہتر ہے۔ کیونکہ نماز پانچ وقت فرض ہے۔ اور ایمان فرض سے پیوست ہے۔ اور نماز معذوری کی حالت میں ساقط ہو جاتی ہے۔ اور تاخیر کی اجازت ہوتی ہے۔ اور ایمان کو نماز پر دوسری فضیلت یہ ہے کہ ایمان کسی معذوری کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتا۔ پھر تاخیر کی بھی اجازت نہیں۔ ایمان بغیر نماز کے منفعت بخش ہے۔ مگر ایمان کے بغیر نماز کوئی فائدہ نہیں دیتی۔ جیسے منافقوں کی نماز۔ ہر دین میں نماز جدا ہے۔ لیکن ایمان کسی دین میں تبدیل نہیں ہوتا۔ اس کے احوال اور اس کا قبلہ تبدیل نہیں ہوتا۔ اور دوسرے فرق ہیں۔ سننے والے کے ظرف کے مطابق یہ فرق ظاہر ہوتے ہیں۔ سننے والا خمیر کنندہ کے سامنے آٹے کی طرح ہے۔ کلام پانی کی طرح ہے۔ آٹے میں صرف اتنا پانی ڈالتے ہیں، جس سے وہ ٹھیک ہو جائے۔

ترجمہ شعر: میری آنکھ دوسرے پر نہیں پڑتی۔ میں کیا کروں۔ اپنے آپ سے گلہ کر۔ کیونکہ اس سے روشنائی تُو خود ہے۔

یعنی میں کیا کروں، سننے والا سوائے تیرے کسی کو تلاش نہیں کرتا۔ اس کی

روشنائی تُو ہی ہے، اس سبب سے کہ تُو اپنے آپ ہی میں ہے۔ اپنے آپ سے تُو نے رہائی نہیں پائی۔ اگر تُو اپنے آپ سے رہائی پا جاتا تو تیری روشنائی لاکھ گنا ہو جاتی۔

حکایت : ایک شخص بے حد کمزور، بوڑھا، حقیر تھا۔ وہ ایک چڑیا کی طرح بہت ہی حقیر تھا۔ اتنا حقیر کہ بڑی بڑی قبیح صورتیں بھی اسے دیکھتیں، تو خدا کا شکر ادا کرتیں کہ وہ اس سے تو بہت بہتر ہیں۔ اسے دیکھنے سے پہلے انہیں شک ہی ہوتا کہ کوئی ان سے بڑھ کر کیسے ہو سکتا ہے۔ بایں ہمہ بادشاہ کے دیوان میں وزیر کے سامنے وہ بڑی بڑی گپیں ہانکتا اور درشت زبانی کرتا۔ وزیر کو اس سے بہُت تکلیف ہوتی اور وہ بڑے تحمل سے کام لیتا۔ یہاں تک کہ ایک دن وزیر بہت غصے ہوا اور بلند آواز سے بولا کہ اے اہلِ دیوان! فلاں آدمی کو میں نے خاک سے اٹھایا۔ اس کی پرورش کی۔ قسم قسم کے کھانے اور نعمتیں اسے کھلائیں۔ اور یہ کسی قابل ہوا۔ اور یہاں تک اس کی رسائی ہوئی۔ اور مجھے ہی یہ واہی تباہی باتیں کہہ رہا ہے۔ وہ حقیر ترین آدمی اچھل کر وزیر کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اور بولا، اے دیوان وا کابر دولت وارکان! یہ درست کہہ رہا ہے۔ اس کے اور اس کے باپ دادا کے ٹکڑوں پر میں پلا اور بڑا ہوا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج میں اس حقیر اور رسوا حالت میں ہوں۔ اگر میں نے کسی دوسرے آدمی کے نان و نعمت پر پرورش پائی ہوتی، تو ہو سکتا تھا کہ میری صورت، میرا قد اور میری قیمت اس سے بہت زیادہ ہوتی۔ اس نے مجھے خاک سے اٹھایا۔ بے شک میں یہی کہتا ہوں :

یلیتنی کنت ترابا. (نبا : ع ۲) کاش میں مٹی ہی رہتا!

اور اگر کسی دوسرے آدمی نے مجھے خاک سے اٹھایا ہوتا تو یوں میرا مضحکہ نہ اُڑتا۔

اب جو مرید کسی مردِ حق سے پرورش پاتا ہے، اس کی روح پاک اور مطہر ہوتی ہے۔ اور جو شخص کسی جھوٹے، مکار اور فریبی کے ہاتھوں پرورش پاتا ہے، اس سے علم

سیکھتا ہے، اس حقیر بوڑھے، عاجز و غمگین اور کم حواس آدمی کی طرح ہوتا ہے۔

والذین کفروا اولیاءھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمات. (بقر: ع ۳۴)	کافروں کے دوست شیاطین ہیں، جو انہیں روشنی سے نکال کر تاریکیوں میں لاتے رہتے ہیں۔

دراصل آدمی کی سرشت میں تمام علوم کا خمیر موجود ہے۔ اس کی روح غیب کی چیزیں دکھاتی ہے، جیسا کہ صاف پانی کے نیچے جو سنگریزے اور مٹی ہو نظر آجاتی ہے اور جو کچھ پانی کے اوپر ہے وہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس صاف پانی کا عکس خدا تعالیٰ نے اس موتی پر ڈال دیا ہے، بغیر کسی علاج کے اور بغیر کسی تعلیم کے۔ لیکن جب اس صاف پانی میں مٹی مل جائے، یا اس میں دوسرے رنگوں کی آمیزش ہو جائے، تو اس کی وہ خاصیت وہ دانش اس سے جدا ہو جاتی ہے اور وہ بھول جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے انبیاء اور اولیاء کو بھیجا۔ وہ بہت بڑے صاف پانی کی طرح تھے۔ ہر حقیر رنگین اور گدلا پانی جو اس میں آکر ملا، اسے اپنی تیرگی اور عارضی رنگ سے رہائی مل گئی۔ پس جب وہ اپنے آپ کو صاف دیکھتا ہے، تو اسے یاد آتا ہے کہ میں پہلے اسی طرح صاف اور نکھرا ہوا تھا۔ اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کی تیرگی اور رنگ عارضی ہے۔ اسے اپنی وہ حالت یاد آجاتی ہے، جو اس کے ان عوارض کے لاحق ہونے سے پہلے تھی۔ اور وہ کہہ اٹھتا ہے:

هٰذا الذی رزقنا من قبل. (سورۂ بقر: ع ۳)	یہ وہی ہے جو اس سے قبل ہمیں رزق مل چکا ہے۔

پس انبیاء اور اولیاء پہلی حالت یاد دلانے والے ہوتے ہیں، یہ نہیں کہ وہ اس کے جوہر میں کوئی چیز ملا دیتے ہیں۔ اب ہر گدلا پانی جس نے کہ بڑے اور صاف پانی کو پہچان لیا کہ میں اس میں سے ہوں اور اسی کا ہوں، اس میں مل گیا۔ اور جس گدلے پانی نے

بڑے پانی کو نہ پہچانا اور اسے غیر جنس سمجھا اور جس نے دوسرے رنگوں اور تیرگیوں میں پناہ لی، وہ سمندر اسے نہیں مل سکتا۔ سمندر اس سے دور ہی رہتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے:

فما تعارف منها اسلف وما تناکر منها ایتلف وما تناکر منها اختلف. (صحیح بخاری)

جس روح نے اس سے موانست کی وہ اس سے مل گئی۔ اور جس نے اس سے بیگانگی اختیار کی، وہ الگ ہو گئی۔

اور اس نے فرمایا:

لقد جاء کم رسول من انفسکم. (سورۂ توبہ: ع ۱۶)

تمہارے پاس رسول تمہیں میں سے آیا۔

یعنی بڑا پانی چھوٹے پانی کی جنس سے ہے۔ اس کے نفس سے اور اس کی اصل سے ہے۔ اور جو پانی اسے اپنے نفس سے خیال نہیں کرتا تو اس کا یہ انکار نفسِ آب سے نہیں۔ وہ بد دوست کی وجہ سے ہے۔ اس بد دوست کا عکس اس پانی پر پڑتا ہے۔ اور چھوٹا پانی نہیں جانتا کہ بڑے پانی اور سمندر سے میرا دور بھاگنا میرے نفس کی وجہ سے ہے۔ یا اس بد ہمنشین کے عکس کی وجہ سے، جس سے اس کا بہت میل ملاپ ہے۔ جیسا کہ مٹی کھانے والا نہیں جانتا کہ مٹی کی طرف میرا میلان میری طبیعت کا تقاضا ہے، یا اس کی وجہ کوئی بیماری ہے جو میری طبیعت سے مل گئی ہے۔

سمجھ لے کہ ہر شعر، حدیث یا آیت جسے شہادت کے طور پر لاتے ہیں، دو شاہدوں اور دو گواہوں کی طرح ہے۔ گواہی کے اصول سے واقف گواہ ہر مقام کے مناسب حال مختلف گواہیاں دیتے ہیں۔ گواہ دو ہی ہوتے ہیں۔ وہی وقف خانہ کے گواہ۔ وہی بیع دوکان کے گواہ۔ وہی نکاح کے گواہ ہوتے ہیں۔ جس جھگڑے کے وقت بھی وہ موجود ہوں، اس کے مطابق گواہی دیتے ہیں۔ گواہوں کی صورت وہی ہے۔ مگر مفہوم مختلف

ہے:

نفعنا الله وایّاکم اللون لون الحرم والریح ریح المسك.	اللہ تعالیٰ ہمارے حق میں اور آپ کے حق میں الحرم کی رنگینی اور مشک کی مہک کو نفع مند بنائے۔

جدوجہد کے بغیر عشق، عشق نہیں

ہم نے کہا کون آزردہ ہوا، جسے تم دیکھتے ہو۔ کہتا تھا میں خدا تعالیٰ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا کہ اس زمانہ میں خداوند تعالیٰ کو حقیقت میں نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ جو شخص یہ خواہش رکھتا ہے، میں خدا تعالیٰ کو دیکھوں، وہ خدا تعالیٰ کا نقاب ہے۔ اس گھڑی وہ خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا۔ اسی طرح خلقِ خدا انواع و اقسام کی چیزوں، باپ، ماں، بھائیوں، دوستوں، آسمانوں، زمینوں، باغوں، ایوانوں، علوم، اعمال، اطعمہ، مشروبات سے ازروئے حق، مہر و محبت اور شفقت رکھتی ہے۔ یہ تمام چیزیں نقاب ہیں۔ جب وہ اس دُنیا سے گزر جائیں گے اور اس بادشاہِ حقیقی کو بے نقاب دیکھیں گے تو انہیں سمجھ آجائے گی کہ وہ سب چیزیں نقاب اور پردے تھیں۔ ان کا مطلوب دراصل ایک چیز تھی۔ تمام مشکلیں حل ہو جائیں گی۔ وہ سوال اور مشکلات جو ان کے دل اور ذہن میں تھیں، ان سب کا وہ جواب سن لیں گے۔ اور سب کچھ عیاں ہو جائے گا۔ اور خدا تعالیٰ کی طرف سے جواب اس طرح پر نہیں ہو گا کہ وہ ہر مشکل کا حل انفرادی طور پر جدا جدا بتائے، بلکہ ایک ہی جواب سے سارے سوال حل ہو جائیں گے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے موسم سرما میں سردی کی

۱۔ ہرچند سبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور (غالب)

شدت سے بچنے کے لیے ہر شخص لباس، پوستین، تنور یا گرم غار کی پناہ ڈھونڈتا ہے، یا جیسے سردی کے زہر سے موسمِ سرما میں ساری نباتات، درخت اور گھاس کو پت جھڑ کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ اور ٹنڈ منڈ درخت اپنے آپ کو چھپاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، تاکہ انہیں سردی کا آسیب نہ ہو جائے۔ جب بہار آتی ہے تو ان سب کے جواب میں اپنی تجلی فرماتی ہے۔ زندگی اور موت کے متعلق ان کے سب سوال یکبارگی حل ہو جاتے ہیں، اور کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔ اب یہ اپنا سر باہر نکالتے ہیں۔ اور جانتے ہیں کہ اس مصیبت کی اصل وجہ کیا تھی۔

خدا تعالیٰ نے یہ نقاب اس مصلحت کے ماتحت پیدا کیے ہیں کہ اگر وہ اپنا جمال بے پردہ ہو کر دکھائے، تو ہم اس کی تاب نہیں لا سکتے۔ اور اس سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے۔ ان نقابوں کے ذریعہ ہمیں مدد اور منفعت حاصل ہوتی ہے۔ تو سورج کو دیکھتا ہے کہ اس کی روشنی میں ہم چلتے پھرتے ہیں، اور ہم دیکھتے ہیں، اور اس روشنی کی مدد سے برے بھلے کی تمیز کرتے ہیں۔ اور اس سے گرم ہوتے ہیں۔ درخت اور باغ اس سے پھل حاصل کرتے ہیں۔ کچے اور ترش میوے اس کی حرارت سے پک کر شیریں ہو جاتے ہیں۔ اس کی تاثیر سے سونے، چاندی، لعل اور یاقوت کی کانیں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ سورج جو چند در چند واسطوں کے ذریعہ ہمیں اتنے فائدے پہنچاتا ہے، ہمارے زیادہ نزدیک آجائے تو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے، بلکہ تمام دُنیا اور خلقت کو جلا کر رکھ دے۔ اور کچھ باقی نہ رہے۔ خداوند تعالیٰ جب پردے کے پیچھے سے پہاڑ پر تجلی گراتا ہے تو اسے درختوں، پھولوں اور سبزہ زار سے آراستہ پیراستہ کر دیتا ہے۔ اور جب بے پردہ ہو کر اس پر تجلی گراتا ہے تو اسے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ اور اس کے ذرّے تک اُڑ جاتے ہیں۔

فلما تجلّی ربه للجبل جعله دکا. جب اس کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلی کی تو
(سورۂ اعراف: ع ۱۷) اسے چور چور کر دیا۔

ایک سائل نے سوال کیا کہ آخر موسم سرما میں بھی یہی آفتاب ہوتا ہے۔ کہا یہاں ہماری مراد فقط ایک مثال بیان کرنا ہے۔ لیکن وہاں نہ بوجھ نہ لونٹ، کچھ بھی نہیں۔ قصہ کچھ اور ہے اور نظیر کچھ اور۔ ہر چند کہ عقل اپنی کوشش سے اس چیز کا ادراک نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ اپنی کوشش کو کیسے ترک کر سکتی ہے؟ اگر عقل اپنی کوشش کو چھوڑ دے تو پھر وہ عقل نہیں رہتی۔ عقل وہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے ادراک میں فکر مند اور جدوجہد سے رات دن مضطرب اور بے قرار رہتی ہے۔ اگرچہ خدا سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اور وہ قابلِ ادراک نہیں۔

عقل پروانہ کی طرح ہے۔ اور معشوق شمع کی طرح۔ ہر چند کہ پروانہ جب اپنے آپ کو شمع پر گراتا ہے تو جل جاتا ہے۔ اور ہلاک ہو جاتا ہے۔ لیکن پروانہ وہی ہے جسے جل مرنے کا آسیب ہو اور جسے دُکھ پہنچے۔ اور جو شمع سے آرام نہ پائے۔ اور اگر پروانہ کی طرح کوئی حیوان ہو کہ شمع کا نور اسے صبر و شکیب دیتا ہے۔ اور اپنے آپ کو اس پر نہیں گراتا، تو وہ پروانہ نہیں۔ اور اگر اپنے آپ کو شمع کے طور پر گرائے اور جلے نہیں تو وہ بھی شمع نہیں ہے۔

پس وہ آدمی کہ جو خدا کے نور سے شکیب پاتا ہے اور جدوجہد نہیں کرتا، آدمی نہیں ہے۔ اور اگر وہ خدا کا ادراک کر سکتا ہے تو وہ خدا ہی نہیں۔ پس آدمی وہ ہے جو جدوجہد کے بغیر نہیں۔ اور جو خدا تعالیٰ کے جلال کے گرد گھومتا ہے۔ اور بے آرام اور بے قرار رہتا ہے۔ اور خدا وہ ہے جو آدمی کو جلاتا ہے اور اسے نیست کرتا اور خود کسی عقل کی سمجھ میں نہیں آتا۔

---

[۱] جو سمجھ میں آ گیا، لاانتہا کیونکر ہوا
جس کو انسان پا گیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا (اکبر الہ آبادی)

آشنائی

پروانہ نے کہا کہ مولانا بہاء الدین نے، پیشتر اس کے کہ مولانا اپنا مبارک چہرہ دکھاتے، مجھ سے معذرت کی کہ مولانا نے اس جہت میں حکم دے رکھا ہے کہ امیر میری ملاقات کے لیے تشریف نہ لائیں اور تکلیف نہ فرمائیں۔ کیونکہ ہم پر کئی حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ کبھی یہ حالت ہوتی ہے کہ ہم بات کرتے ہیں۔ کبھی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ ہم بات نہیں کرتے۔ کبھی ہمیں لوگوں کی پروا ہوتی ہے۔ کبھی ہم خلوت اور عزلت میں ہوتے ہیں اور کسی سے نہیں ملتے، اور کبھی استغراق اور حیرت کی کیفیت ہم پر طاری ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ امیر اس حالت میں آئیں کہ میں ان کی دلجوئی نہ کر سکوں اور مجھے اتنی فرصت ہی نہ ہو کہ میں ان سے پند و نصیحت کی بات کر سکوں۔ پس یہ بہتر ہے کہ جب ہمیں فرصت ہو کہ ہم دوستوں کا بھلا کر سکیں اور انہیں فائدہ پہنچا سکیں، تو ہم خود ان سے ملاقات کے لیے جایا کریں۔

امیر نے کہا میں نے مولانا بہاء الدین کو جواب دیا کہ میں اس لیے نہیں آتا کہ مولانا میرا بھلا کرتے ہیں۔ اور مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ میں اس لیے آتا ہوں کہ شرف حاصل کروں۔ اور ان کے غلاموں کے زمرہ میں شامل ہوں۔ اس وقت جو واقعات ہوئے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ مولانا مشغول تھے اور شکل نہ دکھائی۔ مجھے بڑی دیر تک انتظار میں رکھا، تاکہ میں جان لوں۔ اگر مسلمان اور نیک آدمی میرے دروازہ پر آئیں، تو انہیں انتظار نہ کراؤں۔ اور جلدی ان کا کام کر دوں۔ انتظار ایسی مصیبت اور دشواری ہے کہ مولانا نے اس کی تلخی مجھے چکھادی۔ اور مجھے ادب سکھایا کہ میں دوسروں سے ایسا نہ کروں۔

مولانا نے فرمایا، نہیں، بلکہ میں نے جو آپ کو منتظر رکھا، یہ میری عین عنایت تھی۔ حکایت بیان کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے، اے میرے بندے! میں تیری حاجت روائی تیری دُعا اور آہ و زاری ہی کی حالت میں جلد کر دوں مگر مجھے تیری آواز اور نالے بہت پسند آتے ہیں۔ دُعا کے قبول ہونے میں اس لیے تاخیر ہوتی ہے تاکہ تیری آواز اور نالے جو مجھے پسند ہیں، وہ میں بہت سے سن لوں۔ مثلاً دو فقیر ایک شخص کے دروازے پر آئے۔ ان میں ایک فقیر، اس شخص کا چہیتا اور محبوب ہے اور دوسرے سے اسے دشمنی ہے۔ وہ شخص اپنے غلام سے کہے گا، اس دوسرے فقیر کو جلدی روٹی کا ٹکڑا دے کہ وہ یہاں سے چلتا پھرتا نظر آئے۔ اور میرے محبوب فقیر سے کہہ دے کہ روٹی ابھی پکی نہیں، تھوڑی دیر صبر کر اور ٹھہر تاکہ روٹی پک جائے تو تجھے دی جائے۔ میری طبیعت میں اکثر آتا ہے کہ میں دوستوں سے ملوں اور خوب جی بھر کر انہیں دیکھوں۔ اور وہ بھی میرے متعلق یہی چاہتے ہیں۔

اس دُنیا میں جن دانا دوستوں نے ایک دوسرے کو بہت زیادہ دیکھا ہو گا، وہ جب اگلے جہان میں اکٹھے ہوں گے تو ان کے باہم آشنائی پختہ ہو چکی ہو گی۔ وہ فوراً ایک دوسرے کو پہچان لیں گے۔ اور وہ جان لیں گے کہ ہم دُنیا میں اکٹھے رہ چکے ہیں۔ اور وہ خوش خوش ایک دوسرے سے ملیں گے۔ کیونکہ آدمی اپنے دوست کو بہت جلد کھو بیٹھتا ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اس دُنیا میں تو جس شخص کو اپنا دوست بناتا ہے، اسے اپنی جان سمجھتا ہے، اور تیری نظر میں وہ یوسف ہوتا ہے، وہ ایک ہی قبیح فعل کی بناء پر تیری نظروں سے چھپ جاتا ہے، اور تو اسے کھو بیٹھتا ہے۔ وہ یوسف تیرے لیے بھیڑیا بن جاتا ہے۔ وہی شکل جو تجھے یوسف نظر آتی تھی، اب وہ بھیڑیا دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ اس کی شکل تبدیل نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی بالکل ویسی ہی ہے، جیسے تو پہلے دیکھتا تھا۔ ایک ہی

عارضی سی حرکت سے تو نے اسے کھو دیا۔ کل جبکہ حشر برپا ہو گا، اور یہ ذات ایک دوسری ذات سے بدل جائے گی۔ چونکہ تو نے اسے دُنیا میں اچھی طرح پہچانا نہ ہو گا اور اس کی خوبیوں کو سمجھا نہ ہو گا، تو اسے وہاں کیسے پہچان سکے گا؟ مختصر یہ کہ ایک دوسرے کو بہت بہت دیکھنا چاہیے۔ آدمی میں نیک اور بد صفتیں عارضی ہیں، ان سے درگذر کر کے اس کی عین ذات تک پہنچنا چاہیے۔ یہ اوصاف جو انسان ایک دوسرے میں شمار کرتے ہیں، اصلی نہیں۔

قصہ بیان کرتے ہیں کہ کسی شخص نے کہا میں فلاں مرد کو خوب پہچانتا ہوں اور میں اس کی نشانیاں بتا سکتا ہوں۔ اس سے کہا گیا، فرمایئے۔ اس نے جواب دیا، میں نے اس سے مکان کرایہ پر لیا تھا، اور اس کے پاس دو سیاہ گائیں تھیں۔ اب یہی مثال یہاں صادق آتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں ہم نے فلاں دوست کو دیکھا ہے اور اسے ہم خوب پہچانتے ہیں۔ اور اس کی جو نشانیاں وہ بتاتے ہیں وہ ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی کہ قصہ میں دو سیاہ گائیں بتائی گئی ہیں۔ حقیقت میں یہ اس کی نشانی نہیں، اور اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ اب انسان کو چاہیے کہ وہ آدمی کے نیک یا بد ہونے کا خیال نہ کرے۔ اور صرف اس کی ذات کو دیکھے کہ اس میں کیا کیا خوبی ہے، اور کون کون سی اہلیت۔ اس کا دیکھنا اور سمجھنا در حقیقت یہی ہے۔

ان لوگوں پر مجھے تعجب ہوتا ہے جو کہتے ہیں اولیاء اور عشاق اس بے مثال ہستی یعنی خداوند تعالیٰ سے کیسے عشق بازی کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ نہ اس کی کوئی جگہ ہے، نہ اس کی شکل و صورت ہے، نہ اس کا مکان ہے، نہ اس جیسا کوئی ہے، جس پر اسے قیاس کیا جا سکے۔ پھر اولیاء اور عشاق کس طرح اس سے قوت حاصل کرتے اور متاثر ہوتے ہیں؟ اور رات دن اسی کی دُھن میں رہتے ہیں۔ جو شخص کسی کو اپنا دوست بناتا ہے، اس سے مدد لیتا ہے۔ آخر وہ شخص یہ مدد اپنے دوست کے لطف، احسان، علم، ذکر، فکر سے اور شادی و

غم ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اور یہ ساری چیزیں عالمِ لامکان میں موجود ہیں۔ وہ شخص ہر گھڑی ان ذرائع سے مدد لیتا اور متاثر ہوتا ہے۔ اسے اس صورتِ حال پر ذرا بھی تعجب نہیں ہوتا۔ اسے تعجب ہوتا ہے تو اس بات پر کہ اولیاء اور عشاق عالمِ لامکان سے کیسے خوش ہو جاتے ہیں اور وہ اس سے کس طرح مدد لیتے ہیں۔

ایک حکیم خدا کا منکر تھا۔ ایک دن وہ بیمار ہو گیا اور اس کی تکلیف طوالت اختیار کر گئی۔ ایک خدائی طبیب اس کے پاس گیا، اور پوچھا آخر تو کیا چاہتا ہے؟ بولا، صحت۔ پوچھا، بتا اس صحت کی کیا شکل و صورت ہوتی ہے؟ تاکہ وہ تیرے لیے حاصل کروں۔ جواب دیا کہ اس کی شکل و صورت نہیں ہوتی۔ اس کی کوئی مثال نہیں۔ مجھ سے تو کیا پوچھتا ہے۔ خدائی حکیم نے کہا۔ آخر بتا تو سہی صحت کیا ہے؟ بولا میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب صحت آتی ہے تو میں طاقتور ہو جاتا ہوں۔ خوب موٹا تازہ ہو جاتا ہوں۔ میرا رنگ سرخ و سفید ہو جاتا ہے۔ میں تازہ اور شگفتہ ہو جاتا ہوں۔ خدائی حکیم نے کہا میں تجھ سے نفسِ صحت کے متعلق پوچھتا ہوں کہ صحت کی ذات کیا چیز ہے؟ جواب دیا، میں نہیں جانتا۔ اس کی کوئی مثال نہیں۔ اس نے کہا، اگر تو مسلمان ہو جائے اور اپنا پہلا مذہب چھوڑ دے، تو میں تیرا علاج کروں گا اور تجھے صحت یاب کر دوں گا۔

حضور سرورِ کائنات ﷺ سے لوگوں نے سوال کیا کہ ہر چند کہ یہ معانی بے مثال ہیں، کیا آدمی اس شکل کے ذریعے ان معانی سے منفعت حاصل کر سکتا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا، یہ جو آسمان اور زمین اس شکل کے توسط سے منفعت حاصل کرتے ہیں، تو یہ اس معنیٔ کل سے ہے۔ جب تو آسمان کی گردش دیکھتا ہے۔ ابر کا وقت پر برسنا ملاحظہ کرتا ہے۔ گرمی کے بعد سردی کا آنا اور موسموں کی تبدیلیاں تیرے سامنے ہوتی ہیں۔ تو تو دیکھتا ہے کہ یہ سب کچھ بھلائی ہی کے لیے ہے اور حکمت پر مبنی ہے۔ آخر یہ

بے جان اور کیا جانتا ہے کہ وقت پر برسنا چاہیے۔ پھر اس زمین کو تو دیکھتا ہے کہ وہ نباتات کو کیسے اگاتی اور ایک ایک کے دس دس بناتی ہے۔ آخر یہ کون سب کچھ کرتا ہے؟ اسے دیکھ اور اس دُنیا کے توسط سے مدد لے۔ جس طرح آدمی کے معنی سے تو اس کے جسم کے ذریعہ مدد لیتا ہے۔ اسی طرح دُنیا کے ذریعہ سے معنیٔ عالم سے مدد لے۔

حضور سرور کائنات ﷺ سرمست اور بے خود ہو جاتے، تو جو بات کہتے وہ اگرچہ حضور ﷺ کی زبان سے جاری ہوتی مگر حضور ﷺ درمیان میں نہ ہوتے۔ درحقیقت بات کہنے والا خدا ہوتا۔ چونکہ انہیں اپنی پہلی حالت معلوم ہوتی کہ اس قسم کی بات سے وہ بے خبر اور لاعلم تھے۔ اس لیے اب جو بات انہیں یاد آجاتی تو وہ سمجھ جاتے ہیں کہ ان کی یہ حالت وہ نہیں جو پہلے تھی۔ اور یہ کہ یہ خدا تعالیٰ کا تصرف ہے۔ چنانچہ حضور سرورِ کائنات ﷺ نے اپنی پیدائش سے کئی ہزار سال پہلے گزرے ہوئے لوگوں اور نبیوں کے حالات سے لے کر دُنیا کی آخری صدی تک کے تمام حالات ارشاد فرمائے کہ کیا کچھ ہو چکا اور کیا کچھ آئندہ ہونے والا ہے۔ حضور ﷺ کا مقدس وجود عرش و کرسی اور خلاو ملا سے پہلے موجود تھا۔ ان چیزوں کا اتنے طویل عرصہ سے وجود ہونا، حضور ﷺ کو حادث نہیں کہہ سکتا۔ بھلا حادث کبھی قدیم کے متعلق خبر دے سکتا ہے؟ پس معلوم ہوا کہ بات حضور ﷺ نہیں کرتے بلکہ خدا کرتا ہے کہ:

وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الاّ وحی یوحیٰ۔ (سورۂ نجم: ع ۱)	یہ پیغمبر اپنی خواہش سے نہیں بولتے بلکہ ہماری وحی ہی کے مطابق بولتے ہیں۔

خدا آواز اور حرف سے منزہ ہے۔ اس کا سخن، حرف اور صوت کی قید سے یکسر آزاد ہے۔ لیکن وہ جس حرف، آواز یا زبان سے چاہتا ہے اپنا سخن جاری کر دیتا ہے۔ راستوں میں اور کارواں سراؤں میں حوض کے پاس کسی مرد یا کسی پرندے کا سنگین مجسمہ بنا ہوتا

ہے۔ اس کے منہ سے پانی بہتا ہے۔ اور حوض میں گرتا ہے۔ سب دانا لوگ جانتے ہیں کہ وہ پانی پتھر کے بنے ہوئے مرغ کے منہ سے نہیں بہتا۔ وہ کسی دوسری جگہ سے آتا ہے۔ اگر تو کسی آدمی کو پہچاننا چاہے تو اس سے بات کرنی شروع کر دے۔ اس کی بات سے تو اسے سمجھ جائے گا۔ اور اگر وہ طرار ہے اور اسے کسی نے بتا رکھا ہے کہ آدمی کو اس کی گفتگو سے پہچانا جاتا ہے۔ اور وہ اپنی گفتگو میں بہت محتاط ہے تاکہ تو اسے حاصل نہ کر سکے۔

تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ یہ حکایت کہ صحرا میں ایک بچے نے اپنی ماں سے کہا۔ رات کے اندھیرے میں دیو جیسی ایک شکل نظر آتی ہے۔ مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ماں نے کہا، ڈر نہیں۔ جب تو اسے دیکھے تو بڑا دلیر ہو کر اس پر حملہ کر دے۔ معلوم ہو جائے گا، وہ درحقیقت ہے یا صرف خیال ہی ہے۔ بچے نے کہا، ماں! اگر کالے ہوّے کی ماں نے بھی اسے یہی وصیت کر رکھی ہو کہ فوراً حملہ کر دینا۔ تو میں کیا کروں گا؟

اب اسے وصیت کی گئی ہو کہ بولنا نہیں، تاکہ تمہاری اصلیت ظاہر نہ ہو جائے۔ پھر میں اسے کس طرح پہچانوں۔ کہا اس کے سامنے خاموش رہ۔ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے اور صبر کر۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی زبان سے کوئی کلمہ نکل جائے۔ اگر اس کی زبان سے کلمہ نہ نکلے تو تیری ہی زبان سے کوئی بات نکل جائے، جو تو کبھی نہ چاہتا ہو۔ اس بات سے تیری طبیعت میں سختی اور فکر پیدا ہو جائے۔ اور فکرِ حال سے تو اسے جان لے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ کیونکہ تو اسی سے متاثر ہوا۔ اور اسی کا عکس اور اسی کا احوال تھا جس نے تجھ پر عکس ڈالا۔ تو تیرے دل میں خیال پیدا ہوا اور تیرے منہ سے بات نکل گئی۔

شیخ سرزی علیہ الرحمۃ اپنے مریدوں میں تشریف فرما تھے۔ ایک مرید کو بھنی ہوئی سری کھانے کی خواہش ہوئی۔ شیخ نے اشارہ کیا کہ فلاں مرید کے لیے بھنی ہوئی

سری لے آؤ۔ مریدوں نے پوچھا کہ آپ نے کیسے جانا کہ اسے اس کی خواہش ہے؟ جواب دیا تیس سال سے مجھ میں کوئی احتیاج نہیں رہی۔ میں نے اپنے آپ کو ہر احتیاج سے پاک کر لیا ہے۔ میں بے نقش آئینہ کی طرح صاف اور روشن ہوں۔ اب جو بھنی ہوئی سری کھانے کو میرا دل چاہا اور مجھے بھوک لگی تو میں نے سمجھ لیا کہ یہ فلاں مرید کا تقاضا ہے۔ کیونکہ آئینہ بے نقش ہے۔ اگر اس آئینے میں کوئی نقش ظاہر ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ کسی اور ہی کا ہے۔

ایک عزیز نے اپنے کسی مقصد کی طلب میں چلہ کشی کی۔ اسے ندا آئی کہ ایسا بلند مقصد چلہ سے حاصل نہ ہو گا۔ چلہ سے باہر آ۔ تاکہ ایک بزرگ کی نظر تجھ پر پڑے اور تیرا وہ مقصد تجھے حاصل ہو جائے۔ پوچھا مجھے وہ بزرگ کہاں ملے گا؟ جواب ملا جامع مسجد میں۔ بولا میں اتنی خلقت میں اسے کیسے پہچانوں گا کہ وہ کون ہے؟ ندا آئی۔ تو جا وہ خود پہچان لے گا اور تجھ پر نگاہ کرے گا۔ اس بات کی نشانی کہ اس نے تجھ پر نظر کی، یہ ہے کہ تیرے ہاتھ سے پانی کی چھاگل گر جائے گی اور تو بے ہوش ہو جائے گا۔ تو سمجھ جائے گا کہ اس نے تجھ پر نگاہ کی ہے۔ اس نے ایسا ہی کیا کہ پانی سے بھری ہوئی چھاگل ہاتھ میں لے لی۔ اور مسجد کے اندر جماعت کو پانی پلانے لگا اور صفوں میں گھومنے لگا۔ ناگاہ اس کی حالت متغیر ہوئی۔ اس نے نعرہ مارا۔ چھاگل اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ ایک گوشہ میں پڑا رہا۔ لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو تنہا پایا۔ جس شاہ نے اس پر نگاہ کی تھی، وہ وہاں پر موجود نہ تھا مگر اس کا مقصد اسے حاصل ہو گیا۔

بعض ایسے مردانِ خدا ہیں کہ وہ انتہائی عظمت اور غیرتِ حق کی وجہ سے کسی کو اپنا منہ نہیں دکھاتے لیکن طالبوں کو ان کے بڑے بڑے مقاصد تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور

ان سے محبت کرتے ہیں۔ ایسے شاہ بہت نادر ہیں اور انتہائی نازک مزاج ہیں۔

میں نے پوچھا کیا ایسے بورگ آپ کے سامنے آتے ہیں؟ کہا میرا "سامنا" ہی نہیں۔ مدت سے میرا "سامنا" باقی نہیں رہا۔ اگر وہ آتے ہیں تو اس تصور کے سامنے آتے ہیں جس کے وہ معتقد ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لوگوں نے کہا، ہم آپ کے گھر آئیں؟ بولے، دُنیا میں میرا گھر کہاں ہے؟ گھر کیا ہوتا ہے؟

حکایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صحرا میں گھوم رہے تھے کہ بڑی موسلا دھار بارش نے آلیا۔ آپ نے غار کے گوشہ میں جہاں ایک سیاہ خرگوش کا بھٹ تھا، پناہ لی۔ بارش تھمی تو حضرت پر وحی نازل ہوئی کہ سیاہ خرگوش کے بھٹ سے باہر نکل آ، کیونکہ تیرے ڈر کی وجہ سے اس کے بچے اندر نہیں جاتے۔ حضرت عیسیٰؑ نے پکار کر کہا، اے خدایا!

لابن اوی ماویٰ ولیس لابن مریم ماویٰ۔ — سیاہ خرگوش کے بچوں کے لیے تو جائے پناہ ہے، مگر مریم کے بیٹے کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں۔

خدا تعالیٰ نے جواب میں فرمایا، سیاہ خرگوش کے بیٹے کے لیے پناہ ہے، جگہ ہے۔ اور مریم کے بیٹے کے لیے نہ پناہ ہے، نہ جگہ۔ نہ گھر ہے، نہ مقام۔

مولانا قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا کہ اگرچہ سیاہ خرگوش کے بچے کے لیے گھر ہے۔ لیکن ایسا معشوق اسے گھر سے نہیں نکالتا۔ تجھے معشوق ہی نے تو گھر سے اس طرح نکالا ہے۔ اگر تیرا گھر نہیں ہے تو کیا پروا؟ کہ اس طرح نکالے جانے کا مزا اور یہ عزت تیرے ہی لیے مخصوص ہوئی۔ زہے قسمت کہ اس نے خود تجھے نکالا۔ سو ہزار زمین اور آسمان، دُنیا، آخرت، عرش، کرسی اس کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ مرتبہ

ان سب سے بڑھ کر ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ امیر جب ہمارے پاس آیا اور ہم اس سے جلدی نہ ملے۔ تو اس سے اسے پریشان خاطر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ اس کی آمد کا مقصد یا میری عزت افزائی تھی۔ یا اس میں وہ اپنا اعزاز سمجھتا تھا۔ اگر وہ اس لیے آیا کہ میری عزت افزائی ہو تو جتنی دیر وہ زیادہ بیٹھا اور میرا انتظار کرتا رہا۔ اتنی ہی میری عزت افزائی ہوئی۔ اور اگر اس کا مقصد یہ تھا کہ یہاں آنے سے اس کا اعزاز بڑھے اور اسے ثواب حاصل ہو تو اس نے جتنا زیادہ انتظار کیا اور انتظار کی زحمت اٹھائی، اتنا ہی اسے ثواب زیادہ ہوا۔ دونوں صورتوں میں سے خواہ کوئی صورت ہو، اس کا مقصود اسے دُگنا ہو کر ملا۔

پس چاہیے کہ اس کا دل خوش اور شادمان ہو۔

دلیل اور مشاہدہ

یہ جو کہتے ہیں ان القلوب علی القلوب شواھد بے شک دل، دلوں کے گواہ ہوتے ہیں، کہاوت اور ایک بات ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں۔ اور حکایت ہے جس کی حقیقت ان پر منکشف نہیں ہوئی۔ ورنہ سخن کی کیا حاجت تھی۔ جب دل گواہی دے تو زبان کی گواہی کی کیا ضرورت؟

امیر نائب نے کہا کہ بے شک دل گواہی دیتا ہے۔ لیکن دل کو مزا جدا آتا ہے، کان کو جدا، آنکھ کو جدا اور زبان کو جدا لطف آتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو ایک احتیاج ہے، تاکہ فائدہ زیادہ سے زیادہ ہو۔

مولانا قدس اللہ سرہٗ العزیز نے فرمایا کہ اگر دل کو استغراق ہو تو بہت اس میں

محو ہو جاتے ہیں۔ زبان کے محتاج نہیں رہتے۔ آخر لیلیٰ کا حسن رحمانی نہ تھا۔ وہ جسمانی اور نفسی تھا اور وہ آب و گل سے تھا۔ اس کے عشق کو اتنا استغراق تھا کہ مجنوں کو اس نے کچھ اس طرح پکڑا اور غرق کیا کہ اسے لیلیٰ کو ظاہر آنکھ سے دیکھنے کی احتیاج نہ تھی۔ اور نہ اس کے کان کو لیلیٰ کی بات سننے کی حاجت تھی۔ کیونکہ وہ لیلیٰ کو اپنے آپ سے جدا نہیں دیکھتا تھا۔

ترجمہ شعر: تیری روشنی میری آنکھ میں ہے۔ تیرا نام میرے منہ میں۔ تیرا ذکر میرے دل میں، پس تو مجھ سے دور کیسے ہوا؟

اب جبکہ معشوق جسمانی میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ اس کا عشق عاشق کو اس حالت تک پہنچا دے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے جدا نہ دیکھے۔ اس کی ہر حس مکمل طور پر معشوق میں غرق ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ آنکھ، کان، ناک، غرضیکہ کسی عضو سے کسی دوسرے حظ کا طلبگار نہیں ہوتا۔ وہ سب کو اکٹھے دیکھتا ہے۔ اور حاضر سمجھتا ہے۔ ان اعضاء میں سے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، ایک عضو بھی مکمل حظ اٹھاتا ہے، تو وہ سب کے سب اس ذوق میں غرق ہو جاتے ہیں۔ اور وہ کسی دوسرے حظ کے طلب گار نہیں ہوتے۔ وہ دوسری حس کی طلب کو اس امر کی دلیل سمجھتا ہے کہ اس ایک عضو نے کماحقہٗ پورا حظ نہیں اٹھایا۔ اس نے حظ اٹھایا مگر ناقص۔ وہ اس حظ میں غرق نہیں ہوا۔ اس لیے دوسری حس حظ کی طلب گار ہے۔ وہ دشمن کی طلبگار ہے۔ ہر حس ایک مختلف حظ اٹھاتی ہے۔ معنی کے اعتبار سے حواس جمع ہیں۔ صورت کے لحاظ سے وہ متفرق ہیں۔ جب ایک عضو کو استغراق حاصل ہوتا ہے تو سارے اعضاء اس میں غرق ہو جاتے ہیں، جیسے مکھی اوپر اڑتی ہے۔ وہ پر کو ہلاتی ہے، سر کو ہلاتی ہے۔ اور اس کے سب اجزاء کو حرکت ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ شہد میں غرق ہوتی ہے، تو سب اجزاء یکساں ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی جزو

حرکت نہیں کرتا۔ استغراق وہ ہوتا ہے کہ غرق ہونے والا خود موجود نہیں رہتا۔ اور نہ وہ جدوجہد کرتا ہے۔ نہ اس سے کوئی فعل صادر ہوتا ہے۔ نہ وہ حرکت کرتا ہے۔ وہ اس پانی میں غرق ہوتا ہے۔ اس حالت میں جو فعل اس سے سرزد ہوتا ہے، وہ اس کا فعل نہیں ہوتا۔ وہ پانی کا فعل ہوتا ہے۔ اگر وہ پانی میں ابھی ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ تو اسے غرق ہونا نہیں کہتے۔ یا اگر وہ چلاتا ہے کہ ہائے میں غرق ہو گیا، تو اسے بھی استغراق نہیں کہتے۔

آخر منصور کا یہ انا الحق (میں خدا ہوں) کہنا بھی یہی معنی رکھتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ انا الحق کہنا بہت بڑا دعویٰ ہے۔ بڑا دعویٰ تو انا العبد (میں بندہ ہوں) کہنا ہے۔ انا الحق بہت بڑی عاجزی ہے۔ کیونکہ جو شخص یہ کہتا ہے، میں خدا کا بندہ ہوں۔ وہ دو ہستیوں کو ثابت کرتا ہے۔ ایک اپنے آپ کو اور دوسرے خدا کو۔ لیکن جو انا الحق کہتا ہے، وہ اپنے آپ کو معدوم کرتا ہے۔ فنا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، انا الحق یعنی میں نہیں ہوں، سب وہی ہے۔ خدا کے سوا کوئی ہستی نہیں۔ میں کلی طور پر عدم محض ہوں۔ اور کچھ بھی نہیں۔ اس میں بے حد عاجزی ہے۔ مگر یہ بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔

وہ شخص کہ جو خدا کی بندگی کرتا ہے، آخر اس کی بندگی درمیان میں موجود ہے۔ خواہ وہ خدا کے لیے ہی ہے۔ وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے اور خدا کو دیکھتا ہے۔ وہ پانی میں غرق نہیں ہوتا۔ غرق شدہ وہ آدمی ہوتا ہے کہ جس سے کوئی فعل یا حرکت سرزد نہیں ہوتی۔ لیکن اس کی حرکتیں پانی کی حرکتیں ہوتی ہیں۔ ایک شیر نے ایک ہرن کا پیچھا کیا، ہرن بھاگ کھڑا ہوا۔ اس وقت دو ہستیاں تھیں۔ ایک شیر اور دوسرے ہرن۔ لیکن جب شیر نے اسے جالیا۔ اور وہ شیر کے پنجۂ قہر میں آ گیا اور شیر کی ہیبت نے اسے بے ہوش کر دیا۔ اور وہ شیر کے سامنے بے خود گر گیا تو اس گھڑی اکیلے شیر ہی کی ہستی باقی رہی۔ ہرن محو ہو گیا، اور باقی نہ رہا۔

استغراق یہ ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ شیر چیتے اور ظالم کا خوف جو عام لوگوں پر طاری ہوتا ہے، اس پر طاری نہیں کرتا بلکہ اسے خود خداوند تعالیٰ خائف کرتا ہے۔ اور اس پر یہ حقیقت کھول دیتا ہے کہ یہ خوف خاص اس کی اپنی طرف سے ہے۔ اور خدا خود ہی اسے امن، عیش، طرب اور خواب و خورش کی صورت دکھاتا ہے۔ وہ بیداری کے عالم میں اپنی کھلی آنکھوں سے شیر، چیتے یا آگ کو دیکھتا ہے اور انہیں محسوس کرتا ہے۔ اسے اس حالت میں معلوم ہو جاتا ہے کہ شیر، چیتے یا آگ کی وہ صورت درحقیقت اس دُنیا سے تعلق نہیں رکھتی۔ بلکہ یہ غیب کی صورت ہے۔ جس کی یوں تصویر کھنچ گئی ہے۔ اور خداوند تعالیٰ اس طریق پر انتہائی حسن و جمال کے پرتو سے اپنی صورت دکھاتا ہے کہ مستغرق کو نہایت پر فضا باغات نظر آتے ہیں۔ ان باغوں میں انوار، نہریں، حوریں، محلات، قسم قسم کے کھانے، مشروبات، خلعتیں، کئی براق، مختلف شہر، منزلیں اور گوناگوں عجائبات ہوتے ہیں۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ چیزیں اس دُنیا سے نہیں۔ یہ سب چیزیں اسے خداوند تعالیٰ اپنی نظر سے دکھاتا اور مناظر کشی کرتا ہے۔ پس یقین ہو جاتا ہے کہ خوف اسے خدا کی طرف سے ہے۔ اسی طرح اس کی ہر امید، راحت اور مشاہدہ کا تعلق خدا ہی سے ہوتا ہے۔ اب اس کا یہ خوف دُنیا کا خوف نہیں رہتا۔ کیونکہ یہ مشاہدہ ہے، دلیل کی بناء پر نہیں۔ یہ خدا کا معین کردہ ہے۔ کیونکہ ہر چیز کا ظہور خداوند تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔

فلسفی بھی اسے جانتا ہے۔ لیکن اس کی دلیل پائدار نہیں ہوتی۔ اور وہ خوشی جو صرف دلیل سے حاصل ہو، اس کی عمر لمبی نہیں ہوتی۔ جب تک تو اس سے دلیل بیان کرتا رہتا ہے، وہ خوبصورت، گرم اور تازہ ہوتی ہے۔ جونہی کہ دلیل کا ذکر ختم ہوا اس کی گرمی اور خوشی جاتی رہی۔ جیسے دلیل سے آدمی جانتا ہے کہ اس گھر کو بنانے والا کوئی معمار

ہے۔ اور دلیل ہی سے وہ جانتا ہے کہ وہ معمار آنکھوں والا ہے، اندھا نہیں۔ اسے قدرت حاصل ہے، وہ عاجز نہیں۔ وہ موجود تھا، معدوم نہیں تھا۔ زندہ تھا، مرا ہوا نہیں تھا۔ آدمی یہ سب کچھ جانتا ہے۔ مگر صرف دلیل سے جانتا ہے۔ اور دلیل پائدار نہیں ہوتی۔ جلدی فراموش ہو جاتی ہے۔ لیکن جب عارفوں نے خدمتیں کیں، تو معمار کو پہچان لیا۔ اور اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لیا۔ اور نان و نمک انہوں نے باہم کھایا اور اختلاط کیا۔ ان کے تصور اور ان کی نظر سے گھر کی بنیاد کبھی او جھل نہیں ہوتی۔ پس اس قسم کا آدمی خداوند میں فنا ہوتا ہے اور اس کے حق میں نہ گناہ گناہ ہوتا ہے اور نہ جرم جرم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ پانی کا مغلوب اور متہلک ہے۔

ایک بادشاہ نے اپنے غلاموں سے فرمایا کہ ایک مہمان آنے والا ہے۔ تم سونے کا ایک ایک پیالہ پکڑ کر کھڑے رہو۔ ایک غلام اس بادشاہ کا خاص مقرب تھا، اسے بھی حکم دیا کہ ایک پیالہ پکڑے۔ جب بادشاہ نے صورت دکھائی تو وہ خاص غلام بادشاہ کے دیدار سے بے خود اور مست ہو گیا۔ پیالہ اس کے ہاتھ سے گرا اور ٹوٹ گیا۔ دوسرے ملازموں نے یہ دیکھا تو سمجھا شاید ایسا ہی کرنا چاہیے۔ انہوں نے اپنے اپنے پیالے زمین پر دے مارے اور توڑ ڈالے۔ بادشاہ سخت برہم ہوا کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی؟ وہ بولے جہاں پناہ کے مقرب خاص نے ایسا کیا تھا۔ بادشاہ بولا بے وقوفو! وہ اس نے نہیں کیا تھا، وہ میں نے کیا تھا۔ ظاہراً طور پر وہ سب گناہ تھا۔ مگر وہ ایک گناہ عین بندگی تھی۔ بلکہ تمام بندگیوں سے بڑھ کر تھی۔ اس سب کا مقصود اس کا وہ غلام تھا۔ باقی غلام محض پیروکار تھے۔ کیونکہ جو معنی میں نے بیان کیے ہیں، ان کے مطابق در حقیقت وہ غلام بادشاہ تھا۔ اور سب غلام بادشاہ نہیں۔ پس وہ اس کے پیرو ہوتے ہیں۔ جب وہ عین بادشاہ ہے تو غلام اس صورت کے علاوہ نہیں ہے کہ وہ بادشاہ کے جمال سے پُر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لولاک لما خلقت الا فلاک. اے پیغمبر! اگر میں تجھے پیدا نہ کرتا تو آسمانوں کو بھی پیدا نہ کرتا۔

یہ بھی انا الحق ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے آسمانوں کو اپنے لیے پیدا کیا۔ یہ انا الحق ہے، دوسری زبان سے اور دوسری رمز سے!

بزرگوں کی باتیں زبان اگر سو طریق پر ادا کرے تو بھی ایک ہی ہوتی ہے۔ جبکہ حق ایک ہے۔ راستہ ایک ہے، تو باتیں دو کیسے ہو سکتی ہیں؟ لیکن اس کی صورت مخالف ہوتی ہے۔ معنی ایک ہی ہیں۔ تفرقہ صرف صورت میں ہے۔ معنی میں سب جمعیت ہی ہے۔ جیساکہ فرمایا جب خیمہ بناتے ہیں تو کوئی رسی بٹتا ہے، کوئی کیل گھڑتا ہے، کوئی کپڑا بنتا ہے۔ کوئی سیتا ہے۔ کوئی اور طرح ہاتھ بٹاتا ہے۔ ظاہراطور پر یہ صورتیں اگرچہ مختلف ہیں اور متفرق معلوم ہوتی ہیں، لیکن معنی کے اعتبار سے یہ سب ایک ہیں، اور سب کے سب ایک ہی کام کرتے ہیں۔ یہی حال اس دُنیا کا ہے تو غور سے دیکھیے تو سب خدا ہی کی بندگی کرتے ہیں۔ کیا فاسق اور کیا صالح۔ کیا عاصی اور کیا مطیع۔ کیا دیو اور کیا فرشتہ، سب اسی کی بندگی میں مشغول ہیں۔ مثلاً بادشاہ چاہتا ہے کہ اپنے غلاموں کا امتحان لے۔ اور انہیں آزمائے تاکہ ثابت قدم اور بے ثبات میں تمیز ہو جائے۔ نیک عہد اور بد عہد میں تفریق ہو جائے۔ باوفا اور بے وفا علیحدہ علیحدہ ہو جائیں۔ اس مقصد کے لیے وسوسے اور ہیجان چاہئیں تاکہ ثابت قدمی پیدا ہو۔ اگر یہ نہ ہو تو اس میں ثابت قدمی کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ پس وہ وسوسے ہیجان اور بادشاہ کی بندگی کرتا ہے۔ جب بادشاہ کا منشاء یہ ہے کہ وہ یوں کرے۔ وہ ہوا کو بھیج دیتا ہے تاکہ وہ غیر ثابت قدموں میں سے ثابت قدم پیدا کرے۔ مچھر کو درخت اور باغ سے جدا کر دیتا ہے تاکہ مچھر چلا جائے اور جو مچھر نہیں وہ رہ جائے۔

ایک بادشاہ نے ایک لونڈی سے فرمایا، اپنے آپ کو خوب بنا سنوار، اور غلاموں

کے پاس جاتا کہ ان کی امانت اور خیانت ظاہر ہو جائے۔ لونڈی کا یہ فعل اگرچہ بظاہر گناہ معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت وہ بادشاہ کی بندگی کرتی ہے۔ ان بندوں نے اس دُنیا میں اپنے آپ کو دلیل یا تقلید سے نہیں دیکھا بلکہ بے پردہ اور بے حجاب معائنہ سے دیکھا ہے۔ یہاں کیا نیک اور کیا بد سب خدا تعالیٰ کی بندگی اور طاعت کرتے ہیں :

وان من شئ الا یسبح بحمده. (سورۂ بنی اسرائیل، ع ۵) کوئی شے ایسی نہیں جو حمدِ خداوندی کی تسبیح میں نہ لگی ہو۔

پس ان کے حق میں اسی دُنیا میں قیامت ہے۔ چونکہ قیامت عبارت ہے اس حقیقت سے کہ سب کے سب خدا تعالیٰ کی بندگی کریں گے۔ اور کوئی بھی سوائے خدا کی بندگی کے کوئی دوسرا کام نہیں کرے گا۔ یہ لوگ یہ حقیقت اسی دُنیا میں دیکھ لیتے ہیں کہ لو کشف الغطاء ماازددت یقیناً۔

لغت کے اعتبار سے عالم وہ ہے جو عارف سے عالی تر ہو۔ کیونکہ خدا کو عالم کہتے ہیں۔ لیکن ہم اسے عارف نہیں کہہ سکتے۔ عارف وہ ہے جو نہیں جانتا اور جانتا ہے۔ اور یہ بات خدا کے متعلق نہیں کہی جاسکتی۔ لیکن عرف عام میں عارف بڑا ہے۔ عارف عبارت ہے اس سے جو جانتا ہے بغیر دلیل کے۔ اور دیکھتا ہے معائنہ اور مشاہدہ سے۔ عرفِ عام میں اسے عارف کہتے ہیں۔

کہتے ہیں ایک عالم سو زاہد سے بہتر ہے۔ عالم کس طرح سو زاہد سے بہتر ہے؟ آخر ایک زاہد علم ہی کی بناء پر زُہد کرتا ہے۔ علم کے بغیر زُہد محال ہے۔ زُہد کیا ہے؟ یہی دُنیا سے روگردانی کرنا اور اس میں طاعت اور آخرت کو شامل کرنا۔ دُنیا کو سمجھنا چاہیے۔ دُنیا کی زشت روئی اور بے ثباتی کو جاننا چاہیے۔ اور آخرت کے لطف ثبات اور بقا سے پوری طرح واقف ہونا چاہیے۔ اور سوچنا چاہیے کہ بندگی اور طاعت کس طرح کروں؟ اور کیا بندگی

کردوں؟ یہ سب علم ہے۔ پس علم کے بغیر زہد محال ہے۔ زاہد عالم بھی ہے اور زاہد بھی۔ یہ عالم سو زاہد سے بہتر ہے۔ یہ کس طرح ہے؟ اس کے معنی لوگوں نے نہیں سمجھے۔ یہ علم کچھ اور ہے جو خدا تعالیٰ اس علم و زہد کے بعد عطا کرتا ہے، جو پہلے حاصل تھے۔ یہ دوسرا علم پھل ہے، اس علم و زُہد کا۔ ایسا علام واقعی سو زاہد سے بہتر ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی نے ایک درخت بویا اور وہ درخت پھل لایا۔ یہ درخت ان سو درختوں سے قطعاً بہتر ہے جنہیں پھل نہیں لگا۔ کیونکہ کچھ پتہ نہیں، وہ درخت کبھی پھل دے سکیں گے یا نہیں۔ راستہ میں بے شمار آفتیں ہیں۔ وہ حاجی جو کعبہ میں پہنچ گیا، ان سو حاجیوں سے بہتر ہے جو ابھی راستہ ہی میں دشت پیما ہیں۔ انہیں خوف ہے کہ شاید کعبہ تک پہنچ سکیں یا نہ پہنچ سکیں۔ لیکن یہ ایک حاجی حقیقت کو پہنچ گیا ہے۔ ایک حقیقت لاکھ شک سے بہتر ہے۔

امیر نائب نے کہا جو ابھی کعبہ تک نہیں پہنچا، وہ بھی پہنچنے کی اُمید تو رکھتا ہے۔ مولانا نے فرمایا جو امید رکھتا ہے اور جو پہنچ چکا ہے۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ وہی فرق جو امن اور خوف میں ہے۔ یہ فرق اتنا بڑا ہے کہ سب پر ظاہر ہے۔ خوف اور امن کا مقابلہ ہی کیا۔ خود امن امن میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ پچھلے انبیاء پر حضور سرورِ کائنات ﷺ کو ازروئے امن ہی فضیلت حاصل ہے۔ ورنہ تمام انبیاء امن پر ہیں۔ اور خوف سے گزر چکے ہیں، سوائے اس کے کہ اس میں مقامات ہیں کہ :

ورفعنا بعضهم فوق بعض درجات. ہم نے بعض کے درجے بعض سے بلند کیے ہیں۔
(سورۂ زخرف: ع ۳)

ورنہ عالمِ خوف میں ایسے مقامات ہیں، جن کا صاف نشان دیا جا سکتا ہے۔ لیکن امن کے مقامات بے نشان ہیں۔ عالمِ خوف پر نظر کیجئے۔ یہاں ہر کوئی خدا کے راستہ میں کشش کرتا ہوا ملے گا۔ کوئی جسم کی کشش کر رہا ہے۔ کوئی مال کی، کوئی جان کی۔ کوئی روزہ

سے ہے، کوئی زکوٰۃ دے رہا ہے۔ کوئی نماز پڑھ رہا ہے۔ ایک دس رکعت، دوسرا سو رکعت۔ پس ان کی منزلیں ظاہر اور مقرر ہیں۔ ان منزلوں کی نشاندہی کرنا ایسے ہی ہے، جیسے قونیہ سے قیصریہ کے درمیان منزلیں معین ہیں۔ قیماد اور برغ، سلطان وغیرہ لیکن دریا کی منزلیں انطاکیہ سے مصر تک بے نشان ہیں۔ انہیں صرف کشتی ران ہی جانتا ہے۔ وہ خشکی والوں کو نہیں بتاتا۔ کیونکہ وہ اسے نہیں سمجھ سکتے۔

امیر نائب نے کہا کہ گفتار بھی فائدہ دیتی ہے۔ اگر وہ سب کچھ نہیں جانتے تو تھوڑا بہت ضرور جانیں۔

فرمایا جو شخص کہ اندھیری رات میں جاگ رہا ہے، یہ عزم رکھتا ہے کہ میں دن کے پاس پہنچ جاؤں۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ کس طرح دن کے پاس پہنچے۔ لیکن چونکہ وہ دن کا منتظر ہے، وہ دن کے نزدیک پہنچتا جاتا ہے۔ یا جو شخص اندھیری رات میں جبکہ بادل چھائے ہوئے ہوں، قافلہ کے پیچھے چلا جاتا ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں تک پہنچا اور کہاں سے گزر رہا ہے، اور کتنی مسافت طے کر چکا ہے۔ لیکن جب دن چڑھتا ہے تو اسے اپنے سفر کا حاصل معلوم ہو جاتا ہے۔ وہ اچانک کسی جگہ پہنچ جاتا ہے، خدا کے لیے جو شخص دو آنکھیں جھپکتا ہے، یہ بھی ضائع نہیں جاتا۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ۔ (سورۂ زلزال) جس نے رائی کے دانہ کے برابر بھی نیکی کی ہے، وہ اسے دیکھ لے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بہت ہنستے اور یحییٰ علیہ السلام بہت روتے تھے۔ حضرت یحییٰ نے حضرت عیسیٰ سے کہا، خدا کی دقیق تدبیروں سے تو خوب محفوظ و مصؤن ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تو یوں ہنستا ہے۔ حضرت عیسیٰ بولے، تو خداوند تعالیٰ کے عجیب اور نادر لطف و عنایت کو بھول گیا ہے۔ یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ تو روتا ہے۔ اس گفتگو

کے وقت خدا کے اولیاء میں سے ایک ولی موجود تھا۔ اس نے خدا سے پوچھا کہ ان دو میں سے کس کا مقام بلند تر ہے؟ جواب آیا کہ :

انا عند من هو احسنهم بی ظنا. میں وہاں ہوں جہاں میرے بندے کا خیال ہے۔

ہر بندے کے نزدیک میری ایک شکل ہے۔ جو کوئی جہاں بھی میرا خیال کرے، میں وہیں ہوتا ہوں۔ میں اس خیال کا بندہ ہوں کہ جہاں حق ہو۔ اور اس حقیقت سے بیزار ہوں، جہاں حق نہ ہو۔ اے میرے بندو! اپنے خیالات کو پاک و مطہر بناؤ، کہ تمہارے خیالات میرے رہنے کی جگہ اور میرے بسنے کا مقام ہیں۔ اب تو خود ہی آزما دیکھ کہ گریہ، خندہ، صوم، نماز، خلوت، جمعیت میں سے سب سے زیادہ نفع دینے والی کون سی چیز ہے۔ اور تیرے احوال کس طریق پر زیادہ درست ہوتے ہیں۔ اور کس طریق پر تو زیادہ سے زیادہ ترقی کر سکتا ہے۔ پس وہ راستہ پکڑ۔

استفت قلبك وان افتاك المفتون. (حدیث) تو اپنے دل سے فتویٰ لے۔ اگرچہ مفتی لوگ فتویٰ دیتے رہیں۔

مفتیٔ معنی تیرے اندر ہے۔ مفتیوں کا فتویٰ اس کے سامنے پیش کرتا کہ جو اس کے موافق ہو تجھے معلوم ہو جائے۔ جس فتوے کو وہ درست کہے، تو اسے قبول کر۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے طبیب بیمار کے پاس آتا ہے تو اندر کے طبیب سے پوچھتا ہے۔ تیرا طبیب معنی بھی تیرے اندر ہے۔ اور وہ تیرا مزاج ہی تو ہے۔ وہ کسی چیز کو دور کرتا ہے اور کسی کو قبول۔ اس لیے بیرونی طبیب اس اندرونی طبیب سے پوچھتا ہے کہ فلاں چیز جو تو نے کھائی، کیسی تھی؟ وہ ہلکی تھی یا ثقیل؟ اس بات کا جواب وہی ہوتا ہے، جو اندر کا طبیب بتائے۔ کیونکہ باہر کا طبیب اسی سے حکم لگاتا ہے۔ پس اصل طبیب اندر ہے۔ اور وہ اس کا

مزاج ہے۔ جب یہ اندر والا طبیب ضعیف ہو جاتا ہے اور مزاج میں فساد واقع ہوتا ہے۔ تو ہر چیز کو عکس سے دیکھتا ہے۔ اور ٹیڑھی نشانیاں بتاتا ہے۔ شکر کو تلخ کہہ دیتا ہے۔ اور سرکہ کو شیریں بتادیتا ہے۔ پس ہم محتاج ہو جاتے ہیں کہ باہر کے طبیب سے مدد لیں۔ تاکہ مزاج پہلے کی طرح برقرار ہو جائے۔ اس کے بعد وہ اپنا آپ پھر طبیب کو دکھاتا ہے اور اس سے فتویٰ لیتا ہے۔ معنی کے اعتبار سے آدمی کا مزاج ایسا ہی ہے۔ جب اس کے حواس باطنہ کمزور ہوجاتے ہیں تو وہ جو کچھ دیکھتا اور کہتا ہے، حقیقت کے خلاف ہوتا ہے۔ پس انبیاء اور اولیاء طبیب ہیں۔ وہ اس مزاج کی مدد کرتے ہیں، تاکہ وہ مستقیم ہو جائے۔ اور اس کا دل اور دین طاقت ور ہو جائے۔

ارنی الاشیاء کما هی. مجھے چیزیں ایسی حالت میں دکھا جیسی کہ وہ در حقیقت ہیں۔

آدمی ایک بہت بڑی چیز ہے۔ اس میں ہر چیز لکھی ہوئی ہے۔ وہ پردے اور تاریکیاں اسے نہیں چھوڑتیں کہ وہ خود علم پڑھے۔ یہ گوناگوں مصروفیتیں ہی پردے اور تاریکیاں ہیں۔ قسم قسم کی تدبیریں، حیلے اور دُنیا کی آرزوئیں اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ وہ ان تاریکیوں اور پردوں میں چھُپا ہوا ہے۔ پھر بھی کچھ پڑھ ہی لیتا ہے۔ اور وہ حقیقت سے کچھ نہ کچھ واقف ہی ہے۔ اندازہ کرو کہ جب یہ تاریکیاں اور پردے راستہ سے اٹھ جائیں تو وہ کیا کچھ جان لیتا ہے، اور خود کتنے علم پیدا کرتا ہے۔ آخر یہ صنعت جیسے خیاطی، معماری، نجاری، زراعت، زرگری، علمِ نجوم، طب اور اسی قسم کی بے شمار دوسری صنعتیں الیٰ الا یعد ولا یحصی آدمی کے اندر ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ پتھر اور مٹی کے ڈھیلوں سے پیدا نہیں ہوئیں۔ وہ جو کہتے ہیں، مردے کو قبر میں دفن کرنا، انسان کو کوے نے سکھایا۔ یہ بھی انسان ہی کا عکس تھا، جو پرندے پر پڑا۔ دراصل یہ انسان ہی کے تقاضے نے کیا۔ حیوان

آخر انسان ہی کا جزو ہے۔ جزو اپنے کل کو کیسے سکھا سکتا ہے؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے آدمی بائیں ہاتھ سے لکھنا چاہے۔ وہ قلم کو بائیں ہاتھ سے پکڑے، تو اگرچہ اس کا دل مضبوط ہے، لکھتے وقت اس کا ہاتھ لرزتا ہے، اور ہاتھ دل کے حکم سے لکھتا ہے۔

امیر نے کہا، مولانا ہمیشہ بہت بلند باتیں ارشاد فرماتے ہیں، مولانا نے فرمایا کہ سخن اہلِ سخن سے جدا نہیں۔ سخن ہمیشہ اہل سخن تک پہنچتا ہے۔ اور سخن اس سے پورا اتصال رکھتا ہے۔ درخت اگر موسمِ سرما میں پتے اور پھل پیدا نہیں کرتے، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کوئی کام نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ کام میں لگے ہوئے ہیں۔

موسم سرما آمدنی کا وقت ہے۔ گرمی کا موسم خرچ کا زمانہ ہے۔ خرچ ہوتا سب دیکھ لیتے ہیں، آمدنی کو کوئی نہیں دیکھتا۔ جیسے کوئی ضیافت کرتا ہے، تو اس کا خرچ اٹھتا ہے۔ اس خرچ کو سب دیکھتے ہیں۔ لیکن وہ آمدنی جو اس نے تھوڑی تھوڑی کر کے جمع کی تھی، اسے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں کہ اصل چیز آمدنی ہے۔ کیونکہ خرچ آمدنی ہی میں سے ہوتا ہے۔ جس سے ہمیں تعلق ہوتا ہے، ہم ہر لحظہ اس سے بات کرتے ہیں۔ خاموشی میں اس کی غیر حاضری میں اور اس کی حضوری میں۔ ہر حالت میں ہم اس سے باتیں کرتے ہیں۔ بلکہ جنگ میں بھی جبکہ ہم گتھم گتھا ہوتے اور ایک دوسرے کو مکے مارتے ہیں، اس وقت بھی ہم اس سے مصروف گفتگو ہوتے ہیں۔ اور ہم اسی کے ہوتے ہیں۔ اور وہ ہم سے جدا نہیں ہوتا۔ ہمارے اس مکّہ کے اندر اس حالت میں انگور کا خوشہ ہوتا ہے۔ تجھے یقین نہیں آیا؟ مٹھی کو کھول اور دیکھ! یہ انگور نہیں بلکہ قیمتی اور پیارے پیارے سے موتی ہیں۔ آخر دوسرے لوگ نظم و نثر سے بڑے نازک اور دل پسند معارف پیدا کرتے ہیں۔ یہ جو امیر کا میلانِ طبع اس طرف ہے اور ہم سے تعلق ہے۔ یہ باریک معارف اور وعظ و نصیحت کی وجہ سے نہیں۔ چونکہ یہ چیزیں ہر جگہ موجود ہیں اور ان کی،

کی نہیں۔ انہیں جو مجھ سے تعلق ہے یہ ان چیزوں کی وجہ سے نہیں۔ وہ کچھ اور چیز دیکھتا ہے۔ جو کچھ اس نے دوسروں سے دیکھا ہے، اس سے ہٹ کر کوئی چیز ہے، جس سے وہ روشنی پاتا ہے۔

کہتے ہیں ایک بادشاہ نے مجنوں کو بلایا اور پوچھا، تجھے کیا ہو گیا ہے اور تجھ پر کیا اُفتاد پڑی ہے کہ تُو نے اپنے آپ کو رسوا کر لیا؟ اپنے خاندان اور کنبے کو چھوڑ کر خراب اور فنا ہو گیا؟ لیلیٰ کیا ہے؟ اس میں خوبی ہی کیا ہے؟ آمیں تجھے حسین ترین دوشیزائیں دکھاؤں اور ان کو تجھ پر قربان کروں، اور انہیں تجھ کو بخش دوں۔

جب یہ حسین ترین دوشیزائیں حاضر ہوئیں تو اپنی اداؤں میں سرمست تھیں۔ مجنوں اپنے حال میں تھا، اس نے اپنا سر جھکایا ہوا تھا، اور نظر اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔

بادشاہ نے فرمایا، اب ذرا سر اٹھا اور ان دوشیزاؤں کو دیکھ۔

مجنوں نے جواب دیا، میں ڈرتا ہوں۔ کیونکہ لیلیٰ کا عشق تلوار سونتے کھڑا ہے۔ میں نے اپنا سر اٹھایا، تو وہ اس سر کو تلوار کے ایک ہی وار سے اڑا دے گا۔ وہ لیلیٰ کے عشق میں غرق تھا۔ اور اس کی یہ حالت ہو چکی تھی کہ اس نے کسی دوسری حسین دوشیزہ کی پروا تک نہ کی۔ لیلیٰ کے علاوہ کسی اور پر نظر کرنا گویا تلوار سے قتل ہو جانا تھا۔ آخر دوسری حسینان مہ جبین کی خوبصورت آنکھ، رخسار، ہونٹ، ناک تھے۔ لیلیٰ میں آخر اس نے کیا خاص بات دیکھی کہ وہ ساکن ہو کر رہ گیا!

روح اور نفس دو جدا چیزیں ہیں

مولانا نے امیر سے فرمایا، ہم تمہارے بہت مشتاق ہیں۔ چونکہ میں جانتا ہوں

تم دُنیا کی بہتری کرنے میں مشغول ہو۔ تم سے دوری کی زحمت گوارا کر رہا ہوں۔ امیر نے کہا یہ مجھ پر واجب تھا۔ پریشانی جاتی رہے۔ تو اس کے بعد میں آپ کے پاس حاضر ہوں۔ مولانا نے فرمایا، کوئی فرق نہیں۔ تمہارے لیے سب ایک جیسا ہے، تمہیں وہ لطف حاصل ہے کہ زحمتیں تمہارے لیے گویا رحمتیں نہیں۔ لیکن جب میں نے جانا کہ آج آپ خیرات اور دوسرے نیکی کے کاموں میں مشغول ہیں تو آپ کی طرف رجوع ہوا۔ اس گھڑی ہم یہ بحث کرتے ہیں کہ اگر ایک مرد کے اہل و عیال ہیں اور دوسرا ایک مرد ایسا ہے جس کے اہل و عیال نہیں ہیں۔ عیالدار سے اس کے اہل و عیال لے کر اس دوسرے مرد کو دے دیئے جائیں، تو ظاہر دار لوگ کہتے ہیں، عیالدار سے لے کر اہل و عیال اسے دے دیئے جس کے پاس اہل و عیال نہ تھے۔ جب تو دیکھے تو معلوم ہو گا کہ دراصل اس اہل و عیال کا وہ خود مالک نہیں۔ یہ ایسا ہے کہ اہلِ دل شخص میں جوہر ہوتا ہے۔ کسی پوشیدہ مصلحت کی وجہ سے وہ کسی آدمی کو پیٹتا ہے۔ اس کے ناک اور منہ کو توڑ دیتا ہے۔ سب لوگ کہتے ہیں کہ مار کھانے والا مظلوم ہے۔ لیکن تحقیق کرنے پر معلوم ہو گا کہ مظلوم دراصل مارنے والا ہے۔ اور پٹنے والا ظالم ہے۔ کیونکہ مارنے والا صاحبِ جوہر ہے اور متہلک ہے۔ جو کام اس نے کیا وہ دراصل خدا نے کیا اور خدا کو ظالم نہیں کہتے۔ جیسا حضور سرورِ کائنات ﷺ نے کشت و خون کیا اور غارت گری کی۔ اس کے باوجود ظالم وہ دشمن ہی تھے۔ اور حضور ﷺ مظلوم تھے۔ مثلاً مغرب کا رہنے والا ایک آدمی مغرب میں مقیم ہے اور وہ صاحبِ جوہر ہے۔ اور مشرق کا رہنے والا ایک شخص مغرب میں آیا۔ مسافر وہ مغربی ہے۔ لیکن جو شخص مشرق سے آیا، کیا وہ مسافر ہے؟ ساری دُنیا ایک گھر سے زیادہ نہیں۔ اگر کوئی آدمی گھر کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے کی طرف چلا جائے، تو وہ مسافر نہیں کہلاتا۔ کیونکہ آخر وہ گھر ہی میں موجود ہے۔ لیکن وہ مغربی شخص جو صاحبِ جوہر ہے، گھر

سے باہر آئے تو مسافر ہے، کہتے ہیں:

الاسلام بدأ غریباً. (حدیث) اسلام کی ابتداء غربت سے ہوئی۔

یہ نہیں کہا گیا:

المشرقی بدأ غریباً. مشرقی کی ابتداء غربت سے ہوئی۔

اسی طرح حضور سرور کائنات ﷺ نے جب شکست کھائی تو مظلوم تھے اور جب انہوں نے شکست دی، اس وقت بھی مظلوم حضور ﷺ ہی تھے۔ کیونکہ دونوں حالتوں میں وہ حق پر تھے۔ اور مظلوم وہ ہے جس کے ہاتھ میں صداقت ہو۔ حضور سرور کائنات ﷺ کو اسیروں کے متعلق دلسوزی تھی۔ خدا تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی خاطر وحی نازل کی کہ اے رسول ﷺ ان اسیروں سے کہہ دے کہ اس قید و بند کی حالت میں اگر تم اپنی نیت کو بخیر کر لو تو خدا تعالیٰ تمہیں رہائی دے گا۔ اور جو کچھ تم سے چھن گیا ہے، وہ تمہیں دوبارہ دے گا۔ بلکہ اس کو دگنا تگنا کر کے دے گا۔ اپنی بخشش اور رضا سے وہ تمہیں دو خزانے دے گا۔ ایک دُنیا کا خزانہ جو تم نے کھویا ہے اور دوسرا آخرت کا۔

امیر نے سوال کیا، جب بندہ عمل کرتا ہے۔ تو وہ توفیق اور خیر کے ذریعہ ہوتا ہے یا خدا کی مہربانی سے؟ فرمایا، خدا کی مہربانی سے اور توفیق بھی حق ہے۔ لیکن خداوند تعالیٰ اپنے انتہائی لطف و کرم سے دونوں میں اضافہ فرماتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ دونوں تجھ سے ہیں:

جزاءً بما کانوا یعملون. (احقاف: ۲) جو کچھ انہوں نے کیا اس کا بدلہ۔

کہا چونکہ خدا تعالیٰ کو اس میں لطف آتا ہے۔ پس جو شخص حقیقی طلب رکھتا ہے، پالیتا ہے۔ فرمایا لیکن یہ بغیر سردار کے نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام والا واقعہ ہے کہ جب وہ لوگ آپ کے مطیع تھے، دریائے نیل میں راستے پیدا ہو گئے اور

دریا میں سے گرد اٹھنے لگی۔ اور وہ سلامتی کے ساتھ دریا کو عبور کر گئے۔ پھر جب انہوں نے اپنے سردار کی مخالفت کی تو چالیس سال تک بیابانوں میں بھٹکتے پھرے، ارشاد ہے:
اربعین سنۃ یتیھون فی الارض (مائدہ : وہ چالیس سال تک زمین پر بھٹکتے رہے۔
(۴ع

اور اس زمانہ کا سرداران کی اصلاح کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کا فرض ہے، وہ دیکھے کہ وہ اس کے مطیع ہیں اور احکام بجالاتے ہیں۔ مثلاً جب سپاہی امیر کی خدمت میں مطیع اور فرمانبردار ہوتے ہیں۔ تو وہ بھی اپنی عقل کو ان کی بھلائی کے کام سوچنے میں لگائے رکھتا ہے۔ لیکن جب وہ اس کے مطیع نہ رہیں۔ تو وہ کس طرح ان کا تدارک کر سکتا ہے۔ اور اپنی عقل کو کیسے ان کی بھلائی میں مصروف رکھ سکتا ہے۔

سمجھ لے کہ آدمی کے جسم میں عقل ہمیشہ امیر کی مانند ہے۔ جب تک جسم کی رعایا اس کی مطیع رہتی ہے۔ اس کے سب کام اصلاح پاتے رہتے ہیں۔ لیکن جب جسم عقل کے تابع نہیں رہتا تو فساد رونما ہو جاتا ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ شرابی آدمی جب نشہ میں مخمور ہوتا ہے تو رعایائے وجود یعنی اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان کیا کیا فساد برپا کرتے ہیں۔ دوسرے دن ہوشیار ہونے پر وہ کہتا ہے کہ میں نے کیا کیا! میں نے کیوں اس طرح بکواس کی، اور کیوں گالیاں دیں۔ پس اصلاح کا وقت وہی ہوتا ہے، جب بستی میں سردار موجود ہو۔ اور یہ اس کے مطیع ہوں۔ اب عقل بعض وقت اس رعایائے اعضاء کی اصلاح کے لیے سوچ بچار کرتی ہے، جو اس کے زیر فرمان ہیں۔ مثلاً اس نے سوچا کہ میں جاؤں۔ یہ اس وقت ہی ہو سکتا ہے کہ پاؤں اس کے زیرِ فرمان ہوں۔ ورنہ وہ سوچتی ہی نہیں۔ اب اسی طرح جسم میں عقل امیر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ سارے وجود جسے دُنیا کہتے ہیں، سب کے سب اپنی عقل، دانش، نظر اور علم سے نسبت رکھتے ہیں۔ یہ سب مل کر ایک

جسم ہیں اور ان میں مجموعی عقل امیر ہے۔ دُنیا کے جسم اگر اس امیر کے تابع نہیں رہتے تو ان کی حالت پر ہمیشہ پریشانی اور پشیمانی طاری رہتی ہے۔ اب جبکہ وہ مطیع ہو جاتے ہیں تو جو کچھ مجموعی عقل کہتی ہے، یہ کرتے ہیں۔ اور وہ اپنی اپنی عقل کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے، وہ اپنی عقل سے اسے نہ سمجھ سکیں۔ چاہیے کہ وہ اسی کے مطیع رہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک لڑکے کو درزی کی دوکان پر شاگرد بنا کر بٹھاتے ہیں، تو اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ہر حال میں اُستاد کا مطیع ہو۔ اگر اسے تکل دے کہ اسے سیئے، تو وہ اسے سی ڈالے۔ اور اگر شلال دے تو شلال سی ڈالے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ درزی کا پیشہ سیکھے تو اسے اپنے اختیار کو قطعاً بھول جانا چاہیے۔ اور چاہیے کہ استاد کے حکم کا پابند ہو جائے۔ خداوند تعالیٰ سے میں امید کرتا ہوں کہ وہ ایسی حالت پیدا کر دے گا جو صرف اس کی عنایت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور جو لاکھوں کوششوں کی زد سے بالا ہے :

لیلة القدر خیر من الف شهر.　　شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

یہ بات اور وہ بات ایک ہی ہے کہ :

جذبة من جذبات الحق خیر من عبادة الثقلین.　　جب اس کی عنایت ہو تو وہ عنایت لاکھ کوششوں کا کام سرانجام دیتی ہے۔

اور کوشش کی افزونی اچھی اور مفید چیز ہے۔ لیکن عنایت کے مقابلہ میں کوشش کیا حیثیت رکھتی ہے۔

پروانہ نے پوچھا کہ عنایت سے کوشش پیدا ہوتی ہے؟ فرمایا کیوں پیدا نہیں ہوتی؟ جہاں عنایت ہو وہاں کوشش آ ہی جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا کوشش کی کہ پنگوڑے ہی میں کہا :

انی عبد الله اتنی الکتٰب. (سورۂ مریم: ۲ ع) میں خدا کا بندہ ہوں، مجھ پر کتاب اتری ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھے کہ ان کی تعریف کی۔
کہا حضور سرورِ کائنات ﷺ بغیر کوشش کے نبی ہوئے، فرمایا:

فمن شرح الله صدره للسلام. سو جس کا سینہ اللہ اسلام کے لیے کھول دے۔

پہلے فضل ہے، جب انسان گمراہی سے نکل کر بیدار ہوتا ہے۔ یہ خدا کا فضل اور اس کی عطائے محض ہوتی ہے۔ ورنہ اس فضل و جزا کے بعد حضورؐ کے دوستوں کے ساتھ یہی کچھ کیوں نہ ہوا جو حضورؐ کے قریب تھے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آگ کی چنگاری کو دتی ہے۔ اس چنگاری کا آغاز عطا ہے۔ اس فضل و جزا کے بعد جب اس چنگاری کے سامنے تونے روئی رکھ دی۔ تو اس کی پرورش کی اور اسے بڑھایا۔ آدمی کا آغاز خاموشی اور ضعف ہی ہے۔ جیسا کہ:

خلق الانسان ضعیفاً. (نساء: ۵) انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے

جیسا کہ پتھر اور لوہے سے نکل کر آگ کی چنگاری جلے ہوئے کپڑے پر گرتی ہے۔ اس آگ کی ابتدا بہت کمزور ہے۔ لیکن جب اس کمزور آگ کی پرورش کرتے ہیں تو یہ ایک جہان بن جاتی ہے اور ساری دنیا کو جلا سکتی ہے اور وہی چھوٹی سی آگ بہت بڑی بن جاتی ہے:

و انّك لعلیٰ خلق عظیم. (قلم: ۱۱) بے شک تمہارا اخلاق اعلیٰ درجہ کا ہے۔

میں نے کہا مولانا آپ کو بہت بڑا دوست سمجھتے ہیں۔ فرمایا میری آمد نہ تو دوستی کی وجہ سے ہے اور نہ گفتگو کی خاطر۔ جو زبان پر آتا ہے میں کہہ دیتا ہوں۔ اگر خدا چاہے تو

اس تھوڑی سی بات سے نفع دے دیتا ہے۔ اور اسے آپ کے سینے کے اندر قائم کردیتا ہے، اور بڑا نفع دیتا ہے۔ اور اگر خدا نہ چاہے تو لاکھ باتیں سنو اور یاد رکھنے کی کوشش کرو۔ ان میں سے ایک بھی دل میں نہ ٹھہرے گی۔ ہر بات ہوا میں اڑ جائے گی، اور فراموش ہو جائے گی۔ ایسے ہی جیسے کہ آگ کی چنگاری جلے ہوئے کپڑے پر گری۔ اگر خدا چاہے تو یہی چنگاری وسعت پاتی، اور بہت بڑی آگ بن جاتی ہے۔ اگر خدا نہ چاہے تو چنگاری جلے ہوئے کپڑے تک پہنچ کر بس ہو جاتی ہے۔ اور کوئی اثر نہیں کرتی:

وللّٰہ جنود السمٰوات والارض. (سورۃ فتح: ع۱)	آسمان اور زمین میں خدا ہی کے لشکر ہیں۔

یہ باتیں بھی خدا کی فوج ہیں۔ یہ قلعوں کو خدا کے دستور کے مطابق فتح کرتی اور اس پر قابض ہوتی ہیں۔ اگر وہ کہے اتنے ہزار سوار فلاں قلعہ پر چڑھائی کریں۔ وہاں پہنچیں مگر قلعہ پر قبضہ نہ کریں۔ تو وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور اگر وہ صرف ایک ہی سوار سے کہدے کہ اس قلعہ کو فتح کرلو، اور اپنے قبضے میں لے آؤ۔ تو وہ ایک سوار ہی قلعہ کو فتح کرکے اس پر قابض ہو جاتا ہے۔ مچھر سے نمرود پر حملہ کرا دیتا ہے۔ اور اس سے نمرود کو ہلاک کرا دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

استوی عند العارف الدانق والدینار و الاسد الھرۃ.	عارف کے نزدیک دانق اور دینار، اور شیر اور بلی برابر ہیں۔

اگر خداوند تعالیٰ برکت دے تو ایک آنہ چار لاکھ روپے کا کام دے جاتا ہے۔ اور اگر چار لاکھ روپے میں سے برکت اٹھ جائے۔ تو وہ ایک آنہ کا کام بھی نہیں دے سکتے۔ ایسے ہی اگر بلی کسی پر حملہ کرے تو اسے ہلاک کردیتی ہے، جس طرح مچھر نے نمرود کو ہلاک کردیا تھا۔ اگر خدا چاہے تو شیر کو درویشوں کے لئے سواری کا جانور بنا دے، تو شیر

درویشوں کے سامنے کانپنے لگتا ہے۔ چنانچہ بعض درویش شیر پر درحقیقت سوار ہوتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ پر آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ اور وہ سلامت رہے۔ اور آگ سبزہ و گلزار بن گئی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ خدا نے آگ کو اجازت نہ دی تھی کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کو جلائے۔

حاصلِ کلام یہ کہ جب یہ جانتے ہیں کہ سب کچھ خدا ہی کی طرف سے ہے۔ ان کے سامنے سب کچھ یکساں ہے۔ میں خدا سے امید کرتا ہوں کہ آپ یہ باتیں بھی اپنے دل سے سنیں کہ دل سے باتیں سننا ہی مفید ہے۔ اگر باہر سے ہزار چور بھی آجائیں۔ تو وہ ان موتیوں کو چرا کر نہیں لے جاسکتے۔ جب تک یہاں سینہ کے اندر ان کا دوست موجود نہ ہو جو ان کو اندر بلانے کے لئے دروازہ کھول دے۔ تو باہر سے لاکھ باتیں کہتا رہے جب تک ان کی تصدیق کرنے والا سینے کے اندر موجود نہ ہو ان کا کچھ فائدہ نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ بیج کے اندر آبداری نہ ہو۔ اس پر سے پانی کے ہزار طوفان بھی گذر جائیں تو نہ وہ پھوٹے گا، اور نہ اس سے درخت پیدا ہو سکے گا۔ بیج کے اندر پہلے آبداری کا ہونا نہایت ضروری ہے تاکہ وہ باہر کی چیزوں کو مدد دے سکے۔

ترجمہ شعر: نور اگر لاکھ انسانوں کو بھی دیکھے۔ تو وہ اسی پر بیٹھے گا جس کی اپنی اصل نور ہو گی۔

اگر ساری دنیا نور سے بھر جائے۔ پھر بھی جب تک اپنی آنکھ میں نور نہ ہو، وہ نور نظر نہیں آئے گا۔

اب اصل قابلیت وہ ہے جو نفس میں ہے۔ نفس اور روح دو مختلف چیزیں ہیں۔ کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ نفس انسان کو خواب میں کہاں کہاں لئے پھرتا ہے۔ اور روح جسم ہی میں رہتی ہے۔ لیکن یہ نفس بن جاتا ہے اور دوسری چیز ہو جاتا ہے۔ پس امیر المومنین

حضرت علیؓ نے جو کچھ کہا:

من عرفه نفسهٗ فقد عرف ربه. جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے خدا کو پہچان لیا۔

یہ نفس ہی کے متعلق کہا ہے۔ روح کے متعلق نہیں کہا۔ اور اگر ہم کہیں کہ یہ نفس کے متعلق کہا ہے یہ عقل مندی نہیں۔ اور اگر ہم اس نفس کی شرح کریں تو وہ اسے ہی نفس سمجھ لے گا۔ کیونکہ وہ اس نفس کو نہیں جانتا۔ مثلاً ایک چھوٹا آئینہ ہاتھ میں لیا جائے۔ وہ آئینہ بڑا ہو یا چھوٹا، اچھا ہو یا برا اس کا کام ہی چیزیں دکھانا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ یہ بات ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔ اس نے جواب دیا اسی قدر کافی ہے کہ اس آئینہ میں کانٹا، کانٹا ہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں۔ اس کی ایک الگ دنیا ہے۔ یہ دنیا الگ اس لیے ہے کہ ہم اسے طلب کریں اور جو خوشیاں اس کے اندر ہیں انہیں بھی حاصل کریں۔ انسان کے حصہ میں وہی خوشیاں آتی ہیں جو حیوانیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ تمام حیوانی قوت ہے۔ جو آدمی کو آدمی بناتی ہے۔ اور جو حقیقت ہے۔ وہ انسان ہے۔ اور انسان کم ہوتا جاتا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ انسان بولنے والا حیوان ہے۔ الانسان حیوان ناطق۔ پس آدمی دو چیزوں پر مشتمل ہوا۔ اس دنیا میں جو حیوانی قوت اس میں ہے وہ شہوات اور آرزوئیں ہیں۔ لیکن جو کچھ ان سب کا خلاصہ ہے اس کی غذا علم حکمت اور اللہ کا دیدار ہے۔ آدمی میں جو حیوانیت ہے وہ حق سے گریزاں ہے اور اس کی انسانیت دنیا سے روگرداں ہے۔

فمنکم کافر و منکم مومن. (سورۃ تغابن: ع ۱) پس تم ہی میں کافر بھی ہیں اور تم ہی میں مومن بھی۔

اس وجود میں دو شخص برسر پیکار ہیں۔

خوش نصیبی کس کے لیے ہے اور وہ کسے پسند کرتی ہے

اس میں شک نہیں کہ یہ دُنیا عالمِ زمستان ہے۔ جمادات کو "جماد" کیوں کہتے ہیں؟ کیونکہ سب کچھ منجمد ہے۔ یہ سنگ و کوہ، یہ لباس کہ تو پہنے ہوئے ہے، سب منجمد ہیں۔ اگر یہ دُنیا عالمِ زمستاں نہیں تو پھر ہر چیز منجمد کیوں ہے؟ عالمِ معنی بڑا بسیط ہے۔ نظر اس سارے عالم کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ لیکن تاثیر سے اسے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ہوا اور سردی ہے۔ یہ دُنیا سردی کے موسم کی طرح، اس لیے ہے کہ یہاں سب کچھ منجمد ہے۔ لیکن یہ سردی کا موسم عقلی ہے، حسّی نہیں۔ جب خدائی ہوا آتی ہے، تو وہ پہاڑ کو بھی گداز کر دیتی ہے۔ دُنیا پانی بن جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے گرمی کا موسم آتا ہے تو ہر جمی ہوئی چیز پگھل جاتی ہے۔ قیامت کے دن جب وہ ہوا چلے گی، سب کچھ گداز ہو جائے گا۔ خداوند تعالیٰ ان کلمات کو آپ کے گرد کئی لشکر بنا دیتا ہے، تاکہ دشمنوں کے سامنے وہ آپ کے لیے دیوار بن جائیں۔ اور دشمنوں کے لیے قہر کا باعث بنیں۔ یعنی اندر والے دشمنوں کے لیے بیرونی دشمن کچھ چیز نہیں۔ وہ ہیں کیا چیز؟ تو نے نہیں دیکھا کہ کتنے ہزار کافر، ایک کافر کے قیدی ہیں، جو ان کا بادشاہ ہے۔ اور وہ کافر اندیشہ کا قیدی ہے۔ پس ہم سمجھ گئے کہ کام اندیشہ کرتا ہے۔ جب ایک کمزور اور مکدر اندیشہ سے اتنے ہزار لوگ اور جہان اسیر ہیں۔ تو جس جگہ اندیشوں کا کوئی شمار نہیں، دیکھو وہاں کتنی عظمت اور شان ہو گی۔ اس صورت میں دشمنوں کا قہر کیا کر سکتا ہے؟ اور وہ کس دنیا کو فتح کر سکتے ہیں؟ جب ہم صاف دیکھتے ہیں کہ لاکھوں سپاہی جن کا شمار نہیں صحرا در صحرا پھیلے ہوئے ہیں اور وہ ایک شخص کے اسیر ہیں اور وہ شخص ایک حقیر اندیشہ کا اسیر ہے۔ پس یہ سب کے سب ایک ہی اندیشہ کے اسیر ہوئے۔ قدسی اور علوی اندیشے چونکہ نہایت عظیم اور بے حد و حساب

ہیں، ہم سمجھ گئے کہ کام اندیشے ہی کرتے ہیں۔ سب صورتیں اندیشہ کے تابع اور آلہ کار ہیں۔ اور اندیشہ کے بغیر وہ یکسر معطل ہیں، اور منجمد ہیں۔ پس جو شخص محض صورت کو دیکھتا ہے، وہ خود بھی منجمد ہے۔ عالم معنی میں اس کے لیے کوئی راستہ نہیں۔ وہ بچہ ہے، نابالغ ہے، خواہ صورت کے اعتبار سے وہ سو سال کا بوڑھا کیوں نہ ہو۔

رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر. ہم چھوٹے جہاد سے لوٹ کر بڑے جہاد کی طرف آگئے۔

یعنی نفس کے ساتھ جنگ کرنا جہادِ اکبر ہے۔ جنگ میں ہم کئی صورتیں تھے۔ اور ہم صوری دشمنوں سے لڑے۔ اس گھڑی ہم اندیشوں کے لشکر کے خلاف مصروفِ پیکار ہیں، تاکہ نیک اندیشے بداندیشوں کو شکست دیں۔ اور جسم کی مملکت سے انہیں نکال باہر کیا جائے۔ پس جہادِ اکبر یہی ہوا۔ اب فکر کا کام ہے۔ کیونکہ افکار بغیر جسم کے توسط کے مصروف کار ہیں۔ ایسے ہی جیسے کہ عقل فعال کسی آلہ کی مدد کے بغیر آسمان کو گھماتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ آلہ کی احتیاج نہیں۔

ترجمہ شعر: تو جوہری ہے اور دونوں جہان خاص تیرا عرض ہیں۔ وہ جوہر ناپسند ہے جو عرض سے مانگا جائے۔

جو شخص دل سے علم کی جستجو کرتا ہے اس پر رو۔ اور جو آدمی جان سے عقل کو ڈھونڈتا ہے، اس پر ہنس۔

جب عرض ہے تو عرض پر نہیں رہنا چاہیے۔ کیونکہ یہ جوہر مشک کے نافہ کی طرح ہے اور یہ دُنیا اور اس دُنیا کی خوشیاں اس مشک کی خوشبو کی طرح ہیں۔ مشک کی یہ خوشبو نہیں رہتی۔ کیونکہ عرض ہے۔ جو شخص اس خوشبو سے مشک طلب کرتا ہے نہ کہ صرف خوشبو، اور خوشبو پر قانع نہیں رہتا، وہ نیک ہے۔ لیکن جو شخص صرف خوشبو ہی

سے مطمئن ہو گیا، وہ بد ہے۔ کیونکہ اس نے اس چیز پر ہاتھ ڈالا ہے، جو اس کے ہاتھ میں نہیں رہتی۔ کیونکہ خوشبو مشک کی صفت ہے۔ جب تک کہ مشک اس دُنیا میں موجود ہے خوشبو آتی ہے۔ جب وہ مشک پردہ میں چھپ گیا اور دوسری دُنیا میں چلا گیا، تو جو لوگ اس کی خوشبو میں زندہ تھے، وہ مر جائیں گے کیونکہ خوشبو مشک کی ملازم تھی۔ وہ وہیں چلی گئی، جہاں مشک اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ پس نیک بخت وہ ہے جو خوشبو سے گزر کر مشک کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے چہرہ تک جس کی رسائی ہو گئی اور وہ عین وہی ہو گیا۔ اس کے بعد اسے فنا نہیں ہوتی۔ اور وہ مشک کی ذات میں باقی رہتا ہے اور مشک کا حکم رکھتا ہے۔ اس کے بعد وہ خود اپنے آپ کو عالمِ خوشبو میں پہنچاتا ہے اور دُنیا اس سے زندہ ہوتی ہے۔ اس پر جو کچھ کہ وہ تھا سوائے نام کے باقی کچھ نہیں رہتا۔ ایسے ہی جیسے ایک جانور نمک کی کان میں جا کر نمک ہی بن جاتا ہے۔ اس میں سوائے جانور کے نام کے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ وہی دریائے نمک بن جاتا ہے۔ اس کی تاثیر اس کا فعل سب نمک کا ہوتا ہے۔ وہ نام اسے کیا نقصان دیتا ہے؟ نمکینی سے وہ باہر نہیں آئے گا۔ اور اگر تو نمک کی اس کان کا نام کچھ اور رکھ دے تو بھی نمک سے باہر نہیں آتا۔

پس آدمی کو ان خوشیوں اور مزدوروں سے آگے گزر جانا چاہیے جو خدا تعالیٰ کا عکس ہیں۔ اور اسے انہی پر قانع نہیں ہونا چاہیے۔ ہر چند کہ یہ بھی خدا تعالیٰ کے لطف و کرم ہی سے ہے اور اسی کے جمال کا عکس ہے۔ لیکن ہم سے نسبت باقی نہیں، خدا سے نسبت باقی ہے۔ اور خلقت سے نسبت فانی ہے۔ جیسے کہ آفتاب کی شعاع جو گھروں کو منور کرتی ہے۔ ہر چند کہ آفتاب کی شعاع ہے اور نور ہے۔ لیکن وہ آفتاب کی ملازم ہے۔ جب آفتاب غروب ہوتا ہے، روشنی نہیں رہتی۔ پس آفتاب بننا چاہیے تاکہ جدائی کا خوف نہ رہے۔ اصل باخت ہے اور شناخت ہے۔ بعض لوگوں میں داد و عطا ہے۔ لیکن شناخت

نہیں۔ لیکن بعض کو شناخت ہے، ان میں باخت نہیں۔ لیکن جب یہ دونوں موجود ہیں تو یہ توفیق کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ ایسا آدمی بے نظیر ہوتا ہے۔ یہ مثال ایسی ہے جیسے کوئی آدمی راستہ پر چلا جارہا ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتا کہ وہ راستہ پر چل رہا ہے یا بغیر راستہ ہی کے چلا جا رہا ہے۔ وہ اندھوں کی طرح چلا جاتا ہے۔ یکایک مرغ کی آواز یا کسی کرناہ کی آواز اسے پتہ دیتی ہے کہ آبادی قریب ہے۔ کجا یہ شخص اور کجا وہ جو راستہ جانتا ہے۔ اور اس پر چلا جاتا ہے۔ وہ کسی نشانی کا محتاج نہیں۔ پس شناخت اور رائے ہی سب کچھ ہے۔

اجابتِ دُعا خلوص پر منحصر ہے

حضور سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا:

اللیل طویل فلا تقصرہ بمنامك والنہار مضی فلا تکدرہ باثامك.	رات طویل ہے تو سو کر اسے مختصر نہ کر اور دن گزر چکا ہے، اسے اپنے گناہوں سے مکدر نہ کر۔

راز کی باتیں کہنے اور حاجتیں مانگنے کے لیے رات لمبی ہے۔ خلقت کی طرف سے تشویش ہوتی، نہ دوستوں اور دشمنوں کی زحمت ہوتی ہے۔ خلوت اور بے فکری حاصل ہو جاتی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے پردہ ڈال دیا ہے، تاکہ لوگوں کے اعمال دکھاوے اور ریاکاری سے محفوظ و مصئون رہیں، محض خدا کے لیے۔ اندھیری رات میں مخلص اور ریاکار انسان کا پتہ لگ جاتا ہے۔ رات کے وقت ہر چیز چھپی ہوتی ہے۔ دن کو اس کا ڈھنڈورا پٹ جاتا ہے۔ ریاکار انسان رات کو رسوا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے چونکہ اب کوئی نہیں دیکھتا جو چاہوں کروں۔ کہتے ہیں کون دیکھتا ہے۔ لیکن تو کوئی نہیں کہ کسی کو دیکھے۔ وہ جو دیکھنے والا ہے، ساری دُنیا اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اور مصیبت کے وقت اسے پکارتے ہیں۔ دانتوں

میں درد ہو، کان میں درد ہو، آنکھ میں درد ہو، تہمت لگے، خوف ہو۔ ہر حالت میں سب اسی کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ اور اسی پر اعتماد کرتے ہیں کہ وہ سنتا ہے۔ وہی حاجت روائی کرے گا۔ اور چھپ چھپ کر صدقہ دیتے ہیں کہ بلا دور ہو۔ بیمار کی کھوئی صحت اسے واپس مل جائے۔ اور اس پر بھروسہ کرتے ہیں کہ وہ صدقات کو قبول فرماتا ہے۔ جب صحت کے آثار ہوتے ہیں اور فرصت ہوتی ہے تو ان کا وہ یقین تازہ ہو جاتا ہے، اور خیال دوبارہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں، اے خداوہ کیا حالت تھی، جب میں نے بڑے صدق سے تجھے پکارا تھا۔ میں نے زندان کے اس گوشہ میں ہزاروں مرتبہ قل ھو اللہ پڑھا۔ بڑی گریہ وزاری کی۔ آخر تو نے میری حاجت پوری کر دی۔ اب میں زندان سے باہر ویسا ہی محتاج ہوں، جیسا کہ زندان کے اندر محتاج تھا۔ اس اندھیری دُنیا کے زندان سے مجھے باہر نکال اور نبیوں کی دُنیا میں کہ جہاں نور ہی نور ہے، مجھے لے آ۔ اب ہمارا وہی اخلاص ہمیں زندان اور حالتِ درد سے باہر کیوں نہیں لاتا۔ دل میں ہزارہا خیال آتے ہیں کہ پتہ نہیں فائدہ ہو یا نہ ہو۔ اور اس خیال کا اثر ہزار کاہلی اور ملال پیدا کرتا ہے۔ خیال کو جلا دینے والا وہ یقین کہاں ہے؟

خداوند تعالیٰ جواب میں فرماتا ہے، یہ جو میں نے کہا تمہارا نفسِ حیوانی تمہارا اور میرا دشمن ہے:

لاتتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء۔ میرے اور اپنے دشمن کو اپنا دوست نہ بنانا۔
(سورۂ ممتحنہ: ع ۱)

اسے مجاہدہ کے زندان میں ہمیشہ قید رکھئے۔ کیونکہ جب تک یہ قید، مصیبت اور تکلیف میں ہے تیرا اخلاص ظاہر ہوتا اور طاقت حاصل کرتا ہے۔ تو نے ہزار بار آزما دیکھا کہ دانتوں کی تکلیف، دردِ سر اور خوف نے تجھ میں اخلاص پیدا کر دیا۔ پھر تو جسمانی راحت

میں کیسے جکڑا گیا؟ اور کیسے جسم کی تیمارداری میں مشغول ہو گیا؟ اپنے اصل مقصود کو فراموش نہ کیجئے۔ اور نفس کو پوری طاقت کے ساتھ نامراد رکھیے تاکہ تو ابدی مراد کو پہنچے اور تاریکی کے زندان سے تجھے اخلاص حاصل ہو۔ کیونکہ:

ونهی النفس من الهویٰ فان الجنة هی الماویٰ. (سورۂ نازعات: ع ۱)

جس نے نفس کو خواہش سے روکا، پس جنت اس کا ٹھکانا ہے۔

صفات کی اصلیت

شیخ ابراہیم[1] کہتا ہے کہ جب سیف الدین فرخ کسی شخص کو پیٹتا، تو اپنے آپ کو کسی دوسرے آدمی سے باتوں میں مشغول کر لیتا کہ وہ اسے مارے۔ اور اس معاملہ اور اس طریقہ میں کسی کی سفارش کارگر نہیں ہوتی۔ مولانا نے یہ سن کر فرمایا کہ تو اس دُنیا میں جو کچھ دیکھتا ہے، دوسرے جہان میں ویسا ہی ہے۔ بلکہ یہ سب نمونے اسی جہان کے ہیں۔ اور جو کچھ اس دُنیا میں ہے، یہ سب کا سب وہیں سے آیا ہے۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

وان من شیٔ الا عندنا خزائنهٗ وما ننزلهٗ الا بقدر معلوم. (سورۂ حجر: ع ۲)

کوئی شے ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں۔ لیکن ہم اس میں سے ایک مقررہ مقدار کے مطابق اتارتے رہتے ہیں۔

طواق اپنے تھالوں میں مختلف دوائیں رکھتا ہے۔ ہر انبار میں سے مٹھی مٹھی بھر دوائیں ان تھالوں میں ہوتی ہیں۔ فلفل اور مصطگی کے انبار بے انتہا ہیں لیکن طواق[2] کے

---

[1] شیخ ابراہیم دراصل شمس الدین تبریزی کے ایک خاص مرید تھے۔ ملاحظہ ہو فیہ مافیہ ایرانی ایڈیشن، صفحہ ۲۸۱۔

[2] مولانا عبدالماجد کے مجموعہ میں لفظ "طواقاں" ہے۔ مگر ایرانی ایڈیشن میں اس کی بجائے "طاس بعلبی" ہے جو مہمل معلوم ہوتا ہے۔ اس ایڈیشن کے مولف نے طاس "بعلبی" کے معنی تلاش کرنے کی بہت کوشش کی ہے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ملاحظہ ہو، ایرانی ایڈیشن، صفحہ ۲۸۲۔

تھالوں میں اس مقدار سے زیادہ دوائیں نہیں سماتیں۔ پس انسان کی مثال طواق کی سی ہے یا عطار کی دکان جیسی۔ کیونکہ انسان میں خدا نے صفات کے خزانوں میں سے مٹھی مٹھی بھر اور ٹکڑا ٹکڑا اصاف تھالوں اور ڈبوں میں رکھ دی ہیں تاکہ انسان دُنیا میں اپنے لائق تجارت کرے۔ کچھ حصہ سماعت کا، کچھ بصارت کا، کچھ گویائی کا، کچھ عقل کا، کچھ احسان کا، کچھ علم کا دے دیا۔ پس انسان خدا کے طواق ہیں اور وہ طواقی کرتے ہیں، اور خدا رات دن تھالوں کو پُر کرتا ہے۔ اور تو انہیں خالی کرتا رہتا ہے، یا ضائع کر دیتا ہے، تاکہ تو اس سے کسب کرے۔ تُو دن کو انہیں خالی کرتا ہے اور رات کو وہ انہیں پھر پُر کر دیتا ہے۔ اور خوراک دیتا ہے۔ مثلاً تُو آنکھ کی روشنی کو دیکھتا ہے۔ اس جہان میں آنکھیں ہی آنکھیں اور نظریں ہی نظریں ہیں۔ خدا نے ان میں سے تجھے مختلف نمونے بھیج دیئے۔ تاکہ تُو ان سے دُنیا کا سیر تماشا کرے۔ اس جہان میں صرف اتنی ہی نظر نہیں۔ لیکن انسان اتنی نظر سے زیادہ برداشت نہیں کرتا۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ سب صفات ہمارے پاس بے انتہا ہیں۔ ہم ان میں سے ایک معین مقدار میں صفات تیرے پاس بھیجتے ہیں۔ سوچ تو سہی کتنے کروڑ خلقت صدی بعد صدی آئی اور اس دریا سے پُر ہوئی۔ اور پھر خالی ہو گئی۔ دیکھ کہ وہ کتنا بڑا انبار ہے کہ جو شخص اس دریا پر جتنا زیادہ عرصہ ٹھہرے اتنا ہی اس کا دل تھال کی طرف سے بھر جاتا ہے۔ پس سمجھ لے کہ یہ ساری دُنیا ایک ٹکسال میں سے برآمد ہوتی ہے اور پھر وہیں چلی جاتی ہے کہ :

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون. (سورۂ بقر : ع ۱۹) بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

یعنی ہمارے تمام اجزا اسی جگہ سے آئے ہیں۔ نمونے وہیں پر ہیں۔ اور چھوٹے بڑے اور حیوانات میں سے سب پھر اسی طرف ہی لوٹتے ہیں۔ لیکن ان تھالوں کے وجود

میں وہ جلدی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ان تھالوں کے وجود کے بغیر ان کا اظہار نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عالم ایک عالم لطیف ہے اور نظر نہیں آتا۔ لیکن اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ کیا تُو نہیں دیکھتا کہ جب نسیم بہار آتی ہے تو اس کے ذریعہ تو اشجار، سبزہ زار، باغات اور حسن بہار کے پھولوں سے لذت اندوز ہوتا ہے اور ان کا تماشا کرتا ہے۔ اور جب تو نسیم بہار کی ذات کو دیکھتا ہے تو ان میں سے تجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ اس میں سیر و تماشا اور گل و گلزار نہیں۔ آخر یہ گل و گلزار اسی کا عکس تو ہیں۔ بلکہ گل و گلزار سے اس میں موجیں اٹھتی ہیں۔ لیکن یہ موجیں لطیف ہیں اور نظر نہیں آتیں، سوائے واسطہ کے۔[1] لطافت ان موجوں کو نظر نہیں آنے دیتی۔ بالکل اسی طرح انسان میں اوصاف پوشیدہ ہیں۔ یہ اوصاف اندرونی یا بیرونی واسطہ کے بغیر، جیسے کسی کی گفتگو، کسی کے آسیب، کسی کی صلح یا جنگ نظر نہیں آتے۔ جب تک درمیان میں ایک واسطہ نہ ہو، یہ صفات نظر نہیں آتیں۔ اپنے اندر تُو غور کرتا ہے، تجھے کچھ نہیں ملتا۔ اور تو اپنے آپ کو ان صفات سے خالی سمجھتا ہے۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ تُو جو کچھ تھا، اس سے متغیر ہو گیا ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ صفات تجھ میں پوشیدہ ہیں۔ ان کی مثال دریا کے پانی کی ہے۔ پانی دریا سے باہر نہیں آتا۔ دریا سے باہر یہ بادل ہی کے ذریعہ آتا ہے۔ اور سوائے لہروں کی صورت کے یہ نظر نہیں آتا۔ لہر ایک جوش ہے جو بیرونی واسطہ کے بغیر تیرے اندر سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن دریا جب تک ساکن ہے تجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ تیرا جسم دریا کے کنارے ہے۔ اور تیری جان ایک دریا ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ کتنے ہزار مچھلیاں، سانپ اور دوسری رنگارنگ مخلوق دریا میں ہوتی ہے۔ یہ مخلوق اپنے آپ کو دکھاتی ہے، اور پھر دریا

[1] غالب نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

میں چلی جاتی ہے۔ تیری صفات جیسے غصہ، حسد، شہوت وغیرہ راز کے اسی دریا سے آراستہ ہیں۔ پس تیری صفات بچی عاشقانِ زار ہیں اور لطیف ہیں۔ انہیں دیکھا نہیں جاسکتا، سوائے اس کے کہ وہ زبان کے جامہ میں ہوں۔ جب یہ صفات برہنہ ہوتی ہیں، نظر نہیں آتیں۔

اعمال کی جزا اور سزا

انسان میں ایک عشق، درد، طلب، خلجان، اور تقاضا[1] ایسا ہے کہ اگر سو ہزار جہان اس کی ملکیت میں آجائے، تو بھی اس کا دل آسودہ نہیں ہوتا اور وہ آرام نہیں پاتا۔ یہ عشق آشنا مخلوق ہر پیشہ، صنعت، منصب، علم نجوم اور طب وغیرہ کی تحصیل کے لیے کوشش[2] کرتی ہے لیکن اسے بالکل قرار نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا مقصد اسے حاصل نہیں ہوتا۔ معشوق کو اسی لیے تو "دل آرام" کہتے ہیں کہ اس سے دل آرام پاتا ہے۔ پھر اس کے بغیر عاشق کو کیوں کر قرار آئے! یہ سب مقاصد اور خوشیاں سیڑھی کی مانند ہیں، اور سیڑھی کے پایوں کی طرح کسی ایک جگہ ان کا قیام نہیں۔ ان کی حیثیت عبوری ہے۔ مبارک ہے وہ انسان جو جلدی سے جلدی بیدار اور واقف ہو جائے، تاکہ طویل مسافت اس کے لیے مختصر ہو اور وہ سیڑھی کے پایوں ہی میں اپنی عمر ضائع نہ کر دے۔

سوال کیا کہ مغل ہمارا مال اڑا لے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی وہ بخشش میں مال ہمیں دیتے بھی ہیں۔ ان کا یہ طریقہ عجیب ہے۔ فرمایا مغل جو مال لے جاتے ہیں، ایسا ہی ہے کہ وہ حق کے قبضہ اور خزانہ میں آیا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ تو دریا میں سے ایک

---

[1] ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش   آہ وہ کامل تجلی مدعا رکھتا ہوں میں

[2] ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے (اقبال)

صراحی یا مٹکا پانی بھر کر باہر لے آئے تو یہ پانی تیری ملکیت بن جاتا ہے۔ جب تک پانی صراحی یا مٹکے میں ہے، اس پر کسی دوسرے کا تصرف نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص تیری اجازت کے بغیر اس مٹکے میں سے پانی لے جائے تو وہ غاصب ہے۔ لیکن اس پانی کو پھر دریا میں ڈال دیا جائے تو یہ سب پر حلال ہو جاتا ہے اور یہ تیری ملکیت نہیں رہتا۔ پس ہمارا مال ان پر حرام ہے اور ان کا مال ہم پر حلال ہے۔

لارهبانية فی الاسلام والجماعت رحمة[۱] (احادیث نبوی) اسلام میں رہبانیت نہیں ہے، جماعت رحمت ہے۔

حضور سرور کائنات ﷺ نے ہمیشہ جمعیت کے لیے کوشش فرمائی۔ کیونکہ ارواح کے اجتماع میں جو عظیم اثرات ہیں، تنہائی اور علیحدگی سے وہ حاصل نہیں ہوتے۔ مسجدیں بنانے کا راز یہ ہے کہ محلے کے لوگ اس میں جمع ہوں، تاکہ رحمت اور فائدہ زیادہ ہو۔ گھروں کا جدا جدا ہونا تفریق ہے۔ اور ان کے عیبوں کے لیے پردہ ہے۔ اور جامع مسجد کی بناڈالی تاکہ اہلِ شہر وہاں جمع ہوں۔ اور کعبہ کی زیارت اس لیے فرض کر دی گئی کہ دُنیا بھر کے شہروں اور ملکوں سے خلقت وہاں جمع ہو۔ کہا کہ مغل جب پہلے پہل اس ملک میں آئے تو ننگے اور برہنہ تھے۔ ان کی سواری گائے تھی اور جنگی ہتھیار لکڑی کے تھے۔ اس زمانہ میں وہ صاحبِ حشمت ہو گئے ہیں۔ بہترین عربی گھوڑے اور اسلحہ ان کے پاس ہیں۔ فرمایا کہ اس وقت وہ دل شکستہ اور کمزور تھے۔ ان میں طاقت نہ تھی۔ خدا نے انہیں طاقت دی اور ان کی عاجزی قبول کی۔ اس زمانہ میں جب کہ وہ اتنے محتشم اور قوی ہو گئے ہیں، خدا ✓

---

۱ ناتوانی باجماعت یار باش رونق ہنگامہ احرار باش

مولانا روم فرماتے ہیں

آں یکے پرسید اشترراکہ ہے از کجا می آئی اے اقبال پے

گفت از حمامِ گرمِ کوئے تو گفت خود پیداست از زانوئے تو

انہیں کمزور ترین مخلوق سے ہلاک کراتا ہے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ وہ خدا تعالیٰ کی عنایت اور مدد تھی جس کی بدولت یہ دُنیا پر چھاگئے۔ یہ ان کی اپنی قوت کا کرشمہ نہ تھا۔ پہلے یہ صحرا میں تھے، یہ دُنیا سے دور تھے، بے نوا، مسکین، محتاج اور عریاں تھے۔ ان میں سے بعض لوگ تجارت کے لیے خوارزم شاہ کی سلطنت میں آئے اور انہوں نے خرید و فروخت کی اور اپنا تن ڈھانپنے کے لیے سوتی کپڑا خریدا۔ خوارزم شاہ مانع ہوا اور اس نے ان کے تاجروں کو قتل کیے جانے کے لیے فرمایا۔ ان سے خراج لیا اور سوداگروں کو وہاں داخلہ کی ممانعت کر دی۔ تاتاری روتے پیٹتے اپنے بادشاہ کے پاس پہنچے کہ ہم ہلاک ہو گئے۔ ان کے بادشاہ نے ان سے دس دن کی مہلت مانگی، پھر بادشاہ ایک غار میں گیا اور دس دن روزہ رکھا۔ اور نہایت خشوع و خضوع کیا۔ خداوند تعالیٰ کی طرف سے ندا آئی کہ ہم نے تیری آہ و زاری قبول کی۔ غار سے باہر آ۔ تو جہاں جائے گا، فتح پائے گا۔ اس طرح وہ باہر نکلے۔ خدا کے حکم سے وہ فاتح بنے۔ اور دُنیا پر چھاگئے۔ کہا تاتاری قیامت کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ داد خواہی ہوگی۔ فرمایا وہ جھوٹ کہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں اپنی مشارکت ظاہر کریں۔ یعنی کہ ہم جانتے ہیں اور قائل ہیں۔ ایک لونٹ[ل] سے لوگوں نے پوچھا، تو کہاں سے آیا ہے؟ اس نے جواب دیا، حمام میں سے۔ کہا، یہ تیری ایڑی ہی سے ظاہر ہے۔

اب اگر یہ لوگ قیامت کے قائل ہیں تو اس کی علامت اور نشانی کیا ہے؟ ان کے یہ گناہ، ظلم، بدی منجمد برف کی طرح ہیں، جس کی تہ پر تہ چڑھی ہوئی ہے۔ خدا ترسی کے جہان سے جب انابت اور پشیمانی کا آفتاب طلوع ہوتا ہے، تو گناہ کی ساری برف پگھل جاتی ہے۔ کیونکہ آفتاب منجمد برف کو پگھلاتا ہے۔ اگر منجمد برف یہ کہے کہ میں نے آفتاب کو دیکھا ہے۔ آفتاب نے مجھے حدت پہنچائی اور گرم کیا ہے۔ اور اس کے باوجود برف

ل آں یکے پرسید اشتر را کہ ہے | از کجا می آئی اے اقبال پے
گفت از حمام گرم کوئے تو | گفت خود پیداست از زانوئے تو

ویسی کی ویسی منجمد ہے تو کوئی عقلمند اسے باور نہیں کرے گا۔ یہ ناممکن ہے کہ آفتاب چمک کر گرمی پہنچائے، اور برف نہ پگھلے۔ اگرچہ خداوند تعالیٰ نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ نیک اور بد کی جزا قیامت کو دے گا۔ لیکن اس کا نمونہ لحظہ بہ لحظہ اور دم بہ دم یہاں ملتا رہتا ہے۔ اگر کسی[1] انسان کے دل میں خوشی کی لہر اٹھتی ہے تو یہ اس بات کی جزا ہے کہ خود اس نے کسی کو خوش کیا ہے اور اگر کوئی انسان غمگین ہوتا ہے تو اس نے ضرور کسی کو غمگین کیا ہے۔ یہ تحفے اس جہان کے ہیں اور روزِ جزا و سزا کے آئینہ دار ہیں، تاکہ لوگ اس بات سے اس زیادہ بات کو سمجھ سکیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ گندم کے ڈھیر میں سے صرف مٹھی بھر دانے ہی دکھائے جاتے ہیں۔

حضور سرورِ کائنات ﷺ کو اس عظمت اور بزرگی کے باوجود جو انہیں حاصل تھی، ایک رات ہاتھ میں درد ہوا۔ حضور ﷺ پر وحی نازل ہوئی کہ یہ درد اس درد کی تاثیر ہے جو حضرت عباسؓ کے ہاتھ کو اس وقت ہوا تھا جب انہیں اسیر کیا گیا اور باقی قیدیوں کے ساتھ ان کے ہاتھ باندھ دیئے گئے تھے۔ اور اگرچہ حضرت عباسؓ کے ہاتھوں کا بندھنا خدا کے حکم کے مطابق تھا، اس کی جزا تجھے دی گئی، تاکہ تجھے معلوم ہو کہ یہ انقباض، تیرگی اور رنج جو تجھے پہنچتے ہیں، اس دل آزاری اور معصیت کی وجہ سے ہیں جو تُو نے کی مگر جس کی تفصیل تجھے یاد نہیں رہی (کہ تُو نے کیا کیا کچھ کیا۔ لیکن یہ اس کی جزا ہے کہ تو نے بُرے کام بہت کیے جن کا تجھے علم نہیں) وہ برے کام تو نے غفلت یا جہالت کی وجہ سے کیے، یا کسی بے دین دوست نے انہیں تجھ پر آسان کر دیا کہ تو انہیں

---

[1] کے کحو کردی و کے کردی تو بر   کہ ندیدی لاکفش در پی اثر
کے فرستادی و مے بر آسماں   نیکیٔ کز پے نیامد مثل آں
گر مراقب باشی و بیدار تو   ہر دمے بینی جزائے کار تو
گرچہ دیوار افگند سایہ دراز   باز گردد سوئے او آں سایہ باز
ایں جہاں کوہ ست و فعل ما ندا   سوئے ما آید ندا ہا را صدا

گناہ نہیں سمجھتا۔ جزا کو (جو تجھے مل رہی ہے) دیکھ۔ اور غور کر کہ تیرے دل میں کتنی کشاد ہے اور کتنا قبض۔ ہر حالت میں گناہ کی سزا ہے اور کشاد بندگی کی جزا ہے۔ حضور سرورِ کائنات ﷺ پر محض اس وجہ سے عتاب ہوا تھا کہ حضور ﷺ اپنی انگلی کی انگوٹھی گھما رہے تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ تھا، میں نے تجھے بیکاری اور کھیل کے لیے پیدا نہیں کیا۔

افحسبتم انّما خلقنا کم عبثا. (سورۂ مومنون: ع ۶) کیا تم اس خیال میں ہو کہ ہم نے تمہیں بے کار پیدا کر دیا ہے؟

اسی سے قیاس کر کہ تیرا دن گناہ میں گزرتا ہے یا بندگی میں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دُنیا میں مشغول کر دیا۔ اگرچہ یہ امرِ حق تھا اور وہ حق ہی میں مشغول تھے۔ تاہم انہیں کچھ وقت دُنیا میں مشغول کر دیا۔ یہ مصلحت کی بنا پر تھا۔ اور حضرت خضر علیہ السلام کو کلّی اپنے آپ میں مشغول کر دیا۔ اور خود حضور سرورِ کائنات ﷺ کو پہلے بالکل اپنے آپ میں مشغول کر دیا۔ اور بعد میں انہیں حکم دیا کہ دُنیا کو دعوت دے، نصیحت کر، اور اس کی اصلاح کر۔ حضور ﷺ نے آہ وزاری کی کہ یاالٰہی مجھ سے کیا گناہ سرزد ہو گیا، جو مجھے اپنی حضوری سے علیحدہ کر رہے ہو۔ مجھے دُنیا کی ضرورت نہیں۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا، اے محمد ﷺ! بالکل غم نہ کھا۔ تجھے میں نہیں چھوڑ دوں گا کہ تو دُنیا میں مشغول تھا۔ تو عین دُنیا کی مشغولیت میں میرے ساتھ ہو گا۔ تو اس وقت جتنا میرے قریب ہے، دُنیا میں مشغول ہو جانے کے بعد اس سے سرِ مو مجھ سے دور نہ ہو گا۔ بلکہ اتنا ہی قریب رہے گا۔ تو خواہ کوئی کام رہا ہو، مجھ سے عین واصل رہے گا۔

سوال کیا کہ کیا روزِ ازل کے صادر شدہ احکام اور خداوند تعالیٰ کی تقدیر بدل سکتی ہے؟ فرمایا کہ ازل کے دن خداوند تعالیٰ نے جو یہ حکم دیا کہ بدی کا بدلہ بدی اور نیکی کا بدلہ

ہمچنیں تاویل قد جف القلم بہر تحریض است بر شغلِ اہم

نیکی ہوگا، یہ ہرگز تبدیل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ حکیم ہے۔ وہ کیسے کہہ سکتا ہے تو بدی کر، تاکہ اس کا بدلہ تجھے نیک ملے۔ کوئی گندم بو کر جو کاٹے یا جو بو کر گندم کاٹے، یہ کبھی ممکن نہیں ہوا۔ اور سب اولیاء اور انبیاء نے یہی کہا ہے کہ نیکی کی جزا نیکی ہے، اور بدی کا بدلہ بدی ہے:

فمن یعمل مثقال ذرّۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرّۃ شرّاً یرہ. (سورۂ زلزال)

جس نے رائی کے دانہ کے برابر بھی نیکی کی ہے، وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس نے رائی کے دانہ کے برابر بدی کی ہے، وہ اسے دیکھ لے گا۔

اگر تو حکم ازلی سے یہ چاہتا ہے کہ ہم بات کریں اور شرح کر دیں، ہم سے یہ ہرگز نہ ہوگا۔ (معاذ اللہ) اور اگر تو چاہتا ہے کہ نیکی اور بدی کی جزا بڑھ جائے، اور ایسا ہو جائے۔ یعنی تو جتنی نیکی زیادہ کرے، نیکیاں بڑھ جائیں اور جتنا ظلم کرے بدیاں بڑھ جائیں۔ یہ ہو سکتا ہے لیکن اصل حکم تبدیل نہیں ہوگا۔

ایک فصال نے سوال کیا ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شقی انسان سعید بن جاتا ہے۔ اور سعید انسان شقی بن جاتا ہے۔ فرمایا کہ آخر اس شقی انسان نے نیکی کی یا نیک باتیں سوچیں، تو وہ سعید ہوا۔ اور وہ سعید انسان جو شقی ہوا، اس نے بدی کی یا بدی کی باتیں سوچیں تو وہ شقی ہوا۔ اسی طرح ابلیس نے آدم کے حق میں اعتراض کیا تھا کہ:

خلقتنی من نار وخلقتہٗ من طین. (اعراف: ع ۲)

مجھے تُو نے آگ سے پیدا کیا اور اس کو خاک سے۔

اس کے بعد وہ کہ ملائکہ کا استاد تھا، ابدی ملعون ہو گیا اور راندۂ درگاہ ٹھہرا۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ نیکی کا بدلہ نیکی ہے، اور بدی کی جزا بدی ہے۔

سوال کیا کہ کسی شخص نے نذر مانی کہ فلاں دن روزہ رکھے گا۔ اگر وہ اسے توڑ دے تو اس پر کفارہ واجب ہوا یا نہیں؟ فرمایا کہ شافعیؒ مذہب کے ایک قول کے مطابق کفارہ لازم آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نذر کو سوگند سمجھ۔ اور جس نے سوگند کو توڑا، اس پر کفارہ لازم آیا۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نذر بمعنی سوگند نہیں۔ پس کفارہ بھی نہیں اور نذر کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک مطلق اور دوسری مقید۔

مطلق یہ ہے کہ کہے:

علی ان اصوم یوماً. میں کسی دن روزہ رکھنا اپنے اوپر واجب کرتا ہوں۔

اور مقید یہ ہے کہ کہے:

علیّ کذا ان جاء فلان. اگر فلاں شخص آ جائے تو مجھ پر فلاں کام واجب ہو گا۔

کہا کسی شخص کا گدھا گم ہو گیا تھا۔ اس نے تین دن اس نیت سے روزہ رکھا کہ اس کا گدھا مل جائے۔ تین دن کے بعد اسے گدھا مل گیا مگر وہ مرا ہوا تھا۔ اس سے اسے بہت رنج ہوا۔ رنجش میں اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور کہا، ان تین روزوں کے بدلے اگر میں بھی رمضان کے چھ روزے نہ کھا جاؤں تو مرد نہیں۔ تو مجھ سے کچھ نہ لے جائے گا۔

اسباب ایک پردہ ہیں

ایک آدمی نے سوال کیا کہ التحیّات کے کیا معنی ہیں؟ اور الصلوۃ والطیبات کیا ہے؟ جواب میں فرمایا، یعنی یہ کہ پرستشیں، خدمتیں، بندگی اور مراعات مجھ سے نہیں

بجا لائی جاتیں۔ مجھے ان کے لیے فرصت نہیں۔ پس یہ حقیقت ٹھہری کہ طیبات اور تحیات سب خدا ہی کی ہیں۔ یہ میری نہیں، یہ اسی کی ملکیت[1] ہیں۔

جیسا کہ بہار کے موسم میں لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں، صحرا میں نکل آتے ہیں، سفر کرتے ہیں، اور مکان بناتے ہیں۔ یہ سب بہار کی بخشش اور عطا ہے۔ ورنہ یہ سب لوگ جیسا کہ تھے گھروں اور غاروں میں محبوس تھے۔ پس در حقیقت یہ کھیتی باڑی، یہ سیر تماشا اور ناز و نعمت بہار ہی کی ملکیت ہے۔ اور وہی ولی نعمت ہے۔ انسان کی نظر اسباب پر ہوتی ہے۔ اور کاموں کو ان اسباب کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اولیاء پر یہ منکشف ہو چکا ہے کہ اسباب ایک پردہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ یہ پردہ اس لیے ہے کہ مسبب کو نہ دیکھیں اور نہ جانیں، یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص پردہ کے پیچھے سے گفتگو کرے تو لوگ سمجھیں کہ پردہ بات کر رہا ہے۔ اور وہ یہ نہ سمجھیں کہ پردہ مصروفِ کار نہیں بلکہ وہ تو محض ایک حجاب ہے۔ گفتگو کرنے والا پردے سے باہر آ جائے تو سب جان لیں کہ پردہ ایک بہانہ تھا۔ خدا کے اولیاء نے بغیر اسباب کے کام ہوتے بھی دیکھے ہیں۔ اسباب سے بالکل آزاد تھے، پھر بھی کام سر انجام پا گئے۔ جیسے پہاڑ میں سے اونٹ نکل آیا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا سانپ بن گیا۔ اور سنگِ خارہ سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔ اور جیسے حضور سرورِ کائنات ﷺ نے بغیر کسی اوزار کے اشارہ ہی سے چاند کو شق کر دیا۔ اور جیسے حضرت آدم علیہ السلام ماں اور باپ کے بغیر وجود میں آ گئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہو گئے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ گل و گلزار بن گئی۔

---

[1] در تحیات و سلام الصالحین ۔۔۔ مدح جملہ انبیاء آمد دفین
مدحہا شد جملگی آمیختہ ۔۔۔ کوزہا در یک لگن در ریختہ
زانکہ خود ممدوح جز یک بیش نیست ۔۔۔ کیش ہازیں روی جز یک کیش نیست
زانکہ ہر مدحے بنور حق رود ۔۔۔ بر صور و اشخاص عاریت بود
مدحہا جز مستحق را کے کنند ۔۔۔ لیک بر پنداشت گمرہ می شود

اس طرح کے کرشموں کی کوئی حد نہیں۔ پس جب انہیں دیکھا تو سمجھ گئے کہ اسباب محض بہانہ ہیں۔ کارساز کوئی دوسرا ہے۔ اسباب سوائے روپوشی کے اور کچھ نہیں، تاکہ لوگ ان اسباب ہی میں مشغول رہیں۔ زکریا علیہ السلام سے خداوند تعالیٰ نے وعدہ کیا کہ میں تجھے فرزند دوں گا۔ وہ پکار اٹھا کہ میں بوڑھا ہو چکا۔ میری بیوی بوڑھی ہو چکی۔ آلۂ شہوانی کمزور ہو گیا ہے۔ بیوی اس حالت کو پہنچ چکی ہے کہ بچہ اور حمل ہو سکنے کا امکان باقی نہیں رہا۔ اے خدا! ایسی بڑھیا کو کیسے بچہ پیدا ہو گا؟

قال رب انی یکون لی غلام وقد بلغنی الکبر وامراتی عاقر. (سورۂ آلِ عمران : ع ۴)

اس نے عرض کیا، اے خدا! میرے گھر اولاد کیسے ہو گی؟ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔

جواب آیا خبردار زکریا! تو نے پھر سر رشتہ گم کر دیا۔ میں نے سو ہزار مرتبہ بغیر اسباب کے کام کر کے دکھائے ہیں، تو انہیں بھول گیا۔ تو نہیں جانتا کہ اسباب بہانہ ہوتے ہیں۔ میں اس بات پر قادر ہوں کہ اسی لمحہ تیرے دیکھتے ہی دیکھتے تجھ میں سے سو ہزار بیٹے پیدا کر دوں۔ بغیر عورت کے اور بغیر حمل کے۔ بلکہ اگر میں اشارہ کر دوں تو دُنیا میں ایسی خلقت پیدا کر دوں جو پیدائش کے وقت ہی سے تمام کی تمام بالغ اور دانا ہو۔ کیا میں نے تجھے عالمِ ارواح میں بغیر ماں اور باپ کے ہست نہیں کیا۔ تیرے اس وجود میں آنے سے پہلے میں نے تجھ پر الطاف و عنایات کیں۔ تو انہیں کیسے فراموش کر سکتا ہے؟ انبیاء، اولیاء اور نیک و بد خلائق کے احوال کو ان کے مراتب اور جوہر پر قیاس کرنا ہو تو اس کی مثال یہ ہے کہ کافرستان سے غلاموں کو مسلمانوں کے ملک میں لاتے ہیں اور فروخت کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو آئے پانچ سال ہو جاتے ہیں۔ بعض کو دس سال اور بعض کو پندرہ سال بیت جاتے ہیں۔ وہ غلام جو بچپن میں لائے جائیں اور مسلمانوں کے درمیان

رہ کر کئی سال پرورش پائیں اور بوڑھے ہو جائیں، وہ اپنے ملک کے حالات کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ وہاں کی کوئی نشانی انہیں یاد نہیں رہتی۔ اور جو ذرا بڑے ہوتے ہیں، انہیں کچھ کچھ یاد رہتا ہے۔ اور جو زیادہ مضبوط اور بڑے ہوتے ہیں، انہیں بڑا کچھ یاد رہتا ہے۔

بالکل یہی حال حضور باری تعالیٰ میں ارواح کا تھا کہ :

الست بربکم قالوا بلیٰ. (اعراف : ۲۲) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟

عرض کیا کہ ضرور ہیں! ان ارواح کی غذا اور خوراک خدا کا کلام تھا، جو بغیر حرف کے اور بغیر آواز کے تھا۔ جب ان ارواح میں سے بعض کو عالمِ طفلی ہی میں اس دُنیا میں لے آئے۔ اور مدت کے بعد انہوں نے یہاں وہ کلام سنا تو وہ احوال انہیں یاد آئے۔ اور انہوں نے اپنے آپ کو اس کلام سے بیگانہ پایا۔ یہ فریق بہت محجوب ہے کہ کفر اور گمراہی کے گڑھے میں مکمل طور پر گر گیا۔ بعض کو وہ کلام تھوڑا سا یاد آ جاتا ہے۔ وہاں کا جوش اور وہاں کی خواہش ان میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ مومن ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو اس کلام کو سنتے ہیں، تو ان کی نظر میں وہی حالت پیدا ہو جاتی ہے، جو اس قدیم وقت میں تھی۔ ان کے سامنے سے حجاب کلی اٹھ جاتے ہیں۔ اور انہیں وہی وصل میسر آ جاتا ہے۔ اور یہ لوگ انبیاء اور اولیاء ہیں۔

نااہل سے راز کی بات نہ کر

ہم دوستوں کو وصیت کرتے ہیں کہ جب ان کے باطن میں عروسِ معنی چہرہ دکھائے اور اسرار کھلنے لگیں تو خبردار وہ غیروں کو یہ بات نہ بتائیں۔ اور اس کی شرح نہ کریں۔ اور یہ بات جو ہم سے سن رہے ہیں، ہر کسی سے نہ کہتے پھریں۔

لاتعطوا الحکمة لغیر اھلھا فتظلموھا ولاتمنعوھا عن اھلھا فتظلموھم.	حکمت نااہلوں کو نہ دو ورنہ حکمت پر ظلم ہو گا اور اہل سے حکمت کو نہ چھپاؤ، ورنہ ان پر ظلم ہو گا۔

اگر تجھے تیری معشوقہ مل جائے اور وہ تیرے گھر میں چھپی ہو، اور وہ کہے کہ مجھے کسی کو نہ دکھاؤ، کیونکہ میں تمہاری چیز ہوں۔ تو تیرے لیے یہ ہرگز جائز اور مناسب نہیں کہ تو اسے بازار میں پھرائے۔ اور ہر کسی سے کہتا پھرے کہ اس حسینہ کو دیکھئے۔ اگر تو ایسا کرے گا تو یہ بات اس معشوقہ کو ہرگز پسند نہیں آئے گی کہ وہ ان کے پاس جائے، وہ تجھ پر غصہ ہو گی۔ خداوند تعالیٰ نے یہ اسرار کی باتیں ان لوگوں پر حرام کر دی ہیں۔ یہ ایسا ہے جیسے کہ دوزخی لوگ اہلِ بہشت کی منت کریں گے اور کہیں گے، آخر تمہارا احسان اور مروت کہاں ہے؟ خداوند تعالیٰ نے جو انعامات اور بخششیں تم پر کی ہیں، اگر ان میں سے آپ ازراہِ بندہ نوازی خیرات کے طور پر ہمارے آگے بھی ڈال دیں اور ایثار کریں تو کیا ہو جائے گا:

وللارض من کاس الکرام نصیب.	اہلِ کرم کے پیالے میں سے زمین کا بھی حصہ ہوتا ہے۔

ہم اس آتش میں جل رہے ہیں اور پگھل رہے ہیں۔ اگر بہشت کے ان میووں اور آب ہائے زلال میں سے تھوڑا سا ہماری جان پر بھی ڈال دیں تو کیا ہو جائے گا۔

ونادیٰ اصحاب النار اصحاب الجنة ان افیضوا علینا من الماء اومما رزقکم الله قالوا ان الله حرمھما علی الکافرین.	اہلِ دوزخ، جنت والوں کو پکار کر درخواست کریں گے کہ ذرا ہمیں بھی پانی عنایت کرو۔ یا اللہ نے اپنے فضل سے جو رزق تمہیں دے رکھا ہے، اسی میں سے کچھ عنایت کرو۔ اہلِ جنت جواب دیں گے کہ خدا نے یہ نعمتیں

کافروں پر حرام کر دی ہیں۔

اس نعمت کا بیج دُنیا میں تھا۔ چونکہ تم نے اسے وہاں نہ بویا اور نہ اس کی آبیاری کی۔ اور وہ بیج ایمان، صدق اور عملِ صالح تھا۔ یہاں اب تم کیا لو گے؟ اور اگر ہم ازراہِ کرم تمہارے لیے ایثار کر بھی دیں، تو چونکہ خدا نے انہیں تم پر حرام کر دیا ہے، تمہارے حلق جلا دیئے جائیں گے، اور یہ نعمتیں تمہارے گلے سے نیچے نہیں اتر سکیں گی۔ اور تم انہیں تھیلی میں ڈالو گے تو تھیلی پھٹ جائے گی اور یہ گر جائیں گی۔

منافقوں اور غیروں کی ایک جماعت حضور سرورِ کائنات ﷺ کے پاس آئی۔ صحابہ کو شرحِ اسرار تھی۔ انہوں نے حضور سرورِ کائنات ﷺ کی مدح کی۔ حضور نے منبر پر کھڑے ہو کر صحابہ سے فرمایا۔ خمروا آنیتکم (بخاری، باب خمس من الدواب فواسق) اپنے برتنوں کو ڈھانک لو۔ یعنی اپنی صراحیوں، پیالوں، دیگوں اور مٹکوں کے منہ ڈھانک لو۔ اور انہیں چھپالو کہ ایک قسم کے جانور پلید اور زہرناک ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے کوزوں میں گر جائیں اور نادانی سے ان کوزوں میں سے پانی پی لیں۔ اور تمہارا نقصان ہو۔ حضور ﷺ نے اس طرح اصحاب سے فرمایا کہ حکمت کو اغیار سے پوشیدہ رکھو۔ اور منہ اور زبان کو غیروں کے سامنے نہ کھولو۔ کیونکہ یہ چوہے ہیں۔ یہ لوگ اس حکمت اور نعمت کے قابل نہیں۔

فرمایا کہ وہ امیر جو میرے پاس سے اٹھ کر باہر گیا ہے، اگرچہ اس نے ہماری بات تفصیل کے ساتھ نہیں سمجھی۔ مگر اجمال کے طور پر وہ اتنا سمجھ گیا ہے کہ ہم اسے حق کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کی نیاز مندی اس کے سر ہلانے اور اس کی مہر و محبت کو ہم سمجھتے ہیں۔ آخر وہ دہقان جو کسی شہر میں آتا ہے، نماز کی اذان سنتا ہے۔ اگرچہ وہ اذان کو تفصیل کے ساتھ نہیں جانتا مگر مقصد کو سمجھ لیتا ہے۔

عشق اور شوق

فرمایا کہ ہر ایک محبوب حسین ہے، مگر اس کے برعکس صحیح نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر وہ شخص جو حسین ہے، محبوب بھی ہو۔ حسن محبوبیت کا جزو ہے۔ اور محبوبیت اصل ہے۔ جب محبوبیت موجود ہو تو حسن موجود ہوتا ہے۔ کسی چیز کا جزو اپنے کل سے جدا نہیں۔ وہ کُل کے تابع ہے۔ مجنوں کے زمانہ میں لیلیٰ سے زیادہ خوبصورت، حسین موجود تھے۔ مگر وہ مجنوں کے محبوب نہ تھے۔ لوگوں[1] نے ایک مرتبہ مجنوں سے کہا، ہم لیلیٰ سے زیادہ خوبصورت حسین تیرے پاس لاتے ہیں۔ مجنوں نے جواب دیا، میں لیلیٰ کو اس کی صورت کی وجہ سے دوست نہیں رکھتا۔ لیلیٰ صورت نہیں ہے۔ لیلیٰ میرے ہاتھوں میں ایک جام ہے۔ میں اس جام سے شراب پیتا ہوں اور تمہاری نظر پیالہ پر ہے۔ تم شراب سے آگاہ نہیں ہو۔ اگر میرا پیالہ سونے کا بنا ہوا اور جواہرات سے مرصع ہو، مگر اس میں سرکہ بھرا ہوا ہو، یا اس میں شراب کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہو تو وہ پیالہ میرے کس کام کا؟ ہاں وہ پیالہ جو خواہ پرانا اور ٹوٹا ہوا ہو مگر اس میں شراب ہو، اس زرین پیالہ بلکہ ایسے سو زرین پیالوں سے بہتر ہے۔ عشق اور شوق چاہیے، تاکہ تو شراب اور پیالہ کو علیحدہ علیحدہ پہچان سکے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک بھوکے آدمی نے دس دن کوئی چیز نہیں کھائی۔ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرے آدمی نے دن میں ہر روز پانچ پانچ مرتبہ کھانا کھایا۔ اب دونوں کی نظر ایک روٹی پر پڑی۔ سیر آدمی کو وہ روٹی محض ایک "نان" کی شکل ہی میں نظر

---

[1] ابلہاں گفتند مجنوں را زجہل   حسن لیلیٰ نیست چنداں ہست سہل
بہتر از وے صد ہزاراں دلربا   ہست ہمچوں ماہ در شہرائے کیا
گفت صورت کوزہ است و حسن مے   مے خدائم میدہد از ظرف وے
مرشما را سرکہ داد از کوزہ اش   تانباشد عشق او تا گوش کن
(مثنوی مولانا روم)

آئی۔ مگر بھوکے آدمی نے اسے "جان" سمجھا۔ پس یہ نان پیالہ کی طرح ہے اور اس کی لذت پیالہ میں پڑی ہوئی شراب جیسی ہے۔ اس شراب کو نظرِ اشتہا و شوق کے بغیر نہیں دیکھا جاسکتا۔ تو اشتہا اور شوق حاصل کر تاکہ تو صورت بیں نہ رہے۔ اور کون و مکان میں تجھے معشوق ہی معشوق نظر آئے۔ دُنیا کے لوگ پیالوں کی طرح ہیں۔ اور یہ علوم و فنون اور عقل و دانش پیالے کے نقوش ہیں۔ تو نہیں دیکھتا کہ جب پیالہ ٹوٹ جاتا ہے تو وہ نقوش نہیں رہتے۔ پس کام کی چیز وہ شراب ہے، جو ان پیالوں کے قالب میں ہے۔ اور جو شخص شراب پیتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ الباقیات الصالحات، باقی رہنے والے اعمالِ صالح ہی ہیں۔

مسائل کے پیشِ نظر دو باتیں ہونی چاہئیں، ایک یہ کہ اسے پورا یقین ہو کہ میں جو کہتا ہوں اس میں خاطی ہوں۔ صحیح بات اس کے علاوہ ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ جو سوچتا ہے، سمجھے کہ اس سے بہتر اور اس سے بالا کوئی حکمت موجود ہے، جسے میں نہیں جانتا۔ پس ہم نے سمجھ لیا کہ :

السوال نصف العلم۔ سوال فی نفسہٖ آدھا علم ہے۔

اسی وجہ سے کہا گیا ہے۔

ہر شخص دوسرے آدمی کی طرف رجوع حق کی غرض سے کرتا ہے۔ سب کا مطلوب حق ہی ہے۔ طالبِ حق اسی اُمید میں اپنی عمر صرف کر دیتا ہے۔ مگر ان کے درمیان تمیز کرنے والا چاہیے، جو یہ جان لے کہ ان میں مصیب کون ہے۔ اور اس پر جو زخم کا نشان ہے وہ بادشاہ کے چوگان کا ہے، تاکہ یک گو اور موحد ہو۔ پانی میں غرق وہ ہے جس پر پانی تصرف رکھتا ہے۔ اور اسے پانی پر تصرف حاصل نہیں۔ تیراک انسان اور غرق ہو جانے والا آدمی دونوں پانی میں ہیں۔ مگر غرق ہونے والے کو پانی بہالے جاتا ہے اور وہ

پانی کا محمول ہے۔ اس کے مقابلہ میں تیراک اپنی قوت کا حامل ہے۔ اور آپ اپنے اختیار میں ہے۔ پس ہر حرکت اور ہر فعل اور قول جو غرق ہونے والے سے صادر ہوتا ہے، پانی کی طرف سے ہے، اس کا اپنا نہیں۔ وہ درمیان میں محض ایک بہانہ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ تو دیوار سے بات سنے۔ تو جانتا ہے کہ بات دیوار نے نہیں کی۔ کوئی ہے جس نے دیوار کو بولنے پر آمادہ کیا ہے۔ اسی طرح اولیاء موت کے آنے سے پہلے ہی مردہ ہیں۔ اور در و دیوار کا حکم بجالائے ہوئے ہیں۔ ان میں سرِ مو زندگی باقی نہیں رہی۔ دستِ قدرت میں یہ سپر کی مانند ہیں۔ سپر کی حرکت سپر کی مرضی سے نہیں ہوتی۔ اور انا الحق کے معنی یہی ہوتے ہیں۔ سپر کہتی ہے، میں درمیان میں نہیں ہوں۔ حرکت خدا کے ہاتھ سے ہے۔ اس سپر کو خدا دیکھتا ہے۔ اور خدا سے پنجہ آزمائی نہ کرو۔ کیونکہ جنہوں نے اس سپر کو زخمی کیا ہے، درحقیقت انہوں نے خدا سے جنگ کی ہے، اور اپنے آپ کو خدا پر دے مارا ہے۔ تو سنتا ہے کہ آدم سے لے کر آج تک ان پر کیا گزری۔ فرعون، شدّاد، نمرود، قومِ لوط اور ثمود سے لے کر اس وقت تک جس کی کوئی انتہا نہیں۔ وہ ایسی سپر قیامت تک موجود ہے۔ ایک دَور کے بعد دوسرے دَور میں۔ بعض دفعہ یہ سپر انبیاء کی صورت میں اور بعض دفعہ اولیاء کی شکل میں ہوتی ہے۔ تاکہ متقی لوگ شقی القلب لوگوں سے ممتاز ہوں اور اولیاء دشمنوں سے۔ پس ہر ولی خلقت کے لیے حجت ہے۔ خلقت اس سے جس قدر تعلق پیدا کراتی ہے۔ اس کے مطابق خلقت کا مرتبہ اور مقام متعین ہوتا ہے۔ اگر خلقت اس سے دشمنی کرے تو گویا اس نے وہ دشمنی خدا سے کی۔ اور اگر وہ اس سے دوستی کرے، تو اس کی یہ دوستی خدا سے ہو گی کیونکہ:

من راٰہ فقد رانی ومن قصدہ فقد قصدنی۔ جس نے اسے دیکھا، مجھے دیکھ لیا۔ جس نے اس کا قصد کیا، اس نے میرا قصد کیا۔

خدا کے بندے اللہ کے رازوں کے محرم ہیں۔ جیسا کہ خداوند تعالیٰ کے خادموں نے ہستی کی تمام رگوں، شہوت اور خیانت کے بیجوں کو مکمل طور پر کاٹ ڈالا ہوا ہے اور پاک کر دیا ہے۔ تو بالضرور وہ ایک دُنیا کے مخدوم ہو گئے ہیں اور محرمِ اسرار بن چکے ہیں:

لایمسّہٗ الا المطهرون. پاک لوگوں کے سوا اسے کوئی ہاتھ نہ لگائے۔

فرمایا اگر بزرگوں کے مزار کی طرف پیٹھ پھیر رکھی ہے۔ لیکن یہ انکار اور غفلت کی وجہ سے نہیں تو سمجھو کہ ساری توجہ انہی کی روح کی طرف ہے۔ اس لیے کہ یہ بات جو میرے منہ سے نکلتی ہے، یہ انہی کی طاقت سے ہے۔ اگر ان کے جسم کی طرف پیٹھ پھیر لیں۔ اور ان کی جان کی طرف منہ کر لیں تو اس میں نقصان نہیں۔

شاعری سے بیزاری

مجھے عادت ہے، میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے کوئی دل آزردہ ہو۔ یہ جو ایک گروہ نے سماع میں میرے سامنے گانا شروع کر دیا۔ اور بعض دوستوں نے اسے منع کیا، تو مجھے یہ بات پسند نہیں آئی۔ میں سو دفعہ کہہ چکا ہوں کہ میری خاطر کسی سے کچھ نہ کہو۔ میں اسی سے راضی ہوں۔ میں اس حد تک دلداری کرتا ہوں کہ وہ دوست جو میرے پاس آتے ہیں، اس خوف سے کہ وہ ملول نہ ہوں، میں شعر کہتا ہوں، تاکہ ان کی توجہ لگی رہے۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں شعر۔ خدا کی قسم میں شعر سے بیزار ہوں۔ اس سے بری چیز میرے نزدیک کوئی نہیں[1]

---

[1] شعر چہ باشد بر من تاکہ ازاں لاف زنم — ہست مرا فنِ دگر غیر فنونِ شعرا
شعر چو اریست سیہ من پس آں پردہ چو — ار سیہ را تو مخواں ماہِ منور بسما

(بقیہ اگلے صفحے پر)

یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی شخص مہمان کی اشتہا کے لیے کیسہ میں ہاتھ ڈالے۔ اسے ہلائے اور دھوئے۔ چونکہ مہمان کی اشتہا کسبہ سے ہے، اس لیے یہ لازم ہوا۔ آدمی دیکھتا ہے کہ فلاں شہر میں خلقت کو کونسا سامان چاہیے۔ اور کس سامان کے خریدار موجود ہیں۔ اس ضرورت کے مطابق ہی آدمی سامان خریدتا اور بیچتا ہے۔ خواہ وہ سامان گھٹیا قسم کی متاع ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے علوم کی تحصیل کی۔ اور اس میں تکالیف اٹھائیں، تاکہ فضلا، محققین، زیرک اور دقیقہ رس لوگ میرے پاس آئیں۔ اور میں انہیں نفیس اور نایاب اشیاء پیش کروں۔ خود خدا نے یہی چاہا۔ اس نے سب علوم کو یہاں جمع کر دیا۔ اور ان سے متعلق تکالیف بھی یہاں لے آیا تاکہ میں اس کام میں مشغول ہو جاؤں۔

میں کیا کر سکتا تھا۔ میرے ملک اور میری قوم میں شاعری سے زیادہ باعثِ ننگ کوئی کام نہ تھا۔ اگر ہم اس ملک میں رہتے تو وہاں کی طبائع کے مطابق زندگی بسر کرتے، اور وہی کچھ کرتے، جو وہاں کے لوگ چاہتے۔ جیسے درس دینا، کتابیں تصنیف کرنا، ذکر و وعظ کرنا اور زہد و عمل کو ظاہراً طور پر بروئے کار لانا۔

عِلم اور عمل

میر پروانہ نے مجھ سے کہا، اصل چیز علم ہے۔ میں نے جواب دیا، اہلِ علم اور طالبِ عمل کہاں ہیں، تاکہ میں انہیں عمل کر کے دکھاؤں۔ تُو ابھی باتیں سننے کا طالب ہے۔ تُو کان لگائے ہوئے ہے کہ باتیں سنے۔ اور اگر میں باتیں نہ کروں، تو تُو ملول ہو جاتا

(بقیہ) چوں باشدَم سعادت یابم زخود فراغت — ایں گلخن و گلشن ارزاں و خوار ماند
من پیش ازیں میخواستم گفتار خود را مشتری — اکنوں ہمی خواہم کہ تو از گفت خویشم واخری
(غزلیاتِ مولانا روم)

ہے۔ تُو عمل کا طالب بن تاکہ میں تجھے کچھ دِکھاؤں۔ مجھے دُنیا میں ایسے مرد کی ضرورت ہے، جسے میں عمل دکھاسکوں۔ کردار کا خریدار مجھے نہیں ملتا۔ گفتار کا خریدار مل جاتا ہے۔ میں گفتار میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ تُو عمل کو کیا جانے، جبکہ تو عامل نہیں۔ عمل کو عمل سے سمجھا جاسکتا ہے اور علم کو علم سے۔ صورت کو صورت سے اور معنی کو معنی سے۔ جب یہ راستہ ہی خالی ہے اور اس میں کوئی راہ رو نہیں، تو اگر ہم اس راہ گزر میں ہیں اور عامل ہیں تو اس سے کیا، ہمیں کون دیکھے گا۔ آخر نماز روزہ تو عمل نہیں، یہ تو عمل کی ظاہری صورت ہے۔ عمل روحانی ہے اور وہ باطن میں ہے۔ حضرت آدمؑ کے زمانہ سے لے کر حضور سرورِ کائنات ﷺ کے وقت تک نماز روزہ موجودہ صورت میں نہ تھے اور عمل تھا۔ پس یہ عمل کی صورت ہوئی۔ عمل دراصل روحانی ہے اور وہ انسان کے باطن میں ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ تو کہتا ہے، دوانے اپنا عمل کیا۔ اب یہاں عمل سے مراد عمل کی صورت نہیں۔ اس سے معنویت مراد ہے۔ پھر کہہ دیتے ہیں، وہ آدمی فلاں شہر میں عامل ہے۔ وہ کسی چیز کی صورت نہیں دیکھتے۔ جو کام اس سے تعلق رکھتے ہیں، انہیں اس عامل کے واسطہ سے پکارے جاتے ہیں۔ پس عمل یہ نہیں ہے جو لوگوں نے سمجھا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عمل ایک ظاہرا چیز ہے۔ اگر منافق آدمی اس صورتِ عمل سے کہیں کام لے تو یہ اس کے لیے فائدہ رکھتا ہے۔ جب اس میں صدق اور ایمان کی معنویت نہیں تو یہ سب چیزیں جنہیں تو عمل کہتا ہے، محض گفتار اور قول ہیں تجھے گفتار اور قول کی خبر نہیں۔

تو اسے خوار دیکھتا ہے۔ گفتار درختِ عمل کا پھل ہے۔ کیونکہ قول عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے دُنیا کو قول ہی سے پیدا کیا تھا۔ کہا:

کن فیکون۔ ہو جا، پس ہو گیا۔

اور ایمان دل میں ہے۔ اگر اس کا اظہار قول سے نہ ہو تو بے سود ہے۔ اور نماز کہ

فعل ہے، اگر تو اس میں قرآن نہ پڑھے تو درست نہیں۔ اس وقت جب کہ تو کہتا ہے،
قول معتبر نہیں ہے، تو یہ بات بھی تو قول ہی سے کہتا ہے۔
ایک شخص نے سوال کیا کہ جب ہم نیکی اور عملِ صالح کرتے ہیں، اگر ہم خدا
سے امیدوار ہوں اور خیر کی توقع کریں، تو اس کی جزا میں ہمارے لیے زیان ہے یا نہیں؟
فرمایا خدا کی قسم امید رکھنی چاہیے اور ایمان، یہی خوف و رجا ہے۔ ایک آدمی نے مجھ سے
دریافت کیا کہ خود رجا بہت اچھی ہے۔ خوف کیا ہے؟ میں نے جواب دیا، تو مجھے رجا کے
بغیر خوف دِکھادے، یا خوف کے بغیر رجا۔ جب وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں تو یہ
سوال کیسے پوچھتا ہے؟ مثال کے طور پر کسی نے گندم بوئی۔ وہ امید رکھتا ہے کہ اس سے
بے شک گندم ہی پیدا ہو گی۔ مگر اس سلسلہ میں وہ خائف بھی ہے کہ ایسا نہ ہو کوئی مانع اور
آفت پیش آجائے۔ پس معلوم ہوا کہ امید بغیر خوف کے نہیں۔ خوف کو امید کے بغیر اور
امید کو خوف کے بغیر ہرگز تصور نہیں کیا جس سکتا۔ اب اگر کوئی امیدوار ہو، اور جزا اور
احسان کی توقع رکھتا ہو تو وہ اس کام میں بہت سرگرم اور کوشاں ہو گا۔ یہ توقع اس کے پر
ہیں۔ پر جتنے مضبوط ہوں گے، اتنی ہی پرواز زیادہ ہو گی۔ اور اگر وہ ناامید ہو تو سست اور کاہل
ہو جائے گا، اور اس سے کوئی نیکی اور بھلائی نہیں ہو سکے گی۔ یہ ایسا ہی ہے کہ بیمار آدمی
کڑوی دوا پی لیتا ہے اور دس شیریں لذّتوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ اگر اسے صحت کی امید نہ ہو تو
اس سے یہ کیسے برداشت ہو سکے۔ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ انسان حیوانیت اور گویائی سے
مرکب ہے۔ جیسے اس میں حیوانیت دائمی ہے، اور اس سے جدا نہیں، گویائی کا معاملہ بھی
ایسا ہی ہے، وہ اس میں دائمی ہے۔ اگر وہ ظاہرا بات نہیں کرتا، تو باطن میں بات کر لیتا ہے۔
وہ ہمیشہ ناطق ہے۔ اس کی مثال سیلاب جیسی ہے کہ اس میں کیچڑ ملا ہوتا ہے۔ صاف پانی
اس کا نطق ہے، اور کیچڑ اس کی حیوانیت ہے۔ لیکن کیچڑ اس میں عارضی ہے۔ کیا تو نہیں

دیکھتا کہ یہ کیچڑ اور اجساد رخصت ہو جاتے ہیں اور سڑ گل جاتے ہیں، مگر اس کا نطق و حکایت اور اس کے علوم، نیک وبد کی دست بُرد سے بچ رہتے ہیں۔

اہلِ دل کُل ہے۔ جب تُو نے اسے دیکھ لیا، سب کو دیکھ لیا۔ کیونکہ :

الصید کلہٗ فی جوف الفراء.　　　ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔

دُنیا کی سب مخلوقات اجزا ہیں اور وہ کُل ہے۔

ترجمہ شعر : سب نیک وبد درویش کا جز ہیں، جو ایسا نہیں، وہ درویش نہیں ہے۔ اب جبکہ تُو نے اسے دیکھ لیا جو کُل ہے، تُو نے قطعی طور پر سارے عالم کو دیکھ لیا۔ اسے دیکھنے کے بعد تُو جسے دیکھے گا گویا دوبارہ دیکھے گا۔ اور اقوال میں اس کا قول قولِ کُل ہے۔ جب تُو نے اس کا قول سن لیا، اس کے بعد تُو جو قول سنے گا، وہ قولِ مکرّر ہو گا۔

ترجمہ شعر : جس نے اسے منزل میں دیکھا گویا کہ اس نے ہر انسان اور ہر مکان کو دیکھ لیا۔

ترجمہ شعر : اے نامۂ الٰہی کے نسخہ تُو ہی تُو ہے۔ اور اے جمالِ شاہی کے آئینہ! تو ہی تو ہے۔

ترجمہ شعر : جو کچھ دُنیا میں ہے، وہ تجھ سے باہر نہیں۔ تُو جو کچھ چاہتا ہے، اپنے آپ ہی میں تلاش کر۔

عقل کا اثر

نائب نے کہا، اس سے قبل کافر بُت کو پوجتے اور سجدہ کرتے رہے ہیں۔ اس

زمانہ میں ہم یہی کرتے ہیں۔ یہ کیا کہ ہم جاتے ہیں اور مغلوں کے سامنے سجدۂ تعظیم کرتے ہیں اور ہم اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ اور ایسے ہی حرص و ہوا، کینہ، حسد کے کئی بت ہم اپنے باطن میں بھی رکھتے ہیں۔ ہم ان سب کے تابع ہیں۔ پس ظاہر اور باطن میں ہم وہی کام کرتے ہیں، پھر اپنے آپ کو مسلمان بھی سمجھتے ہیں۔

فرمایا، مگر یہاں دوسری بات ہے۔ جب تمہاری طبیعت میں یہ آتا ہے کہ یہ بد اور ناپسندیدہ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے دل کی آنکھ نے اس بے مثال اور عظیم چیز کو دیکھا ہے۔ یہی اسے زشت اور قبیح دکھاتی ہے۔ کھاری پانی اسی شخص کو کھاری معلوم ہوتا ہے، جس نے شیریں پانی پیا ہو:

وبضدها تبیّن الاشیاء. ضد سے چیزوں کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔

پس خداوند تعالیٰ نے تمہاری روح میں ایمان کا نور رکھ دیا ہے۔ یہی کاموں کو زشت دکھاتا ہے، خوب کے مقابلہ میں زشت ظاہر کرتا ہے۔ چونکہ دوسرے لوگوں میں یہ درد موجود نہیں، وہ جس حال میں ہیں خوش ہیں۔ وہ کہتے ہیں خود خداوند تعالیٰ کا یہ کام ہے کہ وہ تمہیں وہ کچھ دے جو تمہیں مطلوب ہے اور تمہاری ہمت تمہیں جتنی دور لے جا سکے، وہیں تک جاؤ گے:

الطیر یطیر بجناحیہ والمؤمن یطیر بھمتہٖ. پرندہ اپنے بازوؤں سے اڑتا ہے اور مومن اپنی ہمت سے۔

خلقت کی تین اصناف ہیں۔ بعض ملائکہ ہیں کہ یہ عقل محض ہیں۔ ان کی فطرت میں عبادت، بندگی اور ذکر ہے۔ یہی ان کی خوراک ہے اور اسی سے وہ زندہ ہیں۔ ان کی مثال پانی کی مچھلی کی سی ہے کہ اس کی زندگی پانی ہی سے ہے۔ اس کا اوڑھنا بچھونا پانی

ہے۔ پانی اس کے لیے تکلیف کا باعث نہیں۔ یہ صنف شہوت سے معرا ہے، پاک ہے۔ اگر اسے شہوت نہیں آتی۔ اور نفسانی خواہش نہیں ہوتی، تو چونکہ وہ اس سے پاک ہے۔ یہ اس کی کوئی نیکی نہیں۔ اسے کوئی مجاہدہ نہیں کرنا پڑتا۔ اور اگر وہ بندگی بجا لاتا ہے تو اسے شمار میں نہیں لایا جاتا، کیونکہ اس کی فطرت ہی یہی ہے۔ وہ اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ دوسری صنف جانور ہیں کہ ان میں محض شہوت ہے، عقل انہیں نہیں روکتی۔ انہیں اس مسکین آدمی کی طرح تکلیف نہیں پہنچتی جو عقل اور شہوت سے مرکب ہے، جس کا نصف فرشتہ ہے اور نصف حیوان۔ نصف سانپ ہے اور نصف مچھلی، جسے مچھلی پانی کی طرف کھینچتی ہے اور سانپ خاک کی طرف، جو کش مکش میں ہے اور جنگ کر رہا ہے۔

من[۱] غلب عقلا شهوته فهو اعلىٰ من الملائكة ومن غلب شهوتهٗ عقلا فهو ادنیٰ من البهائم.	جس نے اپنی عقل کو شہوت پر غالب کیا، وہ فرشتوں سے بھی برتر ہوا۔ اور جس نے اپنی شہوت کو عقل پر غالب کیا، وہ جانوروں سے بھی بدتر ہوا۔

ترجمہ شعر: فرشتہ علم سے آزاد ہوا اور جانور جہالت سے۔ آدم زاد ان دو کی جنگ میں رہا۔

اب بعض آدمیوں نے عقل کی اتنی متابعت کی کہ وہ کلی طور پر فرشتہ بن گئے اور نور محض ہو گئے۔ یہ اولیاء اور انبیاء ہیں، یہ خوف و رجا سے آزاد ہوئے۔

لاخوف علیهم ولاهم یحزنون.	نہ انہیں خوف ہے اور نہ وہ محزون ہوتے ہیں۔

۱۔ یہ ملفوظات حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے ہیں۔ مثنوی مولانا روم میں اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے:

آدمی زادہ طرفہ معجونیست — از فرشتہ سرشتہ و زحیواں
گر بدیں میل می کند کم ازیں — ور بداں میل می کند بہ از آں

یہاں تک کہ وہ کلی طور پر عقل کا حکم ماننے لگے۔ بعض کی عقل پر شہوت غالب آگئی اور بعض عقل اور شہوت کے نزاع میں رہے۔ یہ وہ گروہ ہے جس کے اندر رنج، درد، آہ و فغاں اور تحسر پیدا ہو چکا ہے۔ اور یہ لوگ اپنی زندگی سے راضی نہیں ہیں۔ یہ مومن ہیں۔ اولیاء ان کے منتظر ہیں کہ وہ ان مومنوں کو اپنی اولیائی کی منزل پر پہنچائیں اور اپنے جیسا بنالیں۔ ادھر شیاطین بھی ان کے منتظر ہیں کہ انھیں اسفل السافلین بنالیں۔ شیاطین انھیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

ترجمہ شعر: ہم چاہتے ہیں اور دوسرے بھی چاہتے ہیں۔ دیکھئے قسمت کس کا ساتھ دیتی ہے اور نصیب کس کی مدد کرتا ہے۔

سورۃ النصر کی تفسیر

اذا جاء نصر الله۔ جب خدا کی نصرت آئی۔

ظاہر بین مفسر اس کی تفسیر یوں کرتے ہیں کہ حضور سرور کائنات ﷺ اتنی ہمت رکھتے تھے کہ ساری دُنیا کو مسلمان بنالیں اور اپنے خدا کے راستہ پر لے آئیں۔ آپؐ نے جب اپنی وفات قریب دیکھی تو کہا۔ آہ! کہ میں زندہ نہ رہا کہ دُنیا کو دعوت دیتا۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا غم نہ کھا، جس لحہ تُو گزر گیا۔ جن ملکوں اور جن شہروں کو تُو نے لشکر اور تلوار سے فتح کیا۔ میں ان سب کو بغیر لشکر کے مطیع اور مومن بنادوں گا۔ اور اس کی نشانی یہ ہے کہ وفات کے آخر پر تو دیکھے گا کہ خلقت ہر دروازہ سے آتی ہے۔ اور گروہ در گروہ مسلمان ہوتی جاتی ہے۔ جب تو یہ نشان دیکھے تو جان لے کہ تیرے سفر آخرت کا وقت آپہنچا۔ اب تسبیح پڑھ اور استغفار کر کہ تو وہاں آجائے گا۔

لیکن محقق کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی سمجھتا ہے، وہ اپنے عمل اور جدوجہد سے اوصافِ بد کو دُور کر لے گا۔ جب وہ بہت مجاہدہ کرتا ہے اور اپنی قوتوں اور اوزاروں کو استعمال میں لانے کے بعد مایوس ہو جاتا ہے تو خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ تو نے سمجھا کہ وہ تیری قوتِ فعل اور عمل سے ہو جائے گا۔ یہ ایک سنت ہے جو میں نے بنائی ہے۔ یعنی یہ کہ جو کچھ تیرے پاس ہے، وہ میرے راستہ میں خرچ کر۔ اس کے بعد اس بے پایاں راہ سے ہماری بخشش پہنچتی ہے۔ میں تجھے فرماتا ہوں کہ ان کمزور دست وپا سے چل پھر۔ ہمیں معلوم ہے کہ ان کمزور پاؤں سے تجھ سے یہ راستہ نہیں کٹے گا۔ بلکہ سو ہزار سال میں اس راستہ کی ایک منزل بھی تجھ سے قطع نہیں ہو سکتی۔ سوائے اس کے کہ جب تو اس راستہ پر چلے، تیرے پاؤں جواب دے جائیں، تُو گر پڑے۔ اور تجھ میں کوئی طاقت چلنے کے لیے باقی نہ رہے۔ اس کے بعد خداوند تعالیٰ تجھے اٹھا لے، جس طرح بچہ کو جب وہ شیر خوار[۱] ہو گود میں اٹھا لیتے ہیں، جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو اسے گود سے اتار دیتے ہیں تاکہ وہ چلے۔ اس وقت جبکہ تو قوتیں رکھتا تھا اور مجاہدات کرتا تھا۔ ہم کبھی کبھی تیری بیداری اور نیند میں تجھے اپنا لطف و کرم دکھا دیتے، تاکہ ہماری طلب میں تجھے طاقت حاصل رہے اور تُو امیدوار رہے۔ اب جبکہ تیرے قواء نہیں رہے، تیرے اوزار نہیں رہے۔ تو ہمارے الطاف، بخششیں اور عنایتیں دیکھ کہ کس طرح فوج در فوج تیرے پاس آتی ہیں۔ تُو نے اپنی سو ہزار کوشش سے ان کا ذرّہ بھی نہ دیکھا تھا۔

نسبّح بحمد ربّک واستغفرہ.   پس اپنے رب کی حمد سے تسبیح کر اور اس سے استغفار کر۔

---

[۱] طفل تا گیرا و تا پویا نبود   مرکبش جز شانۂ بابا نبود
چوں فضول گشت و دست و پا نمود   در عنا افتاد و در کور و کبود
(مثنوی مولانا روم)

اس فکر اور سمجھ پر استغفار پڑھ جو تجھے تھی اور جس سے تو سمجھتا تھا کہ تو اپنے ہاتھ پاؤں سے وہ کام کرے گا۔ اور تو نے یہ نہ دیکھا کہ سب کچھ مجھ سے ہے۔ لیکن اب جبکہ تو نے دیکھ لیا ہے کہ سب کچھ مجھ سے ہے تو استغفار کر۔

انهٗ کان توابا. وہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔

دو قسم کی دوستی

ہم امیر کو دُنیا اور اس کے مرتبہ، علم اور اس کے عمل کی وجہ سے دوست نہیں رکھتے۔ دوسرے لوگ اسے ان وجوہ کی بناء پر دوست رکھتے ہیں، کیونکہ وہ امیر کا منہ نہیں دیکھتے، امیر کی پیٹھ کو دیکھتے ہیں۔ امیر آئینہ کی طرح ہے، اور یہ صفات قیمتی موتیوں کی طرح اور سونے کی طرح ہیں، جو آئینے کی پشت پر لگا ہوا ہے۔ وہ لوگ جو سونے کے عاشق ہیں اور موتیوں کے عاشق ہیں، ان کی نظر آئینہ کی پشت پر ہے اور جو آئینہ کے عاشق ہیں، ان کی نظر موتیوں اور سونے پر نہیں۔ وہ اپنی نظر آئینہ پر جمائے ہوئے ہیں۔ اور آئینہ کو محض اس کے آئینہ ہونے کی وجہ سے دوست رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ آئینہ میں اپنا حسن دیکھتے ہیں۔ آئینہ سے وہ ملول نہیں ہوتے۔ لیکن وہ جن کا چہرہ بد صورت اور عیب دار ہے، وہ آئینہ میں زشتی دیکھتا ہے۔ وہ جلدی سے آئینہ کو پھیر دیتا ہے۔ اور ان جواہرات کا طالب ہوتا ہے۔ اب آئینہ کی پشت پر ہزار رنگ کے نقوش بناتے ہیں۔ اور جواہرات ٹکاتے ہیں۔ اس سے آئینہ کے چہرے کا کیا بگڑتا ہے؟ اب خداوند تعالیٰ نے حیوانیت اور انسانیت کو مرکب کیا ہے تاکہ دونوں ظاہر ہوں کہ :

وبضدها تتبین الاشیاء. ضد سے اشیاء میں فرق کیا جاتا ہے۔

کسی چیز کی تعریف اس کی ضد کے بغیر ممکن نہیں۔ اور خداوند تعالیٰ کی ضد نہیں، فرماتا ہے:

کنتُ[1] کنزاً مخفیاً فاجبت بان اعراف۔ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے واجب سمجھا کہ پہچانا جاؤں۔

پس یہ عالم پیدا کیا جو ظلمت ہے، تاکہ اس کا نور ظاہر ہو۔ اس طرح اس نے اولیاء کو پیدا کیا کہ:

اخرج بصفاتی الیٰ خلقی۔ میری صفات کو لے کر میری مخلوق کی طرف آ۔

اور یہ خدا کے نور کے مظہر ہیں، تاکہ دشمن سے دوست جدا کیا جائے۔ اور بیگانہ سے یگانہ ممتاز کیا جائے۔ معنی کے لحاظ سے اس کیفیت کی کوئی ضد نہیں ہے۔ سوائے ظاہری صورت کے، جس طرح کے آدمؑ کے مقابلہ میں ابلیس، موسیٰؑ کے مقابلہ میں فرعون، ابراہیمؑ کے مقابلہ میں نمرود اور حضور سرورِ کائنات ﷺ کے مقابلہ میں ابو جہل۔ پس اولیاء سے خدا کی ضد پیدا ہوتی ہے، اگرچہ معنی میں وہ ضد[2] نہیں رکھتا۔ اس سے جتنی

---

[1] گنج مخفی بُد ز پُرے چاک کرد — خاک را تاباں تر از افلاک کرد
کنت کنزا رحمۃ مخفیۃ — فابتعثت امۃ مہدیۃ
کنت کنزا گفت مخفیا شنو — جوہر خود گم مکن اظہار شو
گر بغرد بحر غرہ ش کف شود — جوش احببت لان اعرف شود

[2] چوں مراد و حکم یزداں غفور — بود در قدمت تجلی و ظہور
بے ز ضدے ضد را نتواں نمود — واں شہِ بے مثل را ضدے نبود
پس خلیفہ ساخت صاحب سینۂ — تا بود شاہیش را آئینۂ
پس صفائے بے حدودش داد او — وانگہ از ظلمت ضدش بنہاد او
دو علم افراخت اسپید و سیاہ — آں یکے آدم دگر ابلیس راہ
درمیان آں دو لشکر گہ زفت — چالش و پیکار آنچہ رفت رفت

(بقیہ اگلے صفحے پر)

دشمنی اور ضد دکھاتے ہیں، اتنا ہی وہ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اور زیادہ مشہور ہوتے ہیں:

یریدون لیطفؤا نور الله بافواههم والله متم نوره ولوکره الکفرون. (الصف: ع۱)

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے نور کو پورا کر کے ہی رہے گا۔ اگرچہ یہ بات اہلِ کفر کو ناگوار ہی ہو۔

ترجمہ شعر: چاند نور چھڑکتا ہے، اور کتا بھونکتا ہے۔ اس میں چاند کا کیا قصور؟ کتا ایسا ہی ہے۔

ترجمہ شعر: چاند سے آسمان کے ارکان نور لیتے ہیں۔ وہ کتا کیا حیثیت رکھتا ہے کہ زمین کا کانٹا بھی بن جائے۔

بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ انہیں خداوند تعالیٰ نعمت، مال، زر اور امارت سے عذاب دیتا ہے۔ اور ان کی جان ان سے گریز نہیں کرتی۔

ایک فقیر نے ملکِ عرب میں ایک امیر کو سوار دیکھا۔ اس کی پیشانی میں انبیاء و اولیاء کی روشنی دیکھی۔ کہا سبحان اللہ!

یعذّب عبادہٖ بالنعم.

پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندوں کو نعمتوں سے عذاب دیتا ہے۔

(بقیہ) ہمچنیں دور دوم ہابیل بود — ضد نور پاک او قابیل بود
ہمچنیں ایں دو علم از عدل وجور — تا بہ نمرود آمد اندر دور دور
ضد ابراہیم گشت و خصم او — واں دو لشکر کیں گزار و جنگ جو
دور دور و قرن قرن ایں دو فریق — تا بموسیٰ و بفرعون غریق
سالہا اندر میانشاں حرب بود — چو ز حد رفت و ملامت می فزود
آب دریا احکم ساز ید حق — تاکہ ماند کہ بروز ایں دو سبق
ہمچنیں تا دور عہد مصطفےٰ — با ابوجہل آں سپہدار جفا
(مولانا روم)

اصل چیز معنی ہے

ابنِ مقری قرآن درست پڑھتا ہے۔ ہاں وہ قرآن کے ظاہری الفاظ کو درست پڑھتا ہے، لیکن معنی سے بے خبر ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ وہ حال جو معنی کے لیے چاہیے اسے وہ رد کر دیتا ہے۔ اور اندھوں کی طرح پڑھتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک آدمی کے ہاتھ میں سنگِ آہن ہے۔ دوسرا اس سے بہتر سنگِ آہن لے آتا ہے۔ یہ اسے رد کر دیتا ہے۔ پس ہم نے سمجھ لیا کہ اسے سنگِ آہن کی پہچان نہیں۔ کسی نے اسے کہہ دیا کہ یہ سنگِ آہن ہے۔ اس کے کہنے پر یہ اسے لیے پھرتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جو لڑکے اخروٹوں سے کھیلتے ہیں۔ جب اخروٹ کا مغز یا اخروٹ کا تیل انہیں دیا جائے تو وہ اسے رد کر دیتے ہیں کہ اخروٹ تو وہ ہے جسے ہلایا جائے تو اندر سے جع جع کی آواز آئے۔ اگر یہ اخروٹ ہیں تو ان میں جع جع کی آواز کیوں نہیں؟ خدا کے خزانے بہت ہیں۔ اور خدا کے علوم بسیار ہیں۔ اگر وہ قرآن کو عقل سے پڑھتا ہے۔ تو دوسرے کے قرآن پڑھنے کو کیوں رد کرتا ہے۔

ایک قاری سے میں نے کہا، قرآن کہتا ہے:

قل لوکان البحر مداداً لکلماتِ ربّی لنفذ البحر قبل ان تنفذ کلماتِ ربّی. (الکهف: ع ۱۲)

کہہ دے کہ اگر تمام سمندر روشنائی بن جائے، خداوند تعالیٰ کے کلمات بیان کرنے کے لیے تو سمندر کی روشنائی ختم ہو جائے، پیشتر اس کے کہ خدا کے کلمات تمام ہوں۔

اب اس قرآن کا وزن پورے پچاس درم ہو سکتا ہے۔ اس کا لکھا خدائی علم کی ایک رمز ہے۔ خدا کا سارا علم تمام یہی نہیں ہے۔ عطار کاغذ میں تھوڑی سے دوا لپیٹ دیتا ہے، تو کہتا ہے کہ عطار کی ساری دکان یہی ہے۔ یہ بے وقوفی ہے۔ آخر حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں قرآن تھا۔ خدا کا کلام تھا۔ عربی میں نہ تھا۔ میں نے یہ تقریر

کی تو اس سے قاری پر اثر نہ ہوا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔

کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اصحاب میں سے جو کوئی ایک سورہ یا آدھی سورہ یاد کر لیتا، اس کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے کہتے کہ اسے ایک سورہ[1] یاد ہے۔ وہ جو قرآن کو کھا جاتے ہیں۔ ان کا ایک من یا دو من روٹیاں کھا جانا کون سی بڑی بات ہے۔ وہ انھیں منہ میں ڈال لیتے ہیں۔ جگالی کرتے ہیں اور پھینک دیتے ہیں۔ وہ ہزار خروار بھی کھا سکتے ہیں۔ آخر کہتا ہے:

رُبَّ تالی القرآن والقرآن یلعنهُ. — وہ قرآن کی تلاوت کرتا ہے اور قرآن اس پر لعنت کرتا ہے۔

یہ ان لوگوں کے حق میں آیا ہے، جو قرآن کے معنی سے واقف نہیں۔ ان لوگوں کی ایک ایسی قوم ہے، جس کی آنکھیں خدا نے غفلت سے بند کر دیں۔ تاکہ وہ اس دُنیا کو تعمیر کرے۔ اگر بعض لوگوں کو اس دُنیا سے غافل نہ کر دیں تو دُنیا میں کوئی آبادی نہ ہو۔ غفلت عمارتیں اور آبادیاں پیدا کرنے والی ہے۔ آخر بچہ غفلت ہی سے بڑا ہوتا ہے اور لمبا ہوتا ہے۔ اور جب اس کی عقل کمال کو پہنچتی ہے۔ تو وہ اس سے زیادہ دراز نہیں ہوتا۔ پس عمارت کا موجب اور سبب غفلت[2] ہے اور ویرانی کا سبب ہوشیاری ہے۔ یہ جو میں کہتا ہوں، دو وجوہ کے سوا نہیں۔ یا میں حسد کی وجہ سے کہتا ہوں یا شفقت کی بنا پر۔ حاشا کہ یہ حسد کی وجہ سے ہو، اس لیے کہ حسد کی قیمت کچھ نہیں۔ اصل وجہ میری شفقت ہی ہے۔ اسی وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ عزیز دوست کو روحانیت کے ذریعہ اپنی طرف کھینچوں۔

---

[1] در صحابہ کم بدے حافظ کسے — گرچہ شوقے بود جانشاں را بسے

[2] پس ستونِ ایں جہاں خود غفلتست — چیست دولت کایں دوا دو بانست

کہتے ہیں کہ ایک شخص حج کے راستہ میں مصیبت میں گھر گیا۔ پیاس کی شدت اس پر غالب آگئی۔ اور وہ سخت بے تاب ہوا۔ اتنے میں اس نے دور ایک چھوٹا سا پرانا خیمہ دیکھا، وہاں گیا۔ ایک چھوٹی سی لونڈی پر نظر پڑی۔ اس نے اسے آواز دے کر کہا، میں مہمان ہوں اور وہیں اتر پڑا۔ پانی مانگا، انہوں نے پانی دیا جو آگ سے زیادہ گرم اور نمک سے زیادہ کھاری تھا۔ ہونٹوں سے لے کر گلے تک جہاں سے پانی گزرا سب کچھ جلاتا گیا۔ یہ مہمان بڑی محبت اور شفقت سے اس عورت کو نصیحت کرنے لگا۔ اس نے کہا۔ دیکھو تم نے مجھ مسافر کو جو آرام دیا ہے، اس سے میری شفقت جوش میں آگئی ہے، میں جو کچھ کہوں اسے اہمیت دیجئے۔ بغداد یہاں سے قریب ہے، اور کوفہ راستہ ہی میں ہے۔ یہاں تو آپ مصیبت میں گرفتار ہیں۔ آپ افتاں وخیزاں اپنے آپ کو وہاں تک پہنچا سکتے ہیں۔ وہاں میٹھا اور ٹھنڈا پانی بہت ہے۔ اور رنگ رنگ کے کھانے اور حمام بہت ہیں۔ مہمان نے ان شہروں کی نعمتیں، خوشیاں اور لذتیں گن ڈالیں۔ اتنے میں وہ عرب بھی آگیا جو اس عورت کا خاوند تھا۔ وہ چند جنگلی چوہے شکار کر کے لایا تھا۔ عورت سے اس نے کہا کہ وہ انہیں پکائے۔ اس میں سے کچھ انہوں نے مہمان کو دیا۔ مہمان مصیبت اور بھوک کا مارا ہوا تو تھا ہی، اسے کھا گیا۔ اس کے بعد آدھی رات گئے وہ خیمہ سے باہر سو رہا۔ عورت نے اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا، تم نے سنا اس مہمان نے ان شہروں کی کیا کیا تعریفیں کیں اور کیا کیا قصے سنائے؟ پھر وہ تمام گفتگو جو مہمان نے کی تھی، خاوند کے سامنے دہرائی۔ خاوند نے سب کچھ سن کر کہا، اے عورت خبردار! اس قسم کی باتیں نہ سنا کر۔ دُنیا میں حاسد بہت ہیں۔ جب وہ کسی کو دیکھتے ہیں کہ آسائش اور لذت کی زندگی بسر کر رہا ہے، تو حسد کرنے لگتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ کسی بہانے اسے وہاں سے چلتا کریں اور اسے اس دولت سے محروم کر دیں۔

لب یہ خلقت ایسی ہی ہے کہ جب کوئی اسے شفقت سے نصیحت کرے تو اسے حسد پر محمول کرتی ہے، سوائے اس میں ایسے آدمی کے جس پر اصلیت آشکار ہو۔ وہ اصلیت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ایسے آدمی پر ازل کے دن حقیقت کا اک قطرہ ٹپکایا گیا تھا۔ وہی قطرہ اب اسے تشویش، رنج اور مصیبت سے مخلصی دلاتا ہے۔ آخر تو کب تک مجھ سے دور اور بیگانہ رہے گا؟ اور تشویش اور وہم سے دوچار رہے گا؟ اس قوم سے کوئی کیا بات کہے، جس نے ایسی بات نہ کبھی کسی سے سنی ہو اور نہ اپنے شیخ سے۔

ترجمہ شعر : جب اس کے خاندان میں بزرگی ہی نہ تھی تو وہ بزرگوں کا نام کہاں سے سنتا۔

معنی کی طرف متوجہ ہونا اگرچہ پہلے پہل اچھا نہیں لگتا۔ جتنا وقت گزرتا جاتا ہے، معنی کی لذت شیریں تر معلوم ہوتی ہے۔ صورت کے معاملہ میں یہ بات الٹ ہے۔ صورت پہلے پہل بہت اچھی لگتی ہے۔ لیکن اس کی صحبت میں جتنا زیادہ رہو گے، اس کی طرف سے دل سرد ہوتا جائے گا۔ کہاں صورتِ قرآن اور کہاں معنی قرآن۔ آدمی کو دیکھو، کہاں اس کی صورت اور کہاں اس کے معنی۔ اگر کوئی اس صورت کی اصلیت پر جائے تو ایک لحظہ بھی اس سے تعلق نہ رکھے۔

مولانا شمس الدین قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ ایک بہت بڑا قافلہ کسی جگہ گیا۔ نہ اسے آبادی ملی اور نہ پانی۔ ناگاہ اسے ایک کنواں مل گیا، جس پر ڈول نہیں تھا۔ رسی اور ایک طشت لے کر قافلہ والے کنویں پر آئے۔ اس طشت کو کنویں میں لٹکایا، اسے باہر کھینچا تو طشت ٹوٹ گیا۔ دوسرا طشت کنویں میں لٹکایا تو وہ بھی ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد قافلہ کے ایک آدمی کو رسی سے باندھ کر لٹکایا، وہ دوبارہ اوپر نہ آیا۔ قافلہ میں ایک عقلمند تھا۔ اس نے کہا میں جاتا ہوں۔ انہوں نے اسے نیچے لٹکایا، وہ کنویں کی تہہ کے قریب پہنچا تو ایک

کالی کلوٹی شکل نمودار ہوئی۔ اس عقلمند نے کہا، میں اب مخلصی نہیں پاؤں گا، جب تک اپنی عقل کو کام میں نہ لاؤں، میں بے خود نہ بن جاؤں گا، تاکہ دیکھوں مجھ پر کیا گزرتی ہے۔ کالی کلوٹی شکل نے کہا۔ قصہ کو طول نہ دے۔ تو میرا قیدی ہے، تو آزاد نہیں۔ (میرے سوال کے) صحیح جواب کے سوا کوئی دوسری چیز تجھے رہائی نہ دے گی۔ عقلمند بولا، فرمایئے۔ بولی سب جگہوں سے بہتر کون سی جگہ ہے؟ عقلمند نے خیال کیا، میں قیدی اور مجبور ہوں۔ اگر میں کہوں بغداد یا اور کوئی جگہ، تو ہو سکتا ہے کہ میں اس پر مطعون ہوں۔ جواب دیا جگہ وہ بہتر ہے، جہاں اپنا مونس ہو، خواہ وہ زمین کی تہہ ہی میں ہو۔ وہی جگہ بہتر ہے۔ اور خواہ وہ چوہے کے بل ہی میں کیوں نہ ہو، وہی جگہ بہتر ہے۔ بولی، تو نے کیا اچھی بات کہی! جا، تو رہا ہوا۔ دُنیا میں آدمی تو ہی ہے۔ اب میں نے تجھے رہا کیا اور دوسروں کو تیری برکت سے آزاد کیا۔ اس کے بعد میں کوئی خون نہیں کروں گی۔ دُنیا کے تمام مرد میں نے تیری محبت میں تجھے بخش دیئے۔ اس کے بعد پانی سے اہلِ قافلہ کی پیاس بجھائی۔

اب اس (قصہ کے بیان کرنے) سے غرض یہ ہے کہ ایک معنی کو دوسری طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ مقلد صورت ہی کو پکڑ بیٹھتے ہیں۔ ان سے بات کرنا مشکل ہے۔ اب اسی بات کو تو دوسرے طریق پر کہے، تو وہ نہیں سنتے۔

مقصد

فرماتے ہیں کہ تاج الدین قبائی نے لوگوں سے کہا کہ یہ دانش مند ہم میں آتے ہیں اور خلقت کو دین کے راستہ میں بے اعتقاد بناتے ہیں۔ کہا نہیں۔ یہ ہمارے درمیان نہیں آتے، اور نہ ہمیں بے اعتقاد بناتے ہیں۔ حاشا کہ یہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ اگر کسی

کتے کو زرّیں پٹہ پہنا دیا جائے تو اس پٹے کی وجہ سے اسے شکاری کتا نہیں کہنے لگتے۔ شکاری پن تو اس کی معنویت ہے۔ خواہ اس نے زرّین پٹہ پہن رکھا ہو اور خواہ پشم کا پٹہ۔

عالم جبہ اور دستار سے نہیں بنتا۔ عالمیت اس کی ذات میں ایک ہنر ہے۔ اگر وہ ہنر قبا اور عبا میں ہو تو اس سے فرق نہیں پڑتا۔ چنانچہ پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانہ میں منافقوں نے دین پر ڈاکہ ڈالنے کا قصد کیا۔ انہوں نے نماز کے جامے پہن لیے، تاکہ کسی مقلد کو دین کی راہ میں سست بنائیں۔ یہ وہ اس وقت تک نہیں کر سکتے تھے، جب تک اپنے آپ کو مسلمانوں میں سے نہ بنا لیتے۔ ورنہ عیسائی یا یہودی انہیں دین کا طعن دیتے۔ وہ کب یہ سنتے کہ:

فویل للمصلین الذین هم عن صلاتهم ساهون الذین هم یرآءُ ون ویمنعون الماعون. (سورۂ ماعون: ع ۱)	کم بختی ہے، ان نمازیوں کی، جو اپنی نماز میں سستی کرتے ہیں اور ریاء اور نمائش کرتے ہیں اور چھوٹی چیزوں تک میں بخل کرتے ہیں۔

سخن کلی یہ ہے کہ تو وہ نور رکھتا ہے۔ آدمیت نہیں رکھتا۔ آدمیت مانگ، اصل مقصد یہ ہے۔ باقی بات کو لمبا کرنا ہے۔ جب بات کی بہت آرائش کرتے ہیں تو مقصد فراموش ہو جاتا ہے۔

ایک سبزی فروش کسی عورت کو دوست رکھتا تھا۔ سبزی فروش نے اس عورت کی لونڈی کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ میں ایسا ہوں، میں ویسا ہوں۔ میں عاشق ہوں۔ میں جل رہا ہوں۔ مجھے چین نہیں، مجھ پر ستم ہو رہا ہے۔ آج مجھ پر یہ گذری۔ کل وہ گزری۔ لمبے چوڑے قصے بیان کیے۔ لونڈی اس عورت کی خدمت میں حاضر ہوئی اور بولی سبزی فروش نے تجھے سلام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ آ، تاکہ میں تجھ سے یہ کروں اور وہ کروں۔

عورت نے کہا، ایسا پیغام اور اس سرد مہری سے؟ لونڈی بولی، اس کی گفتگو تو بہت لمبی تھی، مگر مقصد صرف اتنا ہی تھا۔

اصل بات مقصد ہے، باقی دردِ سر ہے۔

عورت کی فطرت

فرمایا کہ تو رات دن جنگ کرتا ہے اور عورت کی تہذیب اخلاق چاہتا ہے۔ اور عورت کی نجاست کو اپنے آپ سے صاف کرتا ہے۔ اپنے آپ کو اس سے پاک کرتا ہے۔ بہتر ہے کہ تو اسے اپنے آپ میں پاک کرے۔ اپنے آپ کو اس سے مہذب بنا۔ اس کی طرف جا، اور جو وہ کہے اسے تسلیم کر۔ خواہ تیرے نزدیک اس کی بات محال ہی کیوں نہ ہو۔ اور غیریت کو چھوڑ دے۔ اگرچہ غیریت مردوں کا وصف ہے۔ لیکن اس اچھے وصف ہی سے تجھ میں برے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ اسی کی خاطر پیغمبر ﷺ نے فرمایا:

لارهبانية فى الاسلام. اسلام میں ترکِ دُنیا نہیں۔

راہب خلوت کے راستہ پر چلتے ہیں۔ پہاڑوں میں بیٹھنا، عورت کو اچھا نہ سمجھنا اور ترکِ دُنیا ان کا طریق ہے۔ خداوند عزّ و جل نے پیغمبر ﷺ کو ایک چھپا ہوا باریک راستہ دکھا دیا۔ اور وہ کیا ہے؟ عورت کو چاہنا تاکہ عورتوں کے ظلم سے اور ان کی محال باتیں سنے۔ خجالت ہو، اور اپنے آپ کو مہذب بنائے۔

وانك لعلىٰ خلق عظيم. آپ بہترین اخلاق پر قائم ہیں۔

دوسروں کے ظلم سہنا اور تحمل کرنا ایسا ہی ہے کہ تو اپنی غلاظت کو ان سے مل دیتا ہے۔ تیرا اخلاق بردباری سے اچھا ہو جاتا ہے۔ اور خجالت اور تعدّی سے ان کا اخلاق بد

ہو جاتا ہے۔ پس جب تو نے یہ بات سمجھ لی، تو اپنے آپ کو پاک بنا۔ انہیں لباس کی طرح سمجھ۔ کیونکہ اپنی پلیدی کو تو ان سے پاک کرتا ہے اور تو پاک ہو جاتا ہے۔ اگر تجھ سے خود ایسا نہ ہو تو عقل کی رو سے اپنے آپ کو سمجھا کہ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ نکاح نہیں ہوا۔ یہ ایک آوارہ معشوقہ ہے۔ جب بھی شہوت غالب آتی ہے، میں اس کے پاس جاتا ہوں۔ اس طریق پر اپنے آپ سے حمیت، حسد اور غیرت کو دور کر، تاکہ اس سے ورے تجھے مجاہدہ اور تحمل کا مزہ آنے لگے اور ان کے محالات سے تیرا حال ظاہر ہو تو اس کے بعد اپنے آپ پر زور دیئے بغیر ہی تو مزید تحمل اور مجاہدہ کو برداشت کر سکے۔ کیونکہ تو اس میں ایک معین فائدہ دیکھے گا۔

کہتے ہیں، پیغمبر ﷺ اپنے صحابہ کے ہمراہ جنگ سے لوٹ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا، آج رات ڈھول بجایا جائے اور شہر کے دروازہ پر سوئیں۔ کل شہر کے اندر جائیں۔ صحابہ نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ! اس میں کیا مصلحت ہے؟ فرمایا کہ (یکایک چلے جانے سے) ہو سکتا ہے تم وہاں اپنی عورتوں کو بیگانے مردوں کے ساتھ دیکھو۔ اور تمہیں الم ہو اور فتنہ پیدا ہو جائے۔ صحابہ میں سے ایک نے یہ بات نہ سنی۔ وہ (اپنے گھر) چلا گیا۔ اپنی عورت کو غیر مرد کے ساتھ پایا۔

پیغمبر ﷺ کا طریق یہ ہے کہ غیرت اور حمیت کو دور کرنے کے لیے محنت کرنی چاہیے۔ اور عورت کو روزی اور کپڑا مہیا کرنے کے لیے مشقت کرنی چاہیے۔ سو ہزار بڑے غم چھو تو عالم محمدیؐ اپنا چہرہ دکھائے۔ حضرت عیسیٰؑ کا طریق، خلوت کا مجاہدہ اور شہوت کو روکنا ہے۔ محمد ﷺ کا راستہ عورت اور مرد کے ظلم اور غصہ کو برداشت کرنا ہے۔ اگر تو محمدیؐ راستہ پر نہیں چل سکتا تو عیسیٰؑ کے راستہ پر چل۔ تاکہ تو بالکل ہی محروم نہ رہے۔ بشرطیکہ تو یہ وصف رکھتا ہو کہ سو چپت کھالے۔ اور پھر اسی کو اس کا حاصل

سمجھے۔ یا تو غیب کا معتقد ہو جیسا کہ انہوں نے فرمایا ہے اور خبر دی ہے۔ اور سمجھ لے کہ کوئی ایسی چیز ہے۔ اس وقت تک صبر کروں کہ وہ حاصل جس کی انہوں نے خبر دی ہے، مجھ تک بھی پہنچ جائے۔ اس کے بعد تو دیکھے گا کہ اگرچہ تیرے دل میں یہ بات ہو گی کہ اگرچہ ان تکلیفوں کا حاصل اس گھڑی میرے لیے کچھ نہیں، آخر کار جو خزانے میں چاہتا ہوں، ان تک میں پہنچ جاؤں گا۔ اور جن خزانوں کی تجھے طمع تھی اور جن کی تجھے امید تھی، ان سے بھی بڑھ کر وہ خزانے ہوں گے، جن تک تیری رسائی ہو گی۔ اگر یہ بات اس وقت تجھ پر اثر نہیں کرتی تو جیسا تو پختہ ہو جائے، اس وقت یہ بہت زیادہ اثر کرے گی۔ عورت کیا ہوتی ہے؟ دُنیا کیا ہوتی ہے؟ تو خواہ کہہ، خواہ نہ کہہ، وہ وہی کچھ ہے جو کچھ کہ ہے۔ جو کچھ وہ کرتی ہے، اس سے باز نہ آئے گی۔ بلکہ تیرے کہنے سے وہ بد سے بدتر ہی ہو گی۔

مثال کے طور پر روٹی لے اور اسے بغل میں دبالے، اور کسی کو نہ دے اور کہہ دے میں کسی کو نہ دوں گا۔ دینا تو ایک طرف میں دکھاؤں گا بھی نہیں۔ اگرچہ روٹیاں کثرت اور ارزانی کی وجہ سے دروازوں کے سامنے ڈھیروں کی صورت میں پڑی ہوں۔ اور انہیں کتے بھی نہ کھاتے ہوں۔ مگر تُو نے اس روٹی سے خلقت کو منع کیا ہے، وہ اس طرف راغب ہو جاتی ہے اور اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ اور ہر اچھے برے طریقہ سے چاہتی ہے کہ اسے دیکھ کر چھوڑے، جس سے تُو نے اسے منع کیا ہے اور جسے تُو نے چھپایا ہے۔ خاص طور پر اگر تو اس روٹی کو سال بھر چھپائے پھرے۔ اور مبالغہ کے ساتھ تاکید کرتا رہے کہ تُو اسے کسی کو نہیں دکھائے گا تو خلقت کی رغبت حد سے زیادہ گزر جائے۔ کیونکہ طبعاً انسان اس چیز کا حریص ہے جس سے اسے منع کیا جائے۔ تُو عورت کو جتنا زیادہ حکم دے کہ وہ چھپی رہے۔ اتنا ہی اسے اپنے آپ کو دکھانے کی زیادہ فکر ہو گی۔ اور عورت کے چھپنے سے خلقت کو اس کی طرف اور زیادہ رغبت ہو جاتی ہے۔ پس تو بیٹھا ہوا ہے اور دو

طرف سے رغبت کو بڑھا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ تُو اصلاح کر رہا ہے۔ یہ خود عین فساد ہے۔ اگر اس عورت میں یہ خوبی ہے کہ وہ فعلِ بد نہ کرے، تُو خواہ منع کرے اور خواہ نہ کرے۔ وہ اپنی نیک طبع اور پاک سرشت پر چلے گی۔ پس تو فارغ ہو جا اور تشویش نہ کر۔ اور اگر عورت کی طبع اور سرشت اس کے برعکس ہو تو پھر بھی وہ اپنے ہی طریق پر چلے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا منع کرنا، سوائے رغبت بڑھانے کے اور کچھ نہ کرے گا۔

ولی کی پہچان بہت مشکل ہے

یہ مرد کہتے ہیں کہ ہم نے شمس الدین تبریزی کو دیکھا ہے۔ جناب ہم نے اسے دیکھا ہے۔ اے نامعقول تُو نے کہاں دیکھا؟ وہ آدمی جو شتر سوار کو نہیں دیکھتا، کہتا ہے میں نے سوئی کے ناکے کو دیکھا اور اس میں تاگا پرو دیا ہے۔ یہ کیا ہی اچھی بات ہے، مجھے دو چیزوں پر بڑی ہنسی آتی ہے۔ ایک یہ کہ حبشی اپنی انگلیوں کے پوروں کو کالا کرے، دوسرے یہ کہ اندھا دریچے میں سے سر باہر نکالے۔ یہ ایسے ہی ہیں۔ ان کے باطن اندھے ہیں، یہ اندھے باطن جسم کے دریچہ سے باہر جھانکتے ہیں۔ یہ کیا دیکھیں گے۔ ان کی تحسین اور ان کے انکار سے کیا ہوتا ہے۔ عقل مند کے نزدیک یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ دونوں نے دیکھا۔ دونوں بیہودہ گوئی کرتے ہیں۔ پہلے بینائی حاصل کرنی چاہیے، اس کے بعد دیکھنا چاہیے۔ اور جب بینائی حاصل ہو جائے تو بھی کیا دیکھ سکتے ہیں؟ دیکھنا یہ ہے کہ وہ حقیقت میں ہوں۔ اس دُنیا میں چند اولیاء جو بینا اور واصل ہیں، اور ان سے بھی اوپر اولیاء ہیں، انھیں مستورانِ حق کہتے ہیں۔ یہ اولیاء آہ و زاری کرتے ہیں کہ اے خدا ان چھپے ہوئے اولیاء میں سے ہمیں بھی کوئی ایک دکھا۔ کیونکہ جب تک وہ خود نہ چاہیں، کوئی انھیں نہیں

دیکھ سکتا۔ خواہ آنکھیں بینا ہی ہوں۔ ہر چند کہ وہ بینا آنکھ رکھتے ہیں۔ وہ اسے نہیں دیکھ سکتے۔ اب بھی شرابی جو بدکار ہیں، ان تک نہیں پہنچا جاسکتا، جب تک وہ خود نہ چاہیں کہ کوئی ان تک پہنچے۔ مستورانِ حق کو ان کی مرضی کے بغیر کیسے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کی شناخت کوئی آسان کام نہیں۔ اس میں فرشتے بھی عاجز ہیں:

ونحنُ نسبّح بحمدك ونقدّس لك. — اور ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔

ہم بھی عشق ناک اور روحانی ہیں۔ نورِ محض ہیں۔ یہ جو انسان ہیں، یہ شکم خوار اور خون ریز ہیں۔

یسفکون الدّما. — وہ خون ریزی کرتے ہیں۔

اب یہ سب اس لیے ہے تاکہ آدمی اپنے آپ سے لرزاں ہو کر روحانی فرشتے جن کے پاس نہ مال تھا، نہ جاہ اور نہ حجاب، اللہ کا نورِ محض ان کے لیے غذا ہے۔ ان تیز چشم اور دُوربینوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا جمالِ عشق محض ہے۔ انکار اور اقرار کے درمیان رہنا اس لیے ہے کہ انسان یہ سوچ کر کانپ اٹھے کہ آہ! میں کیا تھا اور کہاں پہچان رہا ہوں۔ نیز اگر اس پر اللہ کا نور چمک اٹھے، اور اس کا ذوق ظاہر ہو جائے تو وہ خدا کا ہزار شکر کرتا ہے کہ میں اس لائق کہاں تھا۔

اس مرتبہ تم شمس الدین کی بات سے زیادہ ذوق حاصل کرو گے، کیونکہ کشتی وجود کا بادبان اعتقاد رکھنے والا مرد ہے۔ جب بادبان موجود ہو تو ہوا اسے کسی بڑی جگہ لے جاتی ہے۔ اور جب بادبان نہ ہو، بات ہوا ہوتی ہے۔ اچھا ہے کہ عاشق و معشوق کے درمیان بے تکلفی محض ہوتی ہے۔ سب تکلفات غیر کے لیے ہیں۔ ہر وہ چیز جو عشق کے علاوہ ہے، اس پر حرام ہے۔ یہ بات میں نے زور دار الفاظ میں کہہ دی ہے، مگر بے وقت ہے۔

بہت کوشش کرنی چاہیے اور نہریں، ندیاں کھودنی چاہئیں تاکہ دل کے حوض تک پہنچیں۔ سوائے اس کے کہ قوم ملول ہو یا کہنے والا ملول ہو اور وہ بہانہ کرتا ہو، ورنہ وہ کہنے والا جو قوم سے ملال دور نہ کرے، دو پیسے کا نہیں۔ عاشق کسی سے معشوق کے حسن کو بطور دلیل کے استعمال نہیں کر سکتا۔ اور کوئی شخص عاشق کے دل میں کوئی دلیل نہیں بٹھا سکتا، جو معشوق کے بُغض پر دلالت کرتی ہو۔ پس معلوم ہوا کہ یہاں دلیل کام نہیں کرتی۔ یہاں عشق کا طالب ہونا چاہیے۔ اب اگر میں عاشق کے لیے اپنے شعر میں مبالغہ کروں، تو وہ مبالغہ نہ ہوگا۔ نیز میں دیکھتا ہوں کہ مرید اپنے معنی کو شیخ کی صورت پر نثار کر دیتا ہے۔ بعد اے وہ کہ تیری صورت ہزار معنی سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اس لیے کہ ہر مرید جو شیخ کے پاس آتا ہے، روحانیت کے خیال سے ہی آتا ہے اور شیخ کا محتاج ہوتا ہے۔

بہاء الدین نے سوال کیا کہ وہ شیخ کی خاطر معنی کو نہیں چھوڑتا، بلکہ وہ اپنے معنی کو چھوڑتا ہے، شیخ کے معنی کی خاطر۔ فرمایا نہیں چاہیے کہ ایسا ہو۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ دونوں ہی شیخ ہوئے۔ اب کوشش کرنی چاہیے کہ تو اپنے آپ میں نور حاصل کرے تاکہ تشویشوں کی آگ سے تو خلاصی پائے۔ اور مامون ہو جائے جس کسی کو اپنے اندر نور حاصل ہو جائے۔ احوالِ عالم جن کا تعلق دُنیا سے ہے۔ جیسے منصب، امارت، وزارت اس کے اندر ہی چمک اٹھتے ہیں۔ اور ان کا گزر بجلی کی طرح ہوتا ہے۔ اہلِ حق کلی طور پر خدا کے کشتہ ہیں اور خدا کی طرف متوجہ ہیں۔ وہ حق ہی میں مشغول اور مستغرق ہیں۔ دُنیا کی ہوس نامرد کی شہوت کی طرح ہوتی ہے، مگر اسے قرار نہیں ہوتا اور گزر جاتی ہے۔ عقل کے احوال میں اہلِ دُنیا اس کے برعکس ہیں۔

مستغنی کون ہے؟

شریف یا سوختہ کہتا ہے:

ترجمہ شعر: وہ نعمتیں بخشنے والا خدا جو اس جہان سے مستغنی ہے، جان اسی کی ہے اور وہ جان سے بے نیاز ہے۔

ترجمہ شعر: ہر وہ چیز جس پر کہ تیرا وہم محیط ہوا، اسی کا قبلہ ہے اور وہ اس سے مستغنی ہے۔

یہ اشعار بہت مشہور ہیں، نہ یہ بادشاہ کی مدح ہیں اور نہ اپنی۔ اے مردک تجھے اس سے کیا ذوق حاصل ہو گا کہ وہ تجھ سے مستغنی ہے۔ یہ دوستوں کا خطاب نہیں، یہ دشمنوں کا خطاب ہے کہ دشمن خود کہتا ہے: میں تجھ سے آزاد ہوں، میں مستغنی ہوں۔ اب اس گرم رو عاشق کو دیکھو کہ ذوق کی حالت میں معشوق سے یہ خطاب ہے کہ وہ اس سے مستغنی ہے۔ اس کی مثال یہ ہو گی کہ ایک بھنگی غلاظت پر بیٹھا ہو اور کہہ رہا ہو۔ میں ایک بھنگی ہوں۔ بادشاہ میری طرف سے آزاد ہے۔ اور اسے کسی بھنگی سے کام نہیں۔ بھنگی مردک کو یہ ذوق کہاں کہ دراصل بادشاہ اس سے آزاد ہے۔ ہاں یہ بات ہو گی کہ بھنگی کہتا ہے کہ میں مزبلہ کی چھت پر تھا۔ بادشاہ گزرا۔ میں نے اسے سلام کیا۔ اس نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا۔ اور وہ میرے قریب سے چلا گیا۔ اور اب تک مجھ پر اس کا کرم ہے۔ یہ بات بھنگی کے لیے شوق پیدا کرنے والی ہے۔ ورنہ یہ بات کہ بادشاہ بھنگیوں کی طرف سے آزاد ہے۔ اس سے بادشاہ کی کیا تعریف ہوئی؟ اور اس نے کیا مزا دیا بھنگی کو؟ جس چیز کی طرف تیرا خیال اس کا محیط ہو گیا۔ اے مردک تُو کس خیال میں پڑا ہے۔ لوگ تیرے وہم و خیال سے مستغنی ہیں۔ اور اگر تو اپنے وہم کی بناء پر ان سے بات کرے، تو وہ

ملول ہوتے ہیں اور گریز کرتے ہیں۔ کونسا وہم ہے کہ جس سے خدا مستغنی نہیں ہوتا۔ خود استغنا کی آیت کافروں کے لیے آئی ہے۔ حاشا کہ یہ خطاب مومنوں سے ہو۔ اے مردک! اس کا استغنا ثابت ہے۔ ورنہ اگر تیری یہ حالت ہو کہ تیری کچھ قدر و قیمت ہو تو تیری عزت کے مطابق، وہ بے نیاز نہ ہو۔

محلہ کے شیخ نے کہا، پہلے دید ہے، اس کے بعد گفت و شنید۔ چنانچہ بادشاہ کو دیکھتے سبھی ہیں۔ لیکن بات اس سے خاص لوگ ہی کرتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ ٹیڑھا پن ہے، اور ذلیل کرنے والی چیز ہے اور الٹ ہے۔ حضرت موسیٰ ؑ نے پہلے گفت و شنید کی۔ اور اس کے بعد دیدار طلب کیا۔ گفتگو کا مقام حضرت موسیٰ ؑ کو حاصل ہوا۔ دیدار کا مقام حضور سرور کائنات ﷺ کو ملا۔ پس یہ بات کس طرح ٹھیک بیٹھے؟ اور کیسے ہو؟

انسانی مصروفیتوں کی حقیقت

فرمایا کسی آدمی نے مولانا شمس الدین تبریزی کے سامنے کہا کہ میں نے مولانا شمس الدین کی مدد سے دلیلِ قاطع دے کر خدا کی ہستی ثابت کر دی ہے۔ فرمایا کل فرشتے آئے تھے اور اس آدمی کے لیے دُعا کرتے تھے کہ الحمد للہ اس نے ہمارا خدا ثابت کر دیا۔ اس کا خدا اس کی عمر لمبی کرے۔ دُنیا کے حق میں اس نے کوتاہی نہیں کی۔ اے مردوے! خدا ثابت ہے۔ اسے ثابت کرنے کے لیے دلیل نہیں چاہیے۔ اگر تو کوئی کام کرتا ہے، تو اپنے آپ کو مرتبہ اور مقام کے لحاظ سے اس کے سامنے ثابت کر، ورنہ وہ تو بغیر دلیل ہی کے ثابت ہے:

ان من شیٔ الا یسبّح بحمدہٖ. کوئی چیز نہیں جو اللہ کی تسبیح نہ کرتی ہو۔

اس میں شک نہیں کہ یہ فقیہ زیرک ہیں، اور اپنے فن میں مہارت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے اور اس عالم کے درمیان انہوں نے جائز اور ناجائز نظام کے لیے دیوار کھینچ دی ہے۔ اگر ان کے حجاب کی یہ دیوار درمیان میں نہ ہو تو انہیں کوئی نہ پوچھے اور وہ کام معطل ہو جائے۔ اور اس کی مثال بڑے مولانا قدس اللہ سرّہ العزیز نے فرمائی ہے کہ وہ عالم ایک دریا کی طرح ہے اور یہ عالم مثال جھاگ ہے۔ خداعزّوجل نے چاہا کہ جھاگ کو آباد کرے۔ اگر وہ اس میں مشغول نہ رہے تو مخلوق ایک دوسرے کو فنا کر دے۔ اور اس سے جھاگ کی خرابی لازم آئے۔ پس یہ ایک خیمہ ہے جو انہوں نے بادشاہ کے لیے نصب کر رکھا ہے۔ اور قوم کو اس خیمہ کی تعمیر میں مشغول کر دیا ہے۔ ایک کہتا ہے اگر میں رسی نہ بناؤں تو خیمہ کیسے سیدھا رہے۔ اور دوسرا کہتا ہے اگر میں میخ نہ بناؤں تو رسی کو کہاں باندھیں۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ سارے کے سارے اس بادشاہ کے بندے ہیں، جو اس خیمہ میں بیٹھے گا اور تفرج محسوس کرے گا۔ پس اگر جولاہا وزارت کی خواہش میں بافندگی ترک کر دے تو ساری دُنیا ننگی اور برہنہ رہے۔ پس اسے بافندگی ہی کا ذوق بخشا۔ اور وہ اس میں خوش ہے۔ پس اس قوم کو جھاگ کے نظامِ عالم کی خاطر پیدا کیا ہے۔ اور عالم کو اس ولی کے نظام کے لیے۔ مبارک ہے وہ کہ جس کے نظام کے لیے عالم کو پیدا کیا گیا، نہ کہ اسے نظامِ عالم کے لیے۔ پس خدائے عزّوجل اس کام میں ہر کسی کو خوشی اور مسرت بخشتا ہے۔ اگر اس کی عمر سو ہزار سال ہو تو بھی وہ یہی کام کرتا ہے۔ اور ہر روز اس کام سے اس کی محبت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اور اس پیشہ میں اسے دقتِ نظر حاصل ہوتی جاتی ہے۔ اور اس سے وہ لذّت اور خوشی پاتا ہے:

وان من شيء الاّ يسبّح بحمده. (سورۂ بنی اسرائیل: ع ۵) کوئی شے ایسی نہیں جو حمدِ خداوندی کی تسبیح میں نہ لگی رہتی ہو۔

رسی بنانے والے کا وظیفہ جدا ہے۔ اور بوھئی جو خیمہ کے ستون بناتا ہے، اس کا وظیفہ جدا ہے۔

اب یہ قوم جو ہمارے پاس آتی ہے، اگر ہم اس کے سامنے خاموش رہیں تو وہ ملول اور رنجیدہ ہوتی ہے۔ اگر ہم ایسی بات کہیں جو اس کے لائق ہو تو اس سے ہم خود رنجیدہ ہوتے ہیں۔ اس پر وہ چلی جاتی ہے اور ہمیں طعن دیتی ہے کہ یہ ہم سے رنجیدہ ہے اور گریز کرتا ہے۔ سوکھی لکڑی کب دیگ سے گریزاں ہوتی ہے۔ البتہ دیگ ہی گریز کرتی ہے۔ پس آگ اور سوکھی لکڑی کا گریز، گریز نہیں۔ بلکہ جب وہ اسے دیکھتی ہے کہ وہ کمزور ہے تو اس سے دور ہو جاتی ہے۔ پس ہر حال میں دیگ ہی گریز کرتی ہے۔ پس ہمارا گریز درحقیقت ان کا گریز ہے۔ ہم آئینہ ہیں۔ اگر ان میں گریز ہے، تو وہ ہم میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ ہم ان سے گریز کرنے لگتے ہیں۔ آئینہ وہ ہے جس میں اپنے آپ کو دیکھتے ہیں۔ اگر وہ ہمیں ملول دیکھتے ہیں، تو یہ ملال ان کا ہے۔ اس لیے کہ ملال کمزوری کی صفت ہے۔ یہاں ملال کے لیے گنجائش نہیں۔ ملال کا یہاں کیا کام؟

ہر کام بتدریج کرنا چاہیے

مجھے گرمی کے موسم میں شیخ صلاح الدین کی تواضع بہت کرنی پڑی۔ اس تواضع کے مقابلہ میں شیخ صلاح الدین نے بہت زیادہ تواضع کی۔ میں نے شکایت کی۔ میرے دل میں آیا کہ تونے تواضع حد سے زیادہ کی۔ تواضع بتدریج اچھی ہے۔ پہلے اس کے ہاتھ ملنے چاہئیں۔ اس کے بعد پاؤں۔ تھوڑا تھوڑا کر کے، اس کے مقام پر پہنچائے تاکہ یہ بات ظاہر نہ ہو اور نظر نہ آئے، اور وہ اس کا خوگر ہو جائے۔ زحمت میں پڑنا لازمی نہیں۔ اور خدمت

کے بدلے خدمت ضروری نہیں۔ اگر تو اسے تواضع کا عادی بتدریج کرے تو وہ ہو جائے گا۔ دوست کو تھوڑا تھوڑا ایک طرح سے اور دشمن کو تھوڑا تھوڑا دوسری طرح سے عادی بنا۔ مثال کے طور پر دشمن کو تو پہلے تھوڑی تھوڑی نصیحت کر۔ اگر وہ نہ سنے۔ تو پھر اسے پیٹ۔ اگر اب بھی نہ سنے، تو اسے اپنے سے دور کر دے۔ خداوند تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

فعظوهن واهجروهنّ فى المضاجع واضربو هنّ. (سورۂ نساء: ع ۶)

پس ان کو سمجھاؤ، پھر ان کے ساتھ ہم خوابی ترک کر دو۔ پھر انہیں مارو۔

اور دُنیا کا کام اسی طرح چلتا ہے۔ تو نہیں دیکھتا کہ ابتداء میں بہار کو صلح اور دوستی تھوڑی تھوڑی گرمی دکھاتی ہے۔ اس وقت تو درختوں کو زیادہ سے زیادہ دیکھ کہ جب وہ تھوڑے تھوڑے بہار پر آتے ہیں، تو پہلے ایک تبسم سا پیدا ہوتا ہے، جو ان درختوں کے لیے پتے پیدا کرتا ہے۔ اس وقت ان کا ساز و سامان صوفیانہ اور درویشانہ ہوتا ہے۔ اسے وہ درمیان میں لا رکھتے ہیں۔ اور جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے، سب ہار دیتا ہے۔ پس جو شخص دُنیا کے کام اور عقبیٰ کے کام جلدی کرتا ہے اور ابتدائے کار میں سخت کوشش کرتا ہے، وہ کام اس پر آسان نہیں ہوتا۔ اگر ریاضت ہے تو اس کا بھی یہی طریقہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر ریاضت کرنے والا ہر روز ایک سیر روٹی کھاتا ہے تو اسے بتدریج تھوڑا تھوڑا کم کرتا جائے۔ اس طرح ایک سال یا دو سال نہ گزریں کہ روٹی نصف سیر رہ جائے۔ کم اس طرح کرے کہ یہ کمی جسم کو محسوس نہ ہو۔ اسی طرح عبادت، خلوت اور بندگی کی طرف توجہ اور نماز کا معاملہ ہے۔ نماز میں جب وہ خداوند تعالیٰ کی طرف رجوع کرے تو پہلے عرصہ میں وہ پانچ نمازوں پر نگاہ رکھے۔ اس کے بعد زیادہ کرتا جائے۔

ایک مرید کو سرزنش

اور اصل یہ ہے کہ ابن[1] چاؤش، صلاح الدین[2] کے حق کی پوری حفاظت کرے۔ کیونکہ ایسا کرنا اس کے لیے نفع مند ہوتا ہے۔ اور اس سے یہ ظلام اور غفلت کے پردے دور ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے ابنِ چاؤش، کیا وہ اپنے دل میں یہ نہیں کہتا کہ بے شمار لوگوں نے اپنے وطن اور اپنے باپوں اور اپنی ماؤں اور اپنے اہل و عیال، قریبی رشتہ داروں اور قبیلوں کو چھوڑ دیا، اور ہندوستان سے سندھ کا سفر اختیار کیا۔ اور لوہے کے بلند ایڑیوں والے جوتے بنائے جو گھس گئے۔ جب جا کر انہیں ایسا شخص ملا، جس میں انہوں نے اس جہان کی خوشبو پائی۔ اور بہت سے لوگ اسی حسرت میں مر گئے اور کامیاب نہ ہوئے۔ اور انہیں اس شخص (صلاح الدین) جیسا آدمی نہ ملا۔ لیکن تو نے اپنے ہی گھر میں اس شخص جیسا آدمی پا لیا، اور اس سے روگردان ہو گیا۔ یہ سوائے غفلت اور بلائے عظیم کے کچھ نہیں۔

اور مولانا ہمیشہ مجھے شیخ المشائخ صلاح الحق والدین کے حق کے بارے میں، خدا ان کے ملک کو ہمیشہ قائم رکھے، یہ نصیحت کرتے رہے کہ وہ ایک بڑے آدمی ہیں۔ اور جب سے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، میں نے کسی دن بھی مولانا سے سوائے اس کے اور کچھ نہیں سنا کہ آپ کو "سیّدنا"، "مولانا"، "عارفِ پروردگار" اور "عارف خالقنا" وغیرہ ناموں کے سوا کسی اور نام سے نہ پکارا کرتے تھے۔ کیا یہ نہیں کہ فاسد اغراض کا حجاب اس پر چھا گیا ہے کہ وہ آج یہ کہتا ہے شیخ صلاح الدین کیا چیز ہے۔ شیخ صلاح الدین

---

[1] ابن چاؤش سے مراد نجم الدین بن خرم چاؤش ہے۔ یہ صاحب مولانا رومی کے مرید تھے اور مولانا نے اپنے ایک خط میں انھیں "فرزندِ عزیز" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ یہ صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو نہیں چاہتے تھے کہ مولانا شیخ صلاح الدین کو اپنا جانشین بنائیں۔

[2] مراد شیخ صلاح الدین فریدون زرکوب قونوی سے ہے۔ یہ صاحب مولانا رومی کے خاص عاشقوں میں سے تھے۔ اور شمس تبریزی کے بعد یہ متواتر دس سال مولانا کے پاس رہے۔

اس کا کیا بگاڑ سکا ہے، سوائے اس کے کہ وہ اس کو ایک تاریک کنویں میں گرا ہوا دیکھ کر اپنی شفقت کی وجہ سے یہ کہتا ہے کہ تاریک کنویں میں نہ گرو۔ اس کی ایسی شفقت تو باقی لوگوں پر ہی ہے۔ اور وہ اس کی شفقت کو برا جانتا ہے۔ کیونکہ جس وقت تو کوئی چیز کرتا ہے، شیخ صلاح الدین اسے پسند نہیں کرتا۔ اور تو مقہور ہوتا ہے۔ اور جب تجھ پر اس کا قہر اور غصہ ہو تو انوار کا جلوہ تُو کیسے دیکھے گا۔ بلکہ جس وقت تو حجاب میں ہو گا اور جہنم کے دخان سے سیاہ ہو جائے گا تو وہ تجھے نصیحت کرے گا اور تجھ سے کہے گا کہ میرے قہر میں نہ رہ۔ اور میرے قہر و غضب کے مقام سے نکل کر میرے لطف و رحم کے مقام میں آجا۔ کیونکہ جب تو کوئی فعل میری رضا کے مطابق کرے گا، تو میرے لطف کے مقام میں داخل ہو جائے گا، جس سے تیرا دل روشن ہو گا اور تُو نورانی بن جائے گا۔ وہ تو ایسی نصیحت تیرے فائدہ کے لیے کرتا ہے۔ اور تو اس شفقت اور نصیحت کو غرض پر مبنی خیال کرتا ہے۔ ایسا شخص کبھی کسی غرض اور عداوت سے ایسا نہیں کرتا۔ کیا یہ بات صحیح نہیں کہ جب تو حرام شراب یا بھنگ پی کر یا راگ سن کر یا کسی اور وجہ سے مست ہو جائے تو اس وقت تو اپنے ہر دشمن سے راضی ہو جاتا ہے اور ان کو معاف کر دیتا ہے، اور ان کے ہاتھ پاؤں چومنے پر مائل ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت کافر اور مومن دونوں تیری نظر میں مساوی اور ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔

اس لیے شیخ صلاح الدین ہی ایسے ذوق اور مستی کا موجب ہے۔ اور ذوق کے تمام سمندر اس کے پاس ہیں۔ پس اس کو کسی سے بغض یا کوئی غرض کیسے ہو گی۔ معاذ اللہ! یقیناً وہ لوگوں سے شفقت اور رحم دلی کے باعث اس طرح کہتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اسے جس کو یہ عظمت اور ملک حاصل ہو، ان لوگوں سے کیا غرض ہے جو مکڑی اور مینڈک ہیں۔ اور یہ مسکین کی طرح ایک دوسرے کے برابر ہوں گے۔ کیا یہ بات درست

نہیں کہ آبِ حیات ظلمات میں واقع ہے، جیسا کہ لوگوں نے کہا۔ بے شک یہ ظلمات اولیاء کے جسم ہیں، اور آبِ حیات ان کے اندر ہے۔ اگر تو ظلمات کو مکروہ جانتا ہے اور اس سے متنفر ہے، تو تجھے آبِ حیات کیسے ملے گا۔ کیا یہ بات درست نہیں ہے کہ تو مخنث لوگوں سے برائی اور بد معاش لوگوں سے بدی بھی سیکھنے کا ارادہ کرے تو ایسا ہر گز نہ کر سکے گا۔ یہاں تک کہ تو ہزار تکلیفیں اٹھائے، اور اپنے ارادہ کے خلاف باتیں کرے، پھر کہیں جا کر کامیاب ہو گا۔ پھر تو آبِ حیات کیسے حاصل کر سکے گا، جو ایک باقی اور سرمدی چیز ہے۔ اور یہ اولیاء اور انبیاء کا مقام ہے۔ شیخ تجھے کوئی ایسا حکم نہ دے گا، جیسا کہ ہمارے پہلے مشائخ نے حکم دیا کہ اولاد اور مال و منصب کو ترک کر دو۔ بلکہ یہ حکم دیا کرتے تھے کہ تم اپنی بیوی کو چھوڑ دو اور ہم اس کو اپنی بیوی بنا لیتے ہیں۔ اور وہ لوگ اس کو بھی برداشت کر لیتے تھے۔ اور تمہاری یہ حالت ہے کہ تم کو ایک معمولی سے بات کا حکم دیتے ہیں اور تم اسے برداشت نہیں کرتے۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو مکروہ سمجھو۔ لیکن وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ یہ لوگ تو اندھے ہیں اور جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور یہ نہیں سوچتے کہ جب کوئی شخص کسی بچے یا عورت پر عاشق ہو جائے تو اس کے آگے کیسے جھک جاتا ہے اور اس کی نازبرداریاں کرتا ہے اور پوری کوشش سے اس کے لیے مال خرچ کرتا ہے۔ اور دن رات بطیب خاطر ایسا کرتا رہتا ہے، اور اس سے ملول نہیں ہوتا۔ پس اگر اس کی محبت شیخ سے اور اللہ سے کم درجہ کی بھی ہو، اور اس کے معمولی حکم کو ترک کر دے اور اس سے روگرداں ہو جائے، تو جان لو کہ وہ عاشق اور طالب نہیں ہے۔ اور اگر وہ عاشق اور طالب ہوتا ہے تو جو ہم نے کہا ہے، اس سے کئی گنا زیادہ بات برداشت کر لیتا ہے، جو اسے شہد اور شکر سے زیادہ لذیذ معلوم ہوتی ہے۔

مقصود سب کا ایک ہے

فرمایا کہ توقات[1] کی طرف جانا چاہیے۔ اُدھر آب و ہوا گرم ہے۔ اگرچہ انطاکیہ گرم مقام ہے، لیکن وہاں زیادہ تر رومی ہیں۔ وہ ہماری بات نہیں سمجھتے۔ اگرچہ رومیوں میں بھی بعض لوگ ایسے ہیں، جو ہماری زبان سمجھتے ہیں۔ ایک دن میں نے ایک جماعت سے بات کی۔ ان میں کافروں کا ایک گروہ بھی تھا۔ بات کے دوران میں وہ رونے لگے۔ اور ذوق میں آگئے اور حال ان پر طاری ہو گیا۔ سوال کیا کہ یہ کیا سمجھے۔ اور انہوں نے کیا جانا۔ چیدہ مسلمانوں میں سے بھی ہزار میں سے ایک آدمی یہ باتیں سمجھتا ہے۔ یہ کافر کیا سمجھے کہ رونے لگا۔ فرمایا کہ یہ ضروری نہیں کہ وہ نفسِ مضمون کو سمجھیں۔ اس بات کی جو اصل ہے وہ اسے سمجھے ہیں۔ آخر سب ہی خدا کی وحدت کے قائل ہیں۔ اور مانتے ہیں کہ خدا خالق ہے اور رازق ہے۔ اور ہر تصرف اور رجوع اسی کی طرف ہے۔ عذاب اور عفو اسی سے ہے۔ جب انہوں نے یہ بات سنی، اور یہ بات خدا کی تعریف ہے اور اسی کا ذکر ہے تو ان سب کو اضطراب، شوق اور ذوق حاصل ہوا۔ اس بات سے ان کے معشوق اور مطلوب کی خوشبو آتی ہے۔ اگرچہ راستے مختلف ہیں۔ بعض روم کے راستہ سے جاتے ہیں۔ بعض چین کے راستہ سے۔ بعض دریا کے راستہ ہندوستان اور یمن سے۔ پس اگر تو راستوں پر نظر کرے تو اختلاف بہت بڑا اور بُعد حد سے زیادہ ہے۔ لیکن مقصود پر تو نظر کرے تو سب متفق ہیں۔ اور سب ایک ہیں۔ اندر سے سب کعبہ پر متفق ہیں۔ باطنوں کو کعبہ سے بے حد ارتباط، محبت اور عشق ہے۔ وہاں کسی اختلاف کے لیے گنجائش نہیں۔ وہ تعلق نہ کفر سے ہے اور نہ ایمان سے۔ یعنی وہ تعلق ان مختلف راستوں سے مخلوق نہیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ جب وہاں پہنچ گئے تو وہ مباحثہ، جنگ اور اختلاف جو انہوں نے راستہ میں کیا کہ اس نے

---

[1] توقات مشرقی قونیہ میں ایک شہر ہے۔

اس سے کہا تو جھوٹا اور کافر ہے۔ اور اس دوسرے نے اس کو ایسا ظاہر کیا۔ بے حقیقت نکلا۔ جب کعبہ میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ جنگ راستوں میں تھے۔ مقصود ان سب کا ایک تھا۔ مثلاً اگر پیالے میں جان ہوتی تو وہ کاسہ گر کا غلام ہوتا اور اس سے عشق کرتا۔ اب یہ جو پیالہ بنایا ہے، بعض کہتے ہیں کہ اسے ایسے ہی دستر خوان پر رکھنا چاہیے۔ اور بعض کہتے ہیں، اسے اندر سے دھو لینا چاہیے۔ اور بعض کہتے ہیں، اسے دھونے کی حاجت نہیں۔ اختلاف ان چیزوں میں ہے۔ لیکن یہ کہ پیالے کا کوئی خالق اور بنانے والا ہے اور وہ خود بخود نہیں بن گیا، اس پر سب متفق ہیں۔ اور اس پر کسی کو اختلاف نہیں۔ آمدم برسرِ مطلب اب سب انسان دل کے اندر سے ازروئے باطن خدا کے محب ہیں۔ اور اس کے طالب ہیں۔ اسی سے عاجزی کرتے ہیں۔ ہر بات میں اس پر بھروسہ کرتے ہیں اور کسی جزو کو اپنے آپ پر متصرف اور قادر نہیں سمجھتے۔ یہ نہ کفر ہے اور نہ ایمان۔ اور باطن میں اس کا کوئی نام نہیں۔ لیکن جب باطن کی طرف سے حقیقت کا پانی زبان کے پرنالہ سے رواں ہوتا ہے اور جم جاتا ہے تو وہ نقش و عبارت بن جاتا ہے۔ یہاں اس کا نام کفر اور ایمان اور نیک اور بد ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے نباتات جب زمین سے اگتی ہے تو ابتداء میں اس کی اپنی کوئی خاص شکل نہیں ہوتی۔ اور جب وہ اس دُنیا میں رونما ہوتی ہے تو ابتدائے کار میں لطیف و نازک اگتی ہے۔ اور اس کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ جوں جوں وہ اس دُنیا میں قدم بڑھاتی ہے، غلیظ اور کثیف ہوتی جاتی ہے۔ اور دوسرا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن جب مومن اور کافر اکٹھے بیٹھتے ہیں، جب تک وہ کچھ کہتے نہیں، سب یگانہ ہیں۔ خیال کا مواخذہ نہیں۔ درونِ عالم آزادی ہے۔ اس واسطے کہ خیالات لطیف ہیں۔ ان پر حکم نہیں چلایا جا سکتا کہ :

نحنُ نحکم بالظاھر واللہ یتولّی السرائر۔ ہم ظاہر سے حکم لگاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھیدوں کو پسند کرتا ہے۔

تیرے اندر ان خیالات کو خدا پیدا کرتا ہے۔ سو ہزار جد وجہد اور لاحول سے تو انہیں اپنے آپ سے دور نہیں کر سکتا۔ پس وہ جو کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کو آلہ کی ضرورت نہیں۔ تُو نہیں دیکھتا کہ ان تصورات اور خیالات کو وہ بغیر کسی آلہ، کسی قلم اور کسی رنگ کے تیرے اندر پیدا کر دیتا ہے۔ وہ خیالات مرغانِ باد اور آہوانِ وحشی کی طرح ہیں کہ پیشتر اس کے کہ تُو انہیں پکڑے اور قفس میں قید کرے، شریعت کی رو سے انہیں فروخت کرنا جائز نہیں۔ اس واسطے کہ تجھے یہ مقدور نہیں کہ مرغِ باد کو فروخت کرے۔ کیونکہ خریداری میں تسلیم شرط ہے۔ اور جب تجھے مقدور ہی نہیں تو تسلیم کیا کرے گا؟ پس خیالات جب تک باطن میں ہیں، بے نام و نشان ہیں۔ ان پر حکم نہیں لگایا جا سکتا، نہ کفر سے نہ اسلام سے۔ کوئی قاضی یہ پوچھتا ہے کہ کیا تو نے اپنے اندر ایسا اقرار کیا؟ یا ایسی فروخت کی یا قسم کھائی کہ تُو نے اپنے اندر ایسا خیال تو نہیں کیا؟ وہ ایسا نہیں کہتا۔ اس واسطے کہ باطن میں کسی کا حکم نہیں۔ خیالات مرغانِ باد ہیں۔ اب جب خیال عبارت میں آ گیا، تو اس گھڑی اس وقت اس پر کفر اور اسلام، نیک اور بد کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ جیسا اجسام کے لیے ایک عالم ہے، اس طرح تصورات کا عالم ہے، تخیّلات کا عالم ہے۔ توہمات کا عالم ہے اور خداوند تعالیٰ سب عالموں سے دور ہے۔ وہ نہ داخل ہے، نہ خارج۔ اب ان تصورات میں خداوند تعالیٰ کے تصرفات پر غور کر کہ وہ بے چون و چگونہ اور بغیر قلم اور بغیر آلہ کے ان کی مصوری کرتا ہے۔ آخر اگر یہ خیال یا تصور سینہ کو پھاڑ دے اور ریزہ ریزہ کر دے تو وہ خیال تجھے اس میں نہیں ملے گا۔ خون میں نہیں ملے گا، رگ میں نہیں ملے گا، اوپر نہیں ملے گا۔ نیچے نہیں ملے گا۔ کسی حصہ میں نہیں ملے گا۔ بغیر جہت کے اور بے چون و چگونہ۔ اور اسی طرح وہ باہر بھی نہیں ملے گا۔ پس جب اس کے تصرفات، ان تصورات میں اتنے لطیف ہیں کہ بے نشان ہیں۔ تو وہ خود کہ ان سب کو پیدا کرنے والا ہے، دیکھ تو کسی

کتنا بے نشان اور کتنا لطیف ہے۔ کیونکہ یہ ڈھانچے انسانوں کی معنویت کی نسبت زیادہ کثیف ہیں۔ یہ معانی جو بے چون وچگونہ لطیف ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی لطافت کے مقابلہ میں وہ جسم اور صورتیں ہیں جو کثیف ہیں۔

ترجمہ شعر: اگر پردوں سے اس پاک روح کو دکھا دیتا تو انسانوں کی جان اور عقل اس کے مقابل میں بدن ہی شمار ہوتی۔

عاشق مختارِ کل نہیں ہوتا

اور خداوند تعالیٰ اس عالمِ تصورات میں نہیں سماتا۔ وہ کسی عالم میں نہیں سماتا۔ کیونکہ اگر وہ عالمِ تصورات میں سما جائے تو ضروری ہے کہ مصور اس کا احاطہ کر لے۔ اس صورت میں وہ خالقِ تصورات نہیں رہتا۔ پس معلوم ہوا کہ وہ تمام عالموں سے دُور ہے۔

لقد صدق الله رسوله الرّءيا بالحق لتدخلن المسجد الحرام ان شاء الله. (فتح: ع ۴)	خدا نے اپنے رسول کا خواب سچا کر دکھایا کہ اگر خدا چاہے تو مسجد حرام میں داخل ہوں گے۔

سبھی کہتے ہیں کہ ہم کعبہ میں آئیں گے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ انشاء اللہ ہم آئیں گے، وہ لوگ جو استثنیٰ کرتے ہیں[1]، عاشق ہیں۔ اس لیے کہ عاشق اپنے آپ کو مختارِ

---

[1] گر خدا خواہد نگفتند از بطر پس خدا بنمودشان عجز بشر
ترک استثنا مرادم قسوتیست نے ہمیں گفتن کہ عارض حالتیست
اے بسا نوردہ استثنا بگفت جانِ او با جانِ استثناست جفت
لیک استثناء و تسبیح خدا زاہتمامِ خود بد از ایشاں جدا
ذکر استثناء و جرم ملتوی گفتہ شد در ابتدائے مثنوی
سیر استثناء ست ایں حزم و حذر زاں کہ خرد ابر نماید ایں قدر

کل نہیں دیکھتا۔ وہ معشوق کو مختارِ کار سمجھتا ہے۔ پس وہ کہتا ہے کہ اگر معشوق چاہے تو ہم اندر آئیں۔ اب اہلِ ظاہر کے نزدیک مسجد الحرام وہ کعبہ ہے کہ جہاں خلقت جاتی ہے اور عاشقوں اور خاص آدمیوں کے نزدیک وہ خدا کا وصال ہے۔ پس وہ کہتے ہیں کہ اگر خدا چاہے تو ہم وہاں پہنچیں اور دیدار سے مشرف ہوں۔ لیکن یہ جو معشوق کہتا ہے، انشاء اللہ، وہ عجیب ہے۔ اس کی بات عجیب ہے۔ عجیب ہستی کو چاہیے کہ بات بھی عجیب ہی سنے۔ خدا کے ایسے بندے بھی ہیں کہ وہ اس (خدا) کے معشوق ہیں، محبوب ہیں۔ خداوند تعالیٰ ان کا طالب ہے۔ اور جو وظیفہ عاشقوں کا ہے، وہ ان کے لیے پڑھتا ہے۔ پس ایسے اسرار اور احوال کس طرح خلقت سے کہے جا سکتے ہیں۔ یہاں قلم پہنچا اور اس کا سر ٹوٹا۔ جو شخص اونٹ کو منارہ پر نہیں دیکھ رہا وہ بال کا ایک تار اونٹ کے منہ میں کیسے دیکھتا ہے۔ آمدم برسر مطلب، ہم پہلی بات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اب وہ عاشق ہیں جو ان شاء اللہ کہتے ہیں، یعنی کام معشوق کا ہے۔ اگر معشوق چاہے تو ہم کعبہ کے اندر آ جائیں۔ یہ خدا میں غرق ہیں، وہاں غیر نہیں سماتا۔ اور غیر کی یاد حرام ہے، غیر کے لیے کیا جگہ۔ جب تک کوئی اپنے آپ کو محو نہ کرے، وہاں نہیں سماتا۔ لیس فی الدار غیر اللہ۔ یہ جو فرماتے ہیں کہ رسول الرؤیا، یہ عاشقوں اور صادقوں کے خواب ہیں۔ اور اُس کی تعبیر اُس عالم میں ظاہر ہوتی ہے، بلکہ تمام عالموں کے احوال ایک خواب ہیں۔ یہ ایسا ہے کہ خواب میں اپنے آپ کو گھوڑے پر سوار دیکھے، تو مراد کو پہنچتا ہے۔ گھوڑے کو مراد سے کیا نسبت؟ اور اگر تو دیکھے کہ تجھے کھرے درہم دیے گئے ہیں، تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ تو کسی عالم سے درست اور نیک بات سنے گا۔ درہم کا بات سے کیا تعلق؟ اور اگر تو دیکھے کہ تجھے پھانسی دی گئی ہے تو رئیسِ قوم بنے۔ اب پھانسی کو ریاست اور سرداری سے کیا علاقہ؟ اسی طرح ہم نے جو احوالِ عالم بیان کیے ہیں، ایک خواب ہے کہ :

الدُّنیا لحلم النائم[1] یہ دُنیا سوئے ہوئے کا خواب ہے۔

اس کی تعبیر اُس عالم میں کچھ اور ہوتی ہے، کیونکہ وہ اس عالم سے نہیں ہوتا۔ خدائی معبّر اس کی تعبیر کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس پر سب کچھ منکشف ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک باغبان باغ میں آئے اور درختوں پر نظر ڈالے، تو شاخوں پر میوہ دیکھے بغیر حکم لگا دے کہ یہ خرما ہے، یہ انجیر ہے، یہ انار ہے، یہ امرود ہے اور یہ سیب ہے۔ اس کے لیے یہ اس لیے ممکن ہے کہ وہ یہ علم جانتا ہے۔ پس خدائی معبّر کو قیامت کی ضرورت نہیں کہ ان خوابوں کی تعبیر وہاں پر دیکھے کہ کیا ہوا اور اس خواب کا کیا نتیجہ نکلا۔ اس نے پہلے ہی دیکھا ہوا ہے کہ نتیجہ کیا نکلے گا۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے باغبان پہلے ہی سے جانتا ہے کہ بے شک یہ شاخ کیا پھل دے گی۔ مال، زن، لباس جیسی تمام اشیائے عالم کسی اور وجہ سے مطلوب ہیں۔ اس کی ذات کے لیے مطلوب نہیں ہیں۔ تو نہیں دیکھتا کہ اگر تیرے پاس سو ہزار درہم ہوں اور تو بھوکا ہو۔ اور تجھے روٹی نہ ملے کہ تو کھا سکے، تو درہم غذا نہیں بن سکتے۔ زن بیٹا پیدا کرنے اور شہوت پوری کرنے کے لیے ہے۔ لباس سردی کو روکنے کے لیے ہے۔ اسی طرح تمام چیزوں کا سلسلہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ فی ذاتہٖ مطلوب ہے اور اسے محض اسی کی وجہ سے چاہتے ہیں، نہ کہ کسی دوسری چیز کی خاطر۔ جب وہ سب سے ورے ہے اور سب سے بہتر ہے، اور سب سے شریف تر ہے، تو اس کو اس سے کسی کم تر چیز کے لیے کیسے چاہیں۔ جو اس تک پہنچ جاتے ہیں تو مطلوب کلی تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں سے آگے کوئی راستہ نہیں۔ آدمی کا یہ نفس محل شبہ و اشکال ہے۔ کسی وجہ سے بھی اس سے شبہ اور اشکال کو دور نہیں کیا جا سکتا، سوائے اس کے کہ وہ عاشق ہو جائے۔ اس کے بعد اس میں شبہ اور اشکال نہیں رہے گا۔ کیونکہ:

---

[1] این جہاں را کہ بصورت قائم است گفت پیغمبر کہ حلم نائم است
ہم چنیں دُنیا کہ حلم نائم است خفتہ پندارد کہ او خود دائم است

حُبك الشي يعمي ويصم. کسی چیز کی محبت[1] تجھے اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے۔

جب ابلیس نے آدم کو سجدہ نہ کیا اور حکم کی مخالفت کی، تو کہا:

خلقتني من نار وخلقته من طين. تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔

میری ذات آگ سے ہے اور اس کی ذات مٹی سے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ادنیٰ کو اعلیٰ سجدہ کرے۔ ابلیس کو اس جرم مقابلہ کرنے اور خدا سے جھگڑا کرنے پر ملعون گردانا گیا، اور اسے دور کر دیا۔ ابلیس نے کہا، اے خدا! آہ سب کچھ تُو نے کیا، اور یہ تیرا فتنہ تھا۔ اور لعنت تو مجھ پر کرتا ہے اور مجھے دور کرتا ہے۔ اور جب آدم نے گناہ کیا تو خداوند تعالیٰ نے آدم کو بہشت سے نکال باہر کیا۔[2] خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ اے آدم! جب میں نے گرفت کی اور اس گناہ پر جو تو نے کیا، تجھے ڈانٹا تو کیوں تو نے مجھ سے حث نہ کی؟ آخر تیرے پاس دلیل تھی۔ تو نے یہ کیوں نہ کہا کہ سب کچھ تجھ ہی سے ہے۔ اور تو نے ہی کیا۔ جو تو چاہتا ہے دُنیا میں وہی کچھ ہوتا ہے اور جو تو نہیں چاہتا وہ ہرگز نہیں ہوتا۔ تیرے پاس یہ واضح اور صحیح دلیل تھی، تو نے کیوں پیش نہ کی؟ جواب دیا اے خدا! میں جانتا تھا۔ مگر میں نے تیرے حضور میں ادب[3] ترک نہ کیا، اور عشق نے اجازت نہ دی کہ مواخذہ کروں۔

---

[1] در وجود تو شوم من منعدم چوں مجسم حب یعمی و یصم
کوری عشقست ایں کوری من حب یعمی و یصم است اے حسن
پس میند جملہ را باظم ورم حبک الاشیاء یعمی و یصم

[2] جرم او از سجدۂ تقصیر من از دانہ نے بآں بیچارہ می سازی نہ با ما ساختی

[3] خموش اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

فرمایا کہ یہ شرع ایک گھاٹ ہے، جس سے پانی پیتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بادشاہ کی کچہری ہوتی ہے، جس میں بادشاہ کے احکام امر و نہی کے متعلق سیاست و عدل کے متعلق اور خاص و عام لوگوں کی داد رسی کے بارے میں جاری ہوتے ہیں۔ شاہِ دیوان کے احکام حد سے زیادہ ہیں جو شمار میں نہیں آسکتے۔ اور بہت خوب اور فائدہ مند ہیں۔ دُنیا کا قوام اس سے قائم ہے۔ فقیروں اور درویشوں کا کام بادشاہ کی دربار داری ہے۔ حاکم کے علم کا جاننا کہاں اور اس کے احکام کے علم کو پہچاننا اور حاکم کے علم کو سمجھنا اور بادشاہ کی مصاحبت کہاں۔ بہت بڑا فرق ہے، ان دو میں۔ یہ لوگ اور ان کے احوال ایسے ہی ہیں جیسے ایک مدرسہ ہو۔ اس میں فقیہ بیٹھے ہوں۔ اور ہر فقیہ کو مدرس اس کی استعداد کے مطابق کپڑے دیتا ہو۔ ایک کو دس، ایک کو بیس، ایک کو تیس۔ ہم ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق بات کرتے ہیں، اور ہم کہتے ہیں:

کلم الناس علیٰ قدرِ عقولھم۔ لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات کرو۔

اوپر اور نیچے کی تمیز بے معنی ہے

ہر شخص اس عمارت کو ایک خاص نیت سے تیار کرتا ہے۔ اظہارِ کرم کے لیے یا نام آوری کے لیے یا ثواب کے لیے۔ اور خداوند تعالیٰ کا مقصد اولیاء کے مرتبہ کو بلند کرنا اور ان کی مٹی اور مقابر کی تعظیم کرنا ہے۔ وہ اپنی تعظیم کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ اپنے نفس میں خود معظم ہیں۔ چراغ اگر چاہے کہ اسے بلندی پر رکھا جائے تو وہ دوسروں کی خاطر یہ چاہتا ہے۔ اپنی خاطر نہیں چاہتا۔ اس کے لیے اوپر کیا اور نیچے کیا۔ وہ جہاں بھی ہے چراغ روشن ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا نور دوسروں کو پہنچے۔ یہ آفتاب جو آسمان پر ہے اگر نیچے ہو

تو بھی وہی آفتاب ہے۔ مگر اس طرح دُنیا تاریک ہو گی۔ وہ اوپر اپنے لیے نہیں، دوسروں کی خاطر ہے۔ ان کا حاصل اوپر نیچے اور دُنیا کی تعظیم سے منزہ ہے اور فارغ ہے۔ تجھے اس عالم کے ذرّہ بھر ذوق اور لطف کا ایک لحہ اپنا چہرہ دکھاتا ہے۔ تو اسی وقت تو اوپر اور نیچے، خواجگی اور ریاست اور اپنے آپ سے اور اس سے جو تجھ سے نزدیک تر ہے تو بیزار ہو جاتا ہے۔ اور تجھے ان کی یاد تک نہیں آتی۔ یہ کہ کان اور معدن ہیں اور اس نور اور ذوق کا اصل ہیں۔ اوپر اور نیچے کے مقید کیسے ہو سکتے ہیں۔ ان کا فخر خدا سے ہے۔ اور خدا اوپر اور نیچے سے مستغنی ہے۔ یہ "اوپر" اور "نیچے" ہمارے لیے ہے۔ کیونکہ ہم سر اور پاؤں رکھتے ہیں۔ مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا:

لاتفظلونی علیٰ یونس بن متی بان کان عروجه فی بطن الحوت و عروجی کان فی السماء علی العرش.

مجھے یونسؑ بن متی پر برتری نہ دو کہ ان کی معراج بطن ماہی میں ہوئی اور میری معراج آسمانِ عرش پر ہوئی۔ (حدیث نبوی)

یعنی اگر آپ مجھے یونسؑ پر فضیلت دیں تو اس وجہ سے نہ دیں کہ اسے عروج مچھلی کے پیٹ میں ملا اور مجھے آسمان پر[1]۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نہ اوپر ہے نہ نیچے۔ اس کی تجلی اوپر بھی وہی ہے اور نیچے بھی وہی ہے۔ اور مچھلی کے پیٹ میں بھی وہی ہے۔ وہ "اوپر" اور "نیچے" سے منزہ ہے۔ اس کے لیے سب برابر ہیں۔ کئی لوگ ہیں جو کام کرتے ہیں۔ ان کی غرض کچھ اور چیز، اور خدا کا مقصود کچھ اور چیز ہوتی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے جب چاہا کہ محمد رسول ﷺ کا دین عظمت پائے، پھیلے اور ابد تک باقی رہے، تو دیکھ کہ قرآن کی کتنی تفسیریں بنائی ہیں۔ دس دس جلدیں اور آٹھ آٹھ جلدیں اور چار چار جلدیں۔ ان کی غرض

---

[1] گفت پیغمبر کہ معراجِ مرا — نیست از معراجِ یونس اجتبا
آنِ من بالا و آنِ او نشیب — زانکہ قربِ حق برونست از حسب
قرب نہ بالا نہ پستی رفتن است — قربِ حق از حبس ہستی رستن است

اپنے علم و فضل کا اظہار ہے۔ زمخشری نے اپنے علم و فضل کے اظہار کے لیے کشاف میں بڑی دقیق نحو اور لغت اور فصیح عبارت استعمال کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مقصود حاصل ہو۔ یہ ہے دینِ محمد ﷺ کی تعظیم۔ پس ساری دُنیا بھی کارِ حق کرتی ہے۔ اور غرض حق سے غافل ہے۔ اس کا مقصد کچھ اور ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ دُنیا قائم رہے۔ یہ شہوت میں مشغول ہیں۔ اپنے مزے کی خاطر کسی عورت سے شہوت بازی کرتے ہیں۔ اس سے بیٹا پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ اپنی خوشی اور لذت کی خاطر کام کرتے ہیں۔ یہ سب خود ہی دُنیا کی بقا کا باعث بن جاتا ہے۔ پس در حقیقت یہ خدا کی بندگی نہیں کرتے، یہ اس کی نیت ہی نہیں کرتے۔ اسی طرح یہ مسجدیں بناتے ہیں۔ اس کے در و دیوار اور چھت پر اتنا خرچ کرتے ہیں۔ لیکن اس کا اعتبار قبلہ کے درست ہونے پر ہے۔ اور عنایت اور بڑائی قبلہ کی وجہ سے ہے۔ اور اس کی تعظیم زیادہ ہوتی ہے۔ ہر چند کہ ان کا مقصد وہ نہ تھا۔ اولیاء کی یہ بزرگی از روئے صورت نہیں۔ واللہ ان کے لیے بلندی اور بزرگی ہے۔ لیکن لاثانی اور بے مثال۔ آخر یہ درہم پیسہ سے بلند ہیں۔

اس کے کیا معنی ہیں کہ وہ پیسے سے بلند ہیں؟ کیونکہ ظاہری لحاظ سے وہ پیسے سے بلند نہیں۔ درہم کی بلندی صورت کی وجہ سے نہیں۔ اگر تو درہم کو چھت پر رکھ دے، اور سونے کو نیچے (فرش پر) تو سونا ہر حالت میں قطعی طور پر اونچا ہو گا۔ سونا درہم سے اونچا ہے۔ لال اور موتی سونے سے اونچے ہیں۔ خواہ انھیں اوپر رکھو یا نیچے۔ اسی طرح آٹے کی بھوسی چھلنی میں اوپر ہوتی ہے۔ اور آٹا نیچے ہوتا ہے۔ آٹا اگرچہ نیچے ہے، پھر بھی بھوسی سے بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ پس تو کہے گا کہ آٹے کی بلندی صورت کی رو سے نہیں۔ ہاں عالم معنی میں چونکہ اس میں وہ جوہر موجود ہے، وہ ہر حال میں اونچا ہے۔

عقل کا سایہ ہر حال میں ضروری ہے

ایک شخص داخل ہوا، فرمایا کہ وہ محبوب اور منکسر المزاج ہے۔ اور یہ خصوصیت اس کے جوہر کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ وہ شاخ جس پر پھل زیادہ ہو، وہ پھل اسے جھکا دیتا ہے۔ اور وہ شاخ جس پر پھل نہ ہو اپنا سر اونچا رکھتی ہے۔ جیسے سپیدہ کا درخت۔ اور جب پھل حد سے زیادہ ہو جاتا ہے تو ستون کھڑے کر کے اسے سہارا دیتے ہیں تاکہ وہ بالکل ہی نہ جھک جائے۔ پیغمبر ﷺ بڑے متواضع تھے۔ اس لیے کہ تمام دُنیا کے پھل اوّل اور آخر ان پر جمع تھے۔ لازمی طور پر وہ سب سے زیادہ متواضع تھے۔

ماسبق رسول الله احد بالسلام۔ سلام کہنے میں کسی نے رسول اللہ ﷺ پر سبقت نہ کی۔

کہا پیغمبر ﷺ سے پہلے کوئی انہیں سلام نہ کر سکا۔ اس لیے کہ پیغمبر علیہ السلام اس سے پیش دستی فرماتے۔ اور انتہائی فروتنی سے سلام کہتے۔ اور اگر بالفرض سلام پہلے نہ کہتے تو بھی فروتنی آپ ہی کی طرف سے ہوتی اور آپ ہی کلام میں سبقت فرماتے۔ اس لیے کہ وہ سلام آپ سے سیکھتے اور آپ ہی سے سنتے۔ سب اوّلین اور آخرین آپ ہی کے پرتو سے سب کچھ پاتے اور وہ آپ ہی کا سایہ ہیں۔ اگر کسی کا سایہ اس سے پہلے گھر کے اندر آجائے تو وہ سایہ اس کے آگے ہوتا ہے۔ درحقیقت اگرچہ سایہ سبقت لے جاتا ہے، آخری صورت میں سایہ اس سے سابق ہو، تو یہ اس کی فرع ہے۔ اور یہ اخلاق اب سے نہیں۔ یہ اس وقت آدم کے ذرّات میں اجزا بنا ہوا تھا۔ بعض روشن اور بعض نیم روشن اور بعض تاریک۔ اس گھڑی وہ ظاہر ہو رہے ہیں۔ مگر یہ تابانی اور روشنی سابقہ ہے۔ اور آدم میں آپ کا ذرّہ سب سے صاف تر، روشن تر اور متواضع تر تھا۔ بعض اوّل دیکھتے ہیں اور بعض آخر۔ جو آخر دیکھتے ہیں، ارجمند اور بزرگ ہیں۔ اس لیے ان کی نظر عاقبت اور آخرت

پر ہے جو اوّل پر نظر کرتے ہیں، یہ خاص تر ہیں۔ وہ کہتے ہیں، اس کی کیا ضرورت ہے کہ ہم آخر پر نظر کریں۔ جب انہوں نے اوّل میں گندم بوئی ہے تو آخر میں جو نہیں اگیں گے۔ اور جنھوں نے جو بوئے ہیں، ان کے لیے گندم نہیں اگے گی۔ پس ان کی نظر اوّل پر ہے اور ایک دوسری قوم خاص تر لوگ ہیں۔ وہ نہ اوّل پر نظر کرتے ہیں نہ آخر پر۔ انہیں اوّل اور آخر یہ وہی نہیں آتا۔ یہ لوگ خدا میں غرق ہیں۔ اور ایک دوسری قوم ہے کہ یہ دُنیا میں غرق ہے۔ یہ لوگ اوّل اور آخر کو نہیں دیکھتے۔ انتہائی غفلت کی وجہ سے یہ دوزخ کا ایندھن ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اصل محمد ﷺ ہی ہوئے ہیں کہ :

لولاک ماخلقت الافلاک۔ اگر تو نہ ہوتا تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا۔

اور ہر چیز کہ موجود ہے، آپ ہی کے شرف، تواضع، حکم اور مقاماتِ بلند سے ہے۔اور سب آپ کی بخشش ہے۔ اور آپ کا سایہ ہے۔ اس لیے کہ آپ ہی سے پیدا شدہ ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے ہاتھ جو کچھ کرتا ہے، عقل کے سایہ سے کرتا ہے۔ اس لیے کہ عقل کا سایہ اس پر ہے۔ ہر چند کہ عقل کا سایہ نہیں ہے۔ لیکن اس کا سایہ بے سایہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے معنی کی ہستی بے ہستی ہے۔ اگر آدمی پر عقل کا سایہ نہ ہو تو اس کے تمام اعضاء معطل ہو جائیں۔ ہاتھ کسی قاعدے سے نہ پکڑے، پاؤں سیدھے راستہ پر نہ چل سکیں۔ آنکھ کوئی چیز نہ دیکھے۔ کان جو کچھ سنے ٹیڑھا سنے۔ پس عقل کے سایہ سے یہ اعضاء تمام کام، قاعدہ، خوش اسلوبی اور نتیجہ خیز طریق پر کرتے ہیں۔ پس دراصل یہ سب کام عقل ہی سے ہوتے ہیں۔ اعضاء اوزار ہیں۔ یہ ایسا ہے جیسے ایک آدمی بہت بڑا خلیفۂ وقت ہو۔ وہ عقلِ کل کی طرح ہے۔ دوسرے مردوں کی عقلیں اس کے اعضاء ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں، اسی کے سایہ سے ہوتا ہے۔ اور اگر ان سے کجی پیدا ہوتی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل نے ان پر سے اپنا سایہ اٹھالیا۔ یہ ایسے ہے جیسے کسی انسان میں

دیوانگی کا آغاز ہو اور اس سے ناپسندیدہ حرکتیں سرزد ہونے لگیں، تو سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی عقل چکرا گئی ہے اور وہ اس پر اپنا سایہ نہیں ڈال رہی۔ وہ وہ عقل کے سایہ اور پناہ سے دور چلا گیا ہے۔ عقل فرشتہ کی جنس ہے۔ اگرچہ فرشتہ کی صورت ہوتی ہے اور پر و بال ہوتے ہیں، اور عقل کے نہیں ہوتے۔ لیکن در حقیقت وہ ایک ہی چیز ہیں اور ایک ہی فعل کرتے ہیں۔ صورت کو نہیں دیکھنا چاہیے، مثلاً اگر اس کی صورت کو پگھلا دے تو سب عقل بن جائے۔ اس کے پر و بال میں سے کوئی چیز باقی نہ رہے۔ پس ہم نے سمجھ لیا کہ وہ سب عقل تھے لیکن مجسّم۔ اسے عقلِ مجسم کہتے ہیں۔ جیسے موم سے پر و بال والا پرندہ بنائیں تو سب موم ہی ہو گا۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ تو اسے پگھلا دے تو اس پرندے کے پر و بال اور سر اور پاؤں ایک دم موم بن جاتے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی چیز باہر نکالنے کے قابل نہیں رہتی۔ وہ تمام کے تمام موم بن جاتے ہیں۔ پس ہم سمجھ گئے کہ یہ سب موم ہی ہے۔ اور جو پرندہ اس موم سے بنایا گیا، وہ موم ہی ہے۔ اس کے مجسّم نقش بن گئے، ورنہ وہ موم ہی ہے۔ اسی طرح برف بھی ہے۔ اس لیے جب تو اسے پگھلائے تو پانی بن جاتی ہے۔ لیکن جب ابھی تک برف نہیں بنی تھی اور پانی ہی تھا، اسے ہاتھ میں نہیں پکڑا جا سکتا تھا۔ اور مٹھی میں نہیں آتا تھا۔ لیکن جب وہ برف بن گیا تو ہاتھ میں پکڑا جا سکا۔ اور دامن میں ڈالا جا سکا۔ پس فرق اس سے زیادہ نہیں، لیکن برف وہی پانی ہے۔ اور یہ دونوں ایک چیز ہیں۔ آدمی کا حال ایسا ہے کہ فرشتے کے پر تو اور صحبت سے فرشتہ بن جائے۔ اس لیے کہ ممکن ہے کہ وہ فرشتہ کا ہم رنگ ہو جائے۔

ترجمہ شعر: عیسیٰؑ نے عقل کے پَر لیے، تو وہ اسے آسمان پر لے اڑی۔ اگر گدھے کے آدھا پر بھی ہوتا تو وہ گدھا پن میں نہ رہتا۔

اور کیا عجب کہ وہ آدمی بن جاتا۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ آخر یہ جو بچہ پیدا ہوتا

ہے۔ ابتداء میں گدھے سے بھی بدتر ہوتا ہے، ہاتھ کو غلاظت سے بھر کر منہ کی طرف لے جاتا ہے، تاکہ اسے چاٹ لے۔ ماں اسے پیٹتی ہے اور منع کرتی ہے۔ گدھے کو ایک قسم کی تمیز ہے، جب وہ پیشاب کرتا ہے تو ٹانگوں کو چوڑی کر لیتا ہے، تاکہ پیشاب ان پر نہ ٹپکے۔ اگر خداوند تعالیٰ اس طفل کو آدمی بنا سکتا ہے جو گدھے سے بدتر ہے، تو اگر وہ گدھے کو آدمی بنا دیتا ہے تو اس میں کونسی تعجب کی بات ہوئی۔ خدا کے نزدیک کوئی بات عجیب نہیں۔ قیامت میں آدمی کے تمام اعضاء ہاتھ پاؤں وغیرہ ایک ایک کر کے جدا جدا بولیں گے۔ فلسفی اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہاتھ کیسے بات کرے گا۔ شاید ہاتھ پاؤں پر کوئی علامت اور نشانی پیدا ہو جائے گی، جو بات کی بجائے ہو، جیسے پھوڑا یا دنبل ہاتھ پر نکل آئے، تو کہہ سکتے ہیں کہ ہاتھ بات کرتا ہے۔ وہ خبر دیتا ہے کہ میں نے گرمی کھائی ہے کہ میرا ہاتھ ایسا ہو گیا ہے۔ یا ہاتھ زخمی ہو جائے یا سیاہ ہو جائے تو کہہ دیں کہ ہاتھ بات کرتا ہے، خبر دیتا ہے کہ مجھے چھری لگی ہے۔ یا میں نے اپنے آپ کو کالی دیگ سے ملا ہے۔ ہاتھ اور باقی اعضاء کی گفتگو کا یہ طریقہ ہو گا۔ سنی کہتے ہیں، یہ محسوس دست و پا ضرور بات کریں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے زبان بات کرتی ہے۔ قیامت کے دن آدمی انکار کرے گا کہ میں نے چوری نہیں کی۔ ہاتھ فصیح و بلیغ زبان میں کہے گا تو نے چوری کی، مال میں نے لیا۔ وہ شخص ہاتھ اور پاؤں کی طرف متوجہ ہو کر کہے گا تم تو بول نہیں سکتے تھے، اب کیسے بول رہے ہو۔ وہ جواب دیں گے :

انطقنا الله الذی انطق کل شیء۔ — ہمیں اسی اللہ نے بولنا سکھایا، جس نے ہر شے کو نطق بخشا۔

ہمیں اس نے بات کرائی ہے، جو ہر چیز سے بات کراتا ہے۔ اور در و دیوار، پتھر اور مٹی کے ڈھیلے تک سے بات کراتا ہے۔ وہ خالق جو سب کو نطق بخشتا ہے، مجھے بھی اسی

نے قوتِ گویائی دی ہے۔ زبان تجھے ناطق بناتی ہے۔ تیری زبان گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ ہاتھ گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ سخن پارۂ گوشت ہے۔ زبان کتنی معقول ہے۔ اس وقت تو نے جو دیکھا تجھے محال معلوم ہوا۔ مگر خداوند تعالیٰ کے نزدیک تو زبان ایک بہانہ ہے، جب اسے فرمایا، بات کہہ اس نے بات کہہ دی۔ اور جس سے وہ فرماتا ہے اور جسے وہ حکم دیتا ہے، وہ بات کرتا ہے۔

سخن آدمی کے ظرف کے مطابق پیدا ہوتا ہے۔ ہمارا سخن پانی کی طرح ہے، جسے داروغہ[ل] جاری کرتا ہے۔ پانی کو کیا معلوم کہ داروغہ نے اسے کس جنگل کی طرف روانہ کیا ہے۔ باغ میں اس جگہ کے لیے جہاں ککڑیاں ہیں یا جہاں ساگ ہے یا جہاں پیاز ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر پانی بہت آئے تو وہاں پیاسی زمین بہت ہے اور اگر پانی تھوڑا آئے تو سمجھتا ہوں کہ زمین تھوڑی ہے۔ باغیچہ ہے یا چھوٹی چار دیواری۔

یلقّن الحکمۃ علی لسان الواعظین بقدرھمم المستمعین.

واعظوں کی زبان سے سامعین کی سمجھ کے مطابق ہی حکمت کی تلقین کی جاتی ہے۔

میں جوتے سیتا ہوں، چمڑا بہت ہے۔ پاؤں کے مطابق چمڑا کاٹتا اور سیتا ہوں۔

ترجمہ شعر: میری شخصیت کا سایہ اور اس کا اندازہ قد کے مطابق لگایا جاتا ہے کہ وہ کس قدر ہے۔

زمین میں ایک چھوٹا سا حیوان ہے، جو زمین کے نیچے زندگی بسر کرتا ہے اور ظلمت میں رہتا ہے۔ اس کی آنکھ اور گوش نہیں ہیں۔ اس لیے کہ جہاں وہ رہتا ہے، وہ جگہ آنکھ اور گوش کی محتاج نہیں ہے۔ جب اسے آنکھ کی ضرورت ہی نہیں تو اسے آنکھ کیوں دیں۔ یہ نہیں کہ خدا کے پاس آنکھیں اور گوش تھوڑے ہیں یا بخل ہے۔ وہ ضرورت پر

ل اصل لفظ میر آب ہے۔ اس کے معنی باغبان یا داروغہ ہے، جس کے ذمے درختوں کو پانی دینا ہو۔

چیز دیتا ہے۔ جو چیز بغیر ضرورت کے دی جائے وہ بوجھ بن جاتی ہے۔ اس طرح خداوند تعالیٰ کی حکمت اور لطف و کرم کے بوجھ بن جاتے ہیں۔ کسی پر بوجھ کیوں ڈالیں۔ مثال کے طور پر اگر تو بوھئی کے نوزار تیشہ، آرہ، ریتی وغیرہ درزی کو دے دے تو وہ اس کے لیے بوجھ بن جائیں گے۔ کیونکہ وہ ان سے کام نہیں کر سکتا۔ پس ضرورت ہو تو چیز دیتے ہیں۔ ایسے ہی وہ کیڑے جو زمین کے نیچے اس ظلمت میں زندگی بسر کرتے ہیں، ایسی مخلوق ہیں جو اس دُنیا کی تاریکی پر قانع اور راضی ہیں۔ اور اس عالم کے محتاج اور دیدار کے مشتاق نہیں ہیں۔ چشم بصیرت اور گوش و ہوش ان کے کسی کام کے نہیں۔ اس دُنیا کا کام ان کی چشم حسی ہی سے نکل آتا ہے۔ جب وہ دوسری طرف کا عزم ہی نہیں رکھتے، تو وہ بصیرت انہیں کیوں دی جائے جو ان کے کسی کام ہی کی نہیں۔

ترجمہ شعر: تاکہ تو یہ گمان نہ کرے کہ راستہ طے کرنے والے نہیں ہیں، پوری پوری صفات رکھنے والے بے نشان لوگ بھی نہیں ہیں۔

ترجمہ شعر: اس سبب سے کہ تو رازوں کو سمجھنے والا نہیں ہے، تُو خیال کرتا ہے کہ دوسرے بھی موجود نہیں ہیں۔

اب دُنیا غفلت سے قائم ہے۔ اگر غفلت نہ ہو تو یہ دُنیا نہ رہے۔ خدا کا شوق، آخرت کی یاد، سکر اور وجد اس جہان کے معمار ہیں۔ اگر سب مکمل طور پر ادھر متوجہ ہو جائیں تو ہم اس عالم میں چلے جائیں، اور یہاں نہ رہیں۔ مگر خداوند تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہم یہاں رہیں تاکہ دونوں جہان ہوں۔ پس دو متضاد چیزیں کھڑی ہیں۔ ایک غفلت اور ایک بیداری، تاکہ دونوں گھر آباد رہیں۔

مدح و ثنا کی مذمت

فرمایا اگر میں آپ کی مہربانیوں اور آپ کی کوششوں اور تربیت کا جو آپ حاضر رہ کر اور غیبت میں کر رہے ہیں، شکریہ ادا کرنے اور تعظیم بجا لانے اور عذر خواہ ہونے میں بظاہر کوتاہی کروں تو اس کی بنا کبر یا رنجش پر نہیں ہے۔ یا اس وجہ سے نہیں کہ میں نہیں جانتا کہ ولی نعمت کے حق کا بدلہ قول اور فعل سے کس طرح ادا کرنا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ میں نے آپ کے پاک عقیدے سے سمجھ لیا ہے کہ آپ یہ صرف خدا کے لیے کر رہے ہیں۔ جب آپ نے یہ خدا کی خاطر کیا ہے، تو میں بھی اسے خدا پر ہی چھوڑتا ہوں تاکہ اس کی معذرت بھی وہی کرے۔ اگر میں اس کی معذرت میں مشغول ہو جاؤں اور زبان سے اس کی تعریف کروں اور مدح کہوں تو یہ ایسا ہو گا کہ جو اجر خدا دینا چاہتا ہے، اس میں سے کچھ آپ کو مل گیا اور کچھ اجر کی تلافی ہو گئی۔ اس لیے کہ عاجزی کرنا، معذرت چاہنا اور مدح کرنا حظِ دُنیا ہے۔ جب تو دُنیا میں تکلیف اٹھائے تو بدلِ مال و جاہ کی طرح بہتر ہے کہ اس کا بدلہ بھی کلی طور پر خدا ہی کی طرف سے ہو۔ میں یہ عذر نہیں کرتا کہ اس وقت معذرت کرنا دُنیا ہے۔ اس لیے کہ مال کو نہیں کھاتے، مقصد اور ہوتا ہے۔ مال سے گھوڑے، لونڈیاں اور غلام خریدتے ہیں۔ اور منصب طلب کرتے ہیں۔ تاکہ ان کی مدح اور ثنا کریں۔ پس دُنیا خود وہ ہے جو بڑی اور قابلِ احترام ہے، اور اس کی تعریف کرتے ہیں۔

شیخ نساج[1] بخاری بڑا آدمی تھا، اور صاحبِ دل تھا۔ کچھ دانشمند اور بڑے لوگ اس کی زیارت کے لیے اس کے پاس آئے۔ اور دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ شیخ ان پڑھ تھا۔ انہوں نے چاہا کہ اس کی زبان سے قرآن اور حدیث سنیں۔ بولا میں عربی نہیں جانتا۔ آپ آیت یا

---

[1] شیخ نساج وہی ہیں جن کے متعلق مولانا رومی نے اپنی ایک غزل میں بھی اشارہ کیا۔
گر نہ علم حال فوق بودی کے شدے   بندۂ اعیان بخارا خواجہ نساج را

حدیث کا ترجمہ بولیں۔ تاکہ میں اس کے معنی بتاؤں۔ انہوں نے آیت کا ترجمہ کیا۔ اس نے اس آیت کی تفسیر اور تحقیق شروع کی اور کہا۔ محمد مصطفیٰ ﷺ فلاں مقام پر تھے کہ یہ آیت پڑھی اور اس مقام کا حال ایسا ہے۔ اس مقام کے مرتبہ، اس کے راستوں اور اس کی بلندی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔

ایک دن اس کے سامنے علوی معرّف[1] نے ایک مشہور قاضی کی تعریف کی۔ اور کہا کہ ایسا قاضی دُنیا بھر میں نہیں۔ وہ رشوت نہیں لیتا۔ محض خدا کی خاطر بغیر کسی لحاظ اور خوف کے وہ لوگوں میں انصاف کرتا ہے۔ کہا اس وقت جو تُو یہ کہتا ہے کہ وہ رشوت نہیں لیتا، یہ بالکل جھوٹ ہے۔ تُو علوی مرد ہو کر جو مصطفیٰ ﷺ کی نسل ہے، اس کی مدح و ثنا کرتا ہے کہ وہ رشوت نہیں لیتا۔ کیا یہ رشوت نہیں؟ اور اس سے بہتر کیا رشوت ہو گی کہ اس کے منہ پر تو اس کی تعریف کر رہا ہے؟

ظاہری عمل اور باطنی محرکات کا فرق

شیخ الاسلام ترمذی کہتے تھے کہ سید برہان الدین، اللہ تعالیٰ ان کے بڑے بڑے رازوں کو پاک رکھے، تحقیق کی ہوئی باتیں خوب کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مشائخ کی کتابوں اور ان کے اسرار و مقالات کا مطالعہ اچھی طرح کرتے تھے۔ ایک آدمی نے کہا، آخر تُو بھی مطالعہ کرتا ہے۔ کیا سبب ہے تو ایسی باتیں نہیں کہتا۔ کہا اس کا سبب اس کا درد ہے۔ اس نے مجاہدہ کیا ہوا ہے۔ اور اس کا بھی اثر ہے۔ کہا تو اس کا ذکر کیوں نہیں کرتا۔ اور اسے یاد نہیں لاتا تو صرف مطالعہ کی بات کرتا ہے۔ حالانکہ اصل وہ ہے۔ ہم اس کا ذکر

[1] بعض ملکوں میں رواج ہے کہ وہاں کے امراء کے پاس ایک ایسا آدمی ہوتا ہے جو ان کی مجلس میں وارد ہونے والے ہر مہمان کا نام اس کی آمد پر بلند آواز سے پکارتا ہے اور اسے اس کے مرتبہ اور درجہ کے مطابق خاص جگہ پر بٹھاتا ہے۔ اس آدمی کو معرّف کہتے ہیں۔

کرتے ہیں تو بھی اسی کی بات کر۔ اسے اس جہان کا درد نہ تھا۔ وہ کلی طور پر دل اس جہان سے لگائے ہوئے تھا۔ بعض لوگ روٹی کھانے کے لیے آتے ہیں اور بعض روٹی کا تماشا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ اس کو سیکھیں اور بیچیں۔ یہ بات ایک دلہن کی طرح ہے، اور ایک معشوق کی طرح ہے۔ جس معشوقہ کنیزک کو محض بیچنے کے لیے خریدیں، وہ کیا محبت کرے گی اور کیا دل لگائے گی۔ اس تاجر کو مزا اسے فروخت کرنے میں آتا ہے، تو وہ نامرد ہے۔ وہ کنیزک کو بیچنے کے لیے خریدتا ہے۔ اس میں رجولیت اور مردمی نہیں کہ کنیزک کو محض اپنے لیے خرید لے۔ خالص ہندوستانی تلوار اگر ایک مخنث کے ہاتھ آجائے تو وہ اس کے دام ہی کھرے کرے گا۔ یا کسی پہلوان کے ہاتھ کمان آجائے، تو وہ اسے بیچ ہی ڈالے گا۔ کیونکہ اس کے بازو اس قابل نہیں کہ کمان کھینچ سکیں اور اگر اس کمان کو چلّہ کی وجہ سے خریدتا ہے تو چلّہ چڑھانے کی اس میں استعداد نہیں۔ وہ صرف چلّہ کا عاشق ہے۔ جب وہ اسے بیچتا ہے تو مخنث اس کے بدلے غازہ اور وسمہ دیتا ہے۔ وہ اور کیا کرے گا۔ بات یہ ہے کہ جب وہ اسے ہی فروخت کر رہا ہے تو اس سے بہتر وہ کیا خریدے گا؟ یوں سمجھو کہ یہ بات سریانی زبان میں ہے۔ یہ ہرگز نہ کہیے کہ میں نے اسے سمجھ لیا ہے۔ تو نے اسے خواہ کتنا ہی سمجھ لیا ہو گا۔ پھر بھی یہ فہم سے بہت دور ہو گی۔ اس کا فہم بے فہمی ہے۔ خود تیری بلا، مصیبت، محرومی اس فہم کی وجہ سے ہے۔ یہ فہم ایک بند ہے۔ اس بند سے رہائی پانا چاہیے، تاکہ تو کوئی چیز بنے۔

عقل کو کبھی طلاق بھی دیدو

تو کہتا ہے کہ میں نے دریا سے مشک بھر لی ہے اور دریا میری مشک میں سما جاتا

ہے۔ یہ بات محال ہے۔ ہاں اگر تو یہ کہے کہ میری مشک دریا میں گم ہو گئی ہے تو بات ٹھیک ہو گی۔ اور اصلیت یہی ہے۔ عقل اتنی حسین اور مطلوب ہے کہ وہ تجھے بادشاہ کے دروازہ تک لے آئی جب تو بادشاہ کے دروازہ پر پہنچ گیا، تو اب اگر عقل کو طلاق دے دے[1] کہ اب عقل تیرے لیے نقصان کا باعث ہو گی۔ اور راہزن ثابت ہو گی۔ جب تو اس کے پاس پہنچ گیا تو اپنے کو اس بادشاہ کے سپرد کر دے۔ اگر مگر کرنا تیرا کام نہیں ہے۔ مثلاً اگر ایسا کپڑا تیرے پاس ہے جو کٹا ہوا نہیں اور تو اس کی قبا بنانی چاہتا ہے تو عقل تجھے درزی کے پاس لے جاتی ہے۔ اس گھڑی تک عقل اچھی تھی کہ کپڑے کو درزی کے پاس لے آئی۔ لیکن اب اس وقت عقل کو طلاق دے دینی چاہیے[2] اسی طرح عقل، اس وقت تک اچھی ہے کہ بیمار کو طبیب کے پاس لے آئے۔ جب وہ اسے طبیب کے پاس لے آئی، تو اس کے بعد عقل کسی کام کی نہیں۔ اور اب اپنے آپ کو طبیب کے سپرد کر دینا چاہیے۔ دوستوں کے کان تیرے نعرہ ہائے پنہائی کو سنتے ہیں۔ آخر جس شخص کے پاس کوئی چیز ہوتی ہے یا جو شخص اپنے اندر کوئی خوبی رکھتا ہے، وہ ظاہر ہوتی ہے۔ اونٹوں کی قطار میں سے جو اونٹ مست ہوتا ہے، وہ اپنی آنکھ، رفتار اور حال ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔

سیماهم فی وجوههم من اثر السجود. ان کی پیشانیوں پر سجدہ کے نشان پڑے ہوئے ہیں۔
(فتح: ع ۱)

اب درخت کی جڑ جو کچھ کھاتی ہے، وہ درخت پر شاخ، پتے اور پھل سے ظاہر ہو جاتا ہے اور جو جڑ کچھ نہیں کھاتی، اس کا درخت پژمردہ ہوتا ہے۔ اور یہ بات چھپی نہیں

---

[1] ہر کہ او اندر نظر موصول شد ... ایں خبرہا پیش او معزول شد
چونکہ با معشوق گشتی ہمنشیں ... دفع کن دلالگاں را بعد ازیں

[2] پارہ کرد درزی جامہ را ... کس زند آں درزی علامہ را
کہ چرا ایں اطلس بگزیدہ را ... بر دریدی چہ بدریدہ را

رہ سکتی۔ یہ ہاؤ ہو بلند کرتے ہیں۔ اس کا راز یہ ہے کہ ایک بات سے کئی باتیں سمجھ لیتے ہیں اور ایک حرف سے کئی اشارے معلوم کر لیتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے کہ کسی نے وسیط[1] اور مطول کتابیں پڑھی ہوں، وہ تنبیہ[2] میں سے ایک کلمہ سن لے، تو چونکہ اس نے اس کی شرح پڑھی ہوئی ہے، ایک اصل مسئلہ سے کئی مسئلے سمجھ جاتا ہے۔ اور اس ایک حرف پر کئی تنبیہیں کرتا ہے، یعنی کہ میں ان کی گہرائی کو سمجھتا ہوں، اور میں دیکھتا ہوں اور یہ وہ ہے جس جگہ میں نے دُکھ اٹھائے ہیں۔ اور راتوں کو میں نے دن بنایا ہے۔ اور میں نے خزانے حاصل کیے ہیں:

الم نشرح لك صدرك. (سورۂ انشراح) کیا ہم نے تیرے سینے کو نہیں کھول دیا۔

شرح دل کی کوئی انتہا نہیں۔ جب وہ شرح پڑھی ہوئی ہو۔ ایک رمز سے بہت کچھ سمجھ میں آ جاتا ہے اسے کیا خبر۔ اور ہائے ہائے کیسا۔ بات سننے والے کے ظرف کے مطابق ہوتی ہے۔ جب وہ اسے نہیں کھینچتا تو حکمت بھی باہر نہیں آتی۔ جتنی وہ کھینچتا ہے، وہ غذا بنتی ہے اور اتنی ہی حکمت نیچے اترتی ہے۔ ورنہ وہ کہہ اٹھتا ہے کہ تعجب ہے۔ بات کیوں نہیں آتی۔ اس کا جواب کہتا ہے تعجب ہے کہ تو کھینچتا کیوں نہیں۔ جو تجھے سننے کی طاقت نہیں دیتا۔ وہ کہنے والے کو بھی گفتگو کی خواہش نہیں دیتا۔

مصطفیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک کافر کا ایک مسلمان غلام تھا۔ اس غلام میں بڑی خوبیاں تھیں۔ ایک صبح اس کے آقا نے کہا، طشت اٹھا تاکہ حمام چلیں۔ راستہ میں محمد علیہ السلام مسجد میں صحابہ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے۔ وہاں پہنچ کر غلام نے کہا۔ اے آقا خدا کے لیے ایک لحہ بھر کے لیے اس طشت کو تھام تاکہ میں دو رکعت نماز پڑھ لوں۔ اس کے بعد حاضر ہو جاؤں گا۔ غلام مسجد کے اندر گیا اور نماز پڑھی۔ نماز کے خاتمہ پر

---

[1] وسیط، فقہ کی ایک کتاب جو ابو حامد محمد غزالی کی تالیف ہے۔

[2] تنبیہ، ایک کتاب ہے۔ مؤلفہ ابو اسحاق ابراہیم بن علی شیرازی۔

مصطفیٰ ﷺ باہر تشریف لے آئے، اور صحابہ بھی باہر آگئے۔ غلام اکیلا مسجد کے اندر رہا۔ اس کا آقا پہر دن چڑھے تک منتظر رہا۔ اب اس نے آواز دی کہ اے غلام! باہر آ۔ غلام بولا، مجھے نہیں چھوڑتے۔ جب معاملہ حد سے زیادہ بڑھ گیا تو آقا نے سر مسجد کے اندر کیا کہ دیکھے کون ہے جو غلام کو نہیں چھوڑتا۔ جوتے اور کسی کے سایہ کے سوا اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اور نہ کسی نے جنبش کی۔ بولا وہ کون ہے جو تجھے نہیں چھوڑتا تاکہ تو باہر آسکے؟
جواب دیا، وہی جو تجھے نہیں چھوڑتا کہ تو اندر آسکے۔ وہ وہ ہے جو تجھے نظر نہیں آتا۔

بعض آیات کی تفسیر

انسان ہمیشہ اس چیز سے عشق کرتا ہے، جسے نہ اس نے دیکھا ہو، نہ سنا ہو، نہ سمجھا ہو۔ اور رات دن اس کی طلب میں رہتا ہے۔ میں اس کا بندہ ہوں، جسے میں نے نہیں دیکھا۔ اور جس نے سمجھا ہے اور دیکھا ہے، وہ ملول اور گریزاں ہے۔ اسی وجہ سے فلسفی رویت کے منکر ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں کہ اگر تو دیکھ لے تو ممکن ہے تو رنجیدہ اور ملول ہو۔ اور یہ روا نہیں۔ سُنّی کہتے ہیں کہ یہ وقت ہے کہ وہ ایک رنگ دکھائے کیونکہ وہ ہر لحظہ سو رنگ دکھاتا ہے، کہ :

كل يوم هو فى شان (سورۂ رحمٰن : ع ۲) ہر روز وہ ایک (نئی) شان میں ہے۔

اور اگر وہ ہزار تجلی کرے، تو ہرگز ایک تجلی دوسری تجلی سے نہیں ملتی۔ آخر تو بھی اس گھڑی خدا کو دیکھتا ہے۔ افعال و آثار میں تو دیکھتا ہے کہ اس کی تجلیات گوناگوں

ہیں۔ اس کا ایک فعل دوسرے فعل سے نہیں ملتا۔ خوشی کے وقت اور تجلی ہوتی ہے۔ رونے کے وقت اور۔ خوف کے وقت اور۔ رجا کے وقت اور ہوتی ہے۔ جب خدا کے افعال اور اس کی تجلی کے افعال اور اس کے آثار گونا گوں ہیں، اور ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ تو اس کی ذات کی تجلی بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ تجلی افعال کی طرح ہے۔ اس کو اسی پر قیاس کر۔ تو بھی خدا کی قدرت کا ایک جزو ہے۔ ایک لحظہ میں ہزار رنگ بدلتا ہے۔ اور تجھے ایک حال پر قرار نہیں۔ بندوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ وہ قرآن سے خدا کے پاس جاتے ہیں۔ اور بعض خاص بندے ایسے بھی ہیں کہ وہ خدا کے پاس سے آتے ہیں۔ وہ قرآن کو یہاں پاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انہیں خدا نے بھیجا ہے :

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون۔ (سورۂ حجر : ع ۱)	ہم ہی نے یہ ذکر یعنی قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کو محفوظ رکھنے والے ہیں۔

مفسر کہتے ہیں کہ یہ قرآن کے بارے میں ہے۔ یہ اچھی بات ہے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ خدا کہتا ہے ہم نے تجھ میں خوبی، طلب اور شوق دیئے ہیں۔ اور ان کے نگہبان ہم خود ہیں۔ ہم انہیں ضائع نہیں ہونے دیتے۔ اور تجھے منزل مقصود تک پہنچا دیتے ہیں۔ تو ایک بار کہہ کہ "خدایا!" اور اسی وقت سنبھل جا، کیونکہ تمام مصیبتیں تجھ پر ٹوٹ پڑیں گی۔

محبت تباہ کر کے پاک کر دیتی ہے

ایک صاحب مصطفیٰ ﷺ کے پاس آئے۔ اور بولے، انی احبك (میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔) فرمایا ہوش کر تُو کیا کہتا ہے! اس نے دہرایا کہ انی احبك (میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔) فرمایا ہوش کر تو کیا کہتا ہے۔ وہ تیسری بار بولا، انی احبك۔ فرمایا، اب تو

سنبھل جا۔ میں خود اپنے ہاتھ سے تجھے قتل کروں گا۔ افسوس ہے تجھ پر۔

مصطفیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک شخص نے کہا، میں یہ تیرا دین نہیں چاہتا۔ خدا کی قسم نہیں چاہتا۔ اپنے اس دین کو مجھ سے واپس لے لے۔ جب سے میں تیرے دین میں آیا ہوں، ایک دن آرام نہیں ملا۔ مال گیا، عورت گئی، پیٹانہ رہا، عزت نہ رہی، شہوت نہ رہی۔ فرمایا کہ میرا دین جہاں بھی جاتا ہے، واپس نہیں آتا، جب تک کہ اسے بیخ وبن سے نہ اکھاڑ دے اور اس کے گھر میں جھاڑو نہ پھیر دے اور پاک نہ کر دے۔

لایمسہٗ الاالمطھرون. (سورۂ واقعہ : ع ۳) پاک لوگوں کے سوا اس تک اور کسی کی دسترس نہیں۔

کیسا معشوق ہے! جب تک تجھ میں بال برابر بھی اپنی محبت باقی رہے، وہ اپنا چہرہ تجھے نہیں دکھاتا۔ اور تو اس کے وصل کے قابل نہیں ہوتا۔ اپنے آپ تک وہ کلی طور پر راہ نہیں دیتا۔ اپنے آپ سے اور دنیا سے بیزار ہو جانا چاہیے۔ اور اپنا دشمن آپ بن جانا چاہیے تاکہ دوست چہرہ دکھائے۔ اب ہمارا دین جس دل میں جاگزین ہو جائے۔ جب تک اسے خدا تک نہ پہنچادے۔ اور اس میں جو نہیں ہونا چاہیے، اسے اس سے جدا نہ کر دے۔ اس سے ہاتھ نہیں کھینچتا۔ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا، تو اس لیے آرام نہیں کرتا اور غم کھاتا ہے کہ غم کھانا پہلی خوشیوں کی قے ہے۔ جب تک تیرے معدہ میں اس چیز سے کچھ باقی ہو، تجھے کوئی چیز نہیں دیتے کہ تو کھائے۔ قے کے وقت کوئی شخص کچھ نہیں کھاتا۔ اور جب کوئی قے سے فارغ ہو جائے تو اس وقت کھانا کھاتا ہے۔ تو بھی صبر کر اور غم نہ کھا۔ کیونکہ غم کھانا قے ہے۔ استفراغ کے بعد خوشی میسر آتی ہے۔ جس کے بعد غم نہیں ہوتا۔ وہ پھول پھول نہیں جس کے ساتھ کانٹا نہ ہو۔ اور وہ شراب، شراب نہیں جس میں خمار نہیں۔ آخر تو دنیا میں رات دن فراغت اور آسائش چاہتا ہے۔ اور ان کا حصول دُنیا میں

ممکن نہیں۔ اس لیے تو ایک لحہ بھی بغیر طلب کے نہیں ہے۔ دُنیا میں تجھے جو راحت حاصل بھی ہوتی ہے، وہ ایک تجلی کی رو ہے، جو گزر جاتی ہے۔ اور برقرار نہیں رہتی۔ اور تجلی بھی کیسی تجلی کہ اس کے ساتھ اولے بھی برستے ہیں۔ اور موسلا دھار بارش ہوتی ہے اور برف بھی گرتی ہے۔ جو بڑی تکلیف دیتی ہے۔

مثلاً کسی نے انطاکیہ جانے کا عزم کیا ہوا ہے، مگر وہ جاتا قیصریہ کو ہے۔ اب وہ امید رکھتا ہے کہ انطاکیہ پہنچ جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی کوشش کو نہیں چھوڑتا۔ اب یہ ممکن نہیں کہ اس راستہ سے وہ انطاکیہ پہنچ جائے۔ وہ انطاکیہ اسی راستہ سے پہنچے گا جو انطاکیہ کو جاتا ہے۔ اگرچہ وہ لنگڑا ہو اور ضعیف ہو۔ پھر بھی وہ انطاکیہ پہنچ جائے گا۔ کیونکہ اس راستہ کا منتہا یہی ہے جب دُنیا کا کوئی کام بغیر مصیبت اٹھائے نہیں ہوتا تو آخرت کا کام بھی ایسا ہی ہے۔ اس مصیبت کو تو ایک مرتبہ آخرت پر صرف کر تاکہ وہ ضائع نہ ہو۔ تو کہتا ہے کہ اے محمد ﷺ تو اپنا دین لے جا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے میری آسائش مفقود ہے۔ ہمارا دین کب کسی کو چھوڑتا ہے، جب تک اسے مقصود تک نہ پہنچا دے۔

کہتے ہیں، ایک معلم نے بے سامانی کی وجہ سے سردی کے موسم میں کتان کا کرتہ پہن رکھا تھا۔ شاید پہاڑ پر سے سیلاب ایک ریچھ کو بہا لایا تھا۔ وہ اس طرح گزرا کہ اس کا سر پانی میں چھپا ہوا تھا۔ لڑکوں نے اس کی پیٹھ کو دیکھا اور بولے۔ استاد! ندی میں یہ کوئی پوستین بہتی آرہی ہے۔ تجھے جاڑا لگتا ہے، اسے پکڑ لے۔ استاد نے انتہائی ضرورت اور جاڑے کی وجہ سے ندی میں چھلانگ ماردی تاکہ پوستین کو پکڑ لے۔ ریچھ نے اس پر تیز پنجہ مارا اور استاد پانی میں ریچھ کا اسیر ہو گیا۔ اوھر لڑکوں نے دیکھا کہ استاد کو ندی میں اترے دیر ہو گئی ہے، تو انہوں نے آوازیں دینی شروع کر دیں کہ اے استاد! پوستین لے آ اور اگر نہیں لا سکتا تو اسے چھوڑ اور تو خود باہر آ جا۔ استاد نے جواب دیا میں تو پوستین کو

چھوڑتا ہوں، پوستین مجھے نہیں چھوڑتا، کیا چارہ کروں۔ خدا کا شوق تجھے کب چھوڑتا ہے۔ یہ شکر کا مقام ہے کہ ہم خود اپنے ہاتھوں میں نہیں۔ ہم خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ بچہ طفولیّت میں دودھ اور ماں کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ خداوند تعالیٰ نے اسے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ مگر اس سے پہلے روٹی، کھانا، کھیلنا اور اس قسم کی اور چیزیں اس کے لیے مہیا کر دیں۔ یہاں تک کہ اسی طرح اسے عقل کے مقام تک پہنچاتا ہے۔ اسی طرح جس حالت میں کہ یہ بچہ ہے، اس عالم کی نسبت، ایک دوسرا پستان بھی ہے۔ خدا نہیں چھوڑتا اور اس تک پہنچا دیتا ہے۔ اب تو سمجھتا ہے کہ وہ طفلی تھی اور کچھ بات نہ تھی۔

فعجبت من قوم یجرّون الی الجنة بالسلاسل والاغلال. خذوه فغلوه ثم النعیم صلوة ثم الوصال صلوة ثم الجمال صلوة ثم الکمال صلوة.

میں حیرت میں ہوں، ان لوگوں سے جو جنت کی طرف گھسیٹے جاتے ہیں، اغلال و سلاسل کے ذریعے ان کو پکڑ کر بیڑیاں ڈالو۔ اس کے بعد اسے جنت نعیم کی طرف لے جاؤ۔ پھر وصال کی طرف لے جاؤ پھر جمال میں جھونک دو۔ پھر کمال میں جھونک دو۔

مچھلی کے حلقوم میں جب کانٹا پھنس جائے تو شکاری مچھلی کو ایک ہی بار نہیں کھینچ لیتے۔ تھوڑا سا کھینچتے ہیں، تاکہ اس کا خون بہ جائے۔ اور وہ سست اور کمزور ہو جائے۔ عشق کا کانٹا جب آدمی کے منہ میں پھنستا ہے، تو خداوند تعالیٰ اسے بتدریج کھینچتا ہے، تاکہ اس میں باطل کی جو طاقت اور خون ہے، وہ تھوڑا تھوڑا کر کے نکلے۔

ان الله یقبض ویبسط. (بقر : ع ۳۲) خدا ہی تنگی اور فراخی پیدا کرتا ہے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے) ایمان عام ہے۔ ایمانِ خاص وہ ہے کہ لاھو الا ھو (اس کے سوا کچھ موجود ہی نہیں)۔ اسی طرح کوئی شخص خواب میں

دیکھتا ہے کہ وہ بادشاہ بن گیا ہے، اور تخت پر بیٹھا ہے۔ غلام، حاجب اور امیر اس کے ارد گرد کھڑے ہیں۔ وہ کہتا ہے مجھے چاہیے کہ میں بادشاہ ہوں، اور میرے سوا کوئی بادشاہ نہیں ہے۔ وہ یہ خواب میں کہتا ہے۔ جب وہ بیدار ہوتا ہے اور اپنے علاوہ کسی کو گھر میں نہیں دیکھتا تو اب وہ کہتا ہے کہ میں ہوں اور میرے سوا کوئی دوسرا نہیں۔ اب اس کے لیے چشم بیدار ہونی چاہیے۔ خواب ناک آنکھ اسے نہیں دیکھ سکتی۔ یہ اس کا وظیفہ نہیں۔ ہر گروہ دوسرے گروہ کی نفی کرتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم سچے ہیں اور وحی ہمارے لیے ہے، اور وہ جھوٹے ہیں۔ اسی طرح وہ انہیں کہتے ہیں۔ اسی طرح بہتر فرقے ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔

یوں سمجھئے کہ وہ بالاتفاق کہتے ہیں، وحی کسی کے لیے نہیں۔ پس وحی کی نیستی پر وہ متفق ہوتے ہیں۔ اس جملہ کا ایک ہی مطلب ہے۔ اور اس مطلب پر وہ سب متفق ہیں۔

اب امتیاز کر سکنے والا ایک دانا مومن چاہیے، جو یہ جانتا ہو کہ وہ ایک کون ہے۔

کیس ممیّز فطن عاقل. صاحبِ فراست و تمیز و فطانت و عقل اور ایمان وہ تمیز اور ادراک ہی ہے۔

ذوق کے بغیر حقیقت معلوم نہیں ہوتی

سوال کیا کہ وہ جو نہیں جانتے بہت ہیں اور وہ جو جانتے ہیں کم ہے۔ کیا ہم اس میں مشغول ہو جائیں کہ جو نہیں جانتے اور اپنے اندر خوبی نہیں رکھتے، اور ان میں جو جانتے ہیں اور کیچڑ میں سے موتی نکال لیتے ہیں، تمیز کریں؟ فرمایا وہ جو نہیں جانتے، اگرچہ زیادہ ہیں لیکن جب تو نے تھوڑے (جاننے والوں) کو سمجھ لیا تو سب کو سمجھ لیا۔ یہ

مومن کیس ممیّز کو کہ تا باز دانند پادشاہ را از گدا

اس طرح ہے کہ جب تو ایک مٹھی بھر گندم کو سمجھ لے تو گویا تمام دُنیا کے انباروں کو سمجھ لیتا ہے۔ اور اگر تُو نے شکر چکھ لی تو شکر سے سو رنگ کا حلوہ بھی تیار کریں، تُو سمجھ لے گا کہ اس میں شکر ہے۔ جب تو نے شکر کو سمجھ لیا۔ جس کسی نے شکر کی ڈلی کھائی۔ وہ جو شکر کو نہیں پہچانتا، شاید اسے دو ڈلیاں چاہئیں۔

اگر تمہیں یہ بات مکرر معلوم ہوتی ہے، تو اس کی یہ وجہ ہے کہ تم نے پہلا سبق یاد نہیں رکھا۔ پس ہمارے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ ہم ہر روز کہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک معلم تھا۔ ایک لڑکا اس سے تین مہینے پڑھتا رہا۔ "الف پر نقطہ نہیں" سے آگے اسے کچھ نہ آیا۔ لڑکے کا باپ آیا کہ ہم استاد کی خدمت میں کوتاہی نہیں کرتے۔ اور اگر ہم سے کوتاہی ہوئی ہے تو فرما دیجئے۔ ہم خدمت زیادہ کریں۔ معلم نے کہا، نہیں آپ سے کوتاہی نہیں ہوئی۔ لیکن لڑکا اس سے آگے نہیں بڑھتا۔ اسے پاس بلایا اور کہا، کہو "الف پر نقطہ نہیں"۔ وہ بولا، "نقطہ نہیں"۔ اور وہ "الف" بھی نہ کہہ سکا۔ معلم لڑکے کے باپ سے بولا، یہ حال ہے جو تُو دیکھتا ہے۔ جب اس سے آگے نہیں بڑھا اور اس نے یہ نہیں یاد کیا تو میں اسے نیا سبق کیا دوں؟

کہا الحمد اللہ رب العالمین۔ ہم نے کہا یہ نہیں کہ نان و نعمت کم ہو گئی ہے۔ نان و نعمت بے انتہا ہے، لیکن بھوک نہیں رہی اور مہمان سیر ہو گئے ہیں۔ اس وجہ سے کہا ہو گا، الحمد اللہ۔ یہ نان و نعمت دنیا کی نان و نعمت معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ دُنیا کے نان و نعمت کے بغیر بھی تو جتنا کھانا چاہے، زبردستی کھا سکتا ہے۔ یہ نان و نعمت جمادات کی طرح ہے۔ تُو اسے جہاں بھی کھینچ لے جائے، یہ تیرے ساتھ جاتی ہے۔ یہ روح نہیں رکھتی کہ غیر جگہ جانے سے اپنے آپ کو منع کرے۔ برخلاف اس نعمت الٰہی کے جو حکمت ہے، ایک زندہ نعمت ہے۔ جب تُو بھوک رکھتا ہے اور پوری رغبت دکھاتا ہے، یہ تیری طرف

آتی ہے اور تیری غذا بنتی ہے، اور جب تو بھوک اور میلان نہیں رکھتا، تو اسے زبردستی نہیں کھا سکتا۔ اسے اپنی طرف نہیں کھینچا جا سکتا۔ وہ اپنے چہرہ کو چادر میں چھپا لیتی ہے اور تجھے اپنا آپ نہیں دکھاتی۔

کرامت کا صحیح مفہوم

کرامات کی باتیں بیان فرمائیں۔ کہا اگر کوئی آدمی یہاں سے ایک دن میں یا ایک لحہ میں کعبہ پہنچ جائے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں، اور کرامت نہیں۔ اگر یہ کرامت ہے تو یہ بادِ سموم کو بھی حاصل ہے۔ ایک روز میں نہیں بلکہ ایک لحہ میں جہاں چاہے چلی جاتی ہے۔ کرامت یہ ہے کہ تجھے سفلی حالت سے اعلیٰ حال پر لے آئے۔ اور وہاں سے تو یہاں تک سفر کرے، اور جہالت سے عقل تک اور جمادی حالت سے حیات تک پہنچے[1]۔ یہ ایسا ہے کہ تو پہلے مٹی تھا۔ جمادات تھا، تجھے عالمِ نباتات میں لایا گیا اور تو نے عالمِ نباتات سے عالمِ علقہ و مضغہ تک سفر کیا اور عالم علقہ و مضغہ سے عالمِ حیوانی تک اور عالمِ حیوانی سے عالمِ انسانی تک سفر کیا۔ کرامت یہ ہوتی ہے۔

---

[1] آمدہ اوّل باقلیم جماد وز جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد وز جمادی یاد ناورد از نبرد
واز نباتی چوں بحیواں اوفتاد نامدش حال نباتی ہیچ یاد
باز از حیواں سوئے انسانیش می کشید آں خالقے کہ دانیش
ہمچناں اقلیم تا اقلیم رفت تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت
(مثنوی مولانا روم)

حضرت عمرؓ سے متعلق ایک واقعہ

خداوند تعالیٰ نے ایسی مسافت[1] کو تیرے لیے نزدیک کر دیا، جن منزلوں اور راستوں سے تو آیا۔ تیرے وہم و خیال میں بھی نہ تھا کہ تو ان سے آئے گا۔ اور تو کون سے راستہ سے آیا اور کیسے آیا۔ مجھے لے آئے اور مقرر تو دیکھتا ہے کہ تو آگیا۔ اسی طرح وہ تجھے سو دوسرے گوناگوں عالم میں لے جانا چاہتے ہیں، منکر نہ بن۔ اگر اس سے تجھے آگاہ کریں تو قبول کر لے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس زہر سے بھرا ہوا ایک پیالہ ایک تحفہ کے ساتھ لائے[2]۔ آپ نے پوچھا یہ کس کام آتا ہے؟ بولے یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اگر کسی کے متعلق آپ یہ مصلحت سمجھیں کہ اسے ظاہرا طور پر نہ مارا جائے تو اس میں سے ذرّہ بھر زہر اسے دے دیجئے، وہ خفیہ طور پر مر جائے گا۔ اور اگر ایسا دشمن ہو جسے تلوار سے نہ مارا جا سکے، تو اسے یہ ذرّہ بھر چھپا کر دے دیتے ہیں، وہ مر جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، تم بہت ہی اچھی چیز لائے ہو۔ یہ مجھے دے دو کہ میں اسے کھاؤں۔ کیونکہ میرے اندر ایک بہت بڑا دشمن ہے۔ تلوار اس تک نہیں پہنچتی۔ اور دُنیا میں اس سے بڑھ کر میرا کوئی دشمن نہیں۔ زہر لانے والے کہنے لگے، اس کی بھی حاجت نہیں کہ یہ سب ایک ہی بار کھا لیا جائے۔ اس کا ایک ذرّہ ہی کافی ہے۔ یہ سارا پیالہ سو ہزار کے لیے کافی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، وہ دشمن بھی ایک نہیں ہے، وہ ہزار مردوں کو مار چکا ہے۔ اور ہزار آدمیوں کو نگوں سار کر چکا ہے۔ آپ نے وہ پیالہ اٹھایا اور ایک ہی بار پی لیا۔ جتنے آدمیوں کا

---

[1] آں چناں کز نیست در ہست آمدی — ھیں بگو چوں آمدی مست آمدی
رھھائے آمدن یادت نماند — لیک رمزے با تو برخوانیم خواند

[2] زاں لعند فاروق را زہرے گزند — کہ بداں تریاق فاروقیش قند
ھیں جو تریاق فاروق اے غلام — تا شوی فاروق دوراں و السلام

گروہ وہاں موجود تھا، وہ سارا کا سارا وہیں مسلمان ہو گیا۔ وہ بیک زبان بولے، آپ ہی کا دین سچا ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا، تم سب مسلمان ہو گئے۔ اور وہ کافر ابھی تک مسلمان نہیں ہوا۔ اب اس ایمان سے حضرت عمرؓ کی مراد عام ایمان نہ تھا۔ ان کا وہ ایمان تھا۔ اور اس سے زیادہ بلکہ وہ صدیقوں کا ایمان رکھتے تھے۔ ان کا مطلب انبیاء اور خواص کے ایمان سے اور عین الیقین سے تھا۔ اور وہ یہی توقع رکھتے تھے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شیر کی شہرت اطراف و اکنافِ عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک شخص ازراہِ تعجب دور دراز کی مسافت طے کر کے اس جنگل تک پہنچا اور شیر کو دور سے دیکھا اور وہیں ٹھٹک گیا۔ اور آگے نہ بڑھ سکا۔ لوگوں نے کہا، شیر کے عشق میں تو نے اتنا راستہ طے کیا ہے۔ اور اس شیر کی خصوصیت یہ ہے کہ جو شخص بڑی دلیری سے اس کے پاس چلا جائے۔ اور محبت سے اس پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ وہ کچھ نقصان نہیں پہنچاتا۔ اور کوئی اس سے ڈرے اور ہراس کھا جائے تو شیر اس پر خشمگیں ہوتا ہے۔ بلکہ بعض پر وہ حملہ کر دیتا ہے۔ تو سال بھر چلتا رہا۔ اب تو شیر کے نزدیک پہنچا ہے۔ یہ ٹھٹک جانا کیسا؟ قدم آگے بڑھا، کسی کا یہ جگر نہ تھا کہ ایک قدم آگے بڑھاتا۔ بولے اتنے قدم چل کر ہم بھی آئے ہیں، وہ سب سہل تھے۔ یہاں سے آگے ایک قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اب اس ایمان سے حضرت عمرؓ کی مراد وہ قدم تھا کہ شیر کی حضوری میں ایک قدم شیر کی طرف اٹھایا جائے۔ اور وہ قدم بہت ہی نادر ہے۔ خواص اور مقربوں کے سوا یہ کسی کا کام نہیں اور خود قدم یہی ہے۔ باقی تو قدموں کے نشان ہیں۔ وہ ایمان سوائے انبیاء کے کسی کو نہیں ملتا۔ کیونکہ انہوں نے اپنی جان سے ہاتھ دھو رکھے ہوتے ہیں۔

دُنیا خیال پر قائم ہے

دوست اچھی چیز ہے۔ اس لیے کہ ایک دوست دوسرے دوست کے خیال سے قوت حاصل کرتا ہے اور فروغ پاتا ہے۔ اور زندگی حاصل کرتا ہے۔ اس میں کونسی تعجب کی بات ہے کہ مجنوں کو لیلیٰ کے خیال نے قوت دی۔ اور وہ اس کے لیے غذا بن گیا۔ جہاں مجازی معشوق کے خیال میں اتنی قوت اور تاثیر ہوتی ہے وہاں دوستِ حقیقی پر تجھے کیوں تعجب آتا ہے کہ اس کا خیال حضوری اور غیبت میں قوت بخشتا ہے۔ یہ کیا سوچنے کی بات ہے۔ وہ خود تمام حقیقتوں کی جان ہے۔ اس کو خیال نہیں کہتے۔ دنیا خیال پر قائم ہے۔ اور تو اس دنیا کو اس لیے حقیقت کہتا ہے کہ وہ نظر آتی ہے۔ اور محسوس ہوتی ہے۔ اور اس معنی کو جس کی ایک شاخ یہ دنیا ہے، تُو خیال کہتا ہے۔ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ خیال خود یہ دنیا ہے۔ کیونکہ اس معنی سے سو ایسے جہان پیدا ہوتے ہیں۔ اور خراب ہو جاتے ہیں۔ ویران ہو جاتے ہیں۔ اور مٹ جاتے ہیں۔ اور وہ پھر ایک بہتر عالمِ نو پیدا کرلیتا ہے۔ جو پھر پرانا نہیں ہوتا۔ وہ نئے پن اور کہنگی سے منزہ ہوتا ہے۔ اس کی شاخیں کہنگی اور نئے پن سے متصف ہوتی ہیں۔ اور وہ کہ ان کا حادث ہے، ان دونوں سے منزہ ہے۔ اور ہر دوست سے ورے ہے۔ ایک مہندس نے دل میں ایک خاکہ بنایا اور خیال باندھا کہ اس کا عرض اتنا ہے۔ طول اتنا ہے اور اس کا صفہ اتنا ہے اور صحن اتنا ہے۔ اسے خیال نہیں کہتے۔ کیونکہ وہ حقیقت اس خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ اس خیال کی شاخ ہے۔ ہاں اگر کوئی غیر مہندس ایسی صورت دل میں خیال کرے۔ اور تصور کرے۔ تو اسے خیال کہتے ہیں۔ اور عرفِ عام میں لوگ ایسے آدمی کو کہہ دیتے ہیں۔ یہ تیرا خیال ہے جو معمار نہ ہو۔ اور اس کا علم نہ رکھتا ہو۔

درویش لطیف ہے

فقیر کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ سوال نہ کرے۔ کیونکہ یہ ایسا ہے کہ تو اسے اس بات پر آمادہ کرتا ہے۔ اور اس راہ پر لاتا ہے کہ وہ جھوٹ ایجاد کرے۔ کیونکہ جس وقت اس سے کسی چیز کے متعلق سوال کیا گیا۔ وہ جواب میں سچ نہیں کہہ سکتا۔ چونکہ وہ ایسے جواب کے قابل نہیں ہے۔ اور یہ لقمہ اس کے کام و دہن کے قابل نہیں۔ وہ اپنی ہمت اور طالع کے مطابق جھوٹ اختراع کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ وہ سوال دور ہو جائے۔ اور اگرچہ جو کچھ فقیر کہتا ہے وہ سچ ہوتا ہے اور جھوٹ نہیں ہوتا لیکن جو اصل حقیقت اور اصل جواب ہے اس کے مقابلہ میں وہ جھوٹ ہی ہوتا ہے البتہ سننے والے کے نزدیک وہ سچ بلکہ سچ سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔

ایک درویش کا ایک شاگرد تھا۔ اس کے لیے وہ بھیک مانگتا۔ ایک دن بھیک سے جو کچھ حاصل ہوا اس سے وہ کھانا لایا۔ اور اس درویش نے کھایا۔ رات کو احتلام ہو گیا۔ پوچھا یہ کھانا کس کے پاس سے لایا تھا؟ کہا ایک معشوقہ لڑکی نے مجھے دیا تھا۔ کہا خدا کی قسم بیس سال سے مجھے احتلام نہ ہوا تھا۔ یہ اسی لقمہ کا اثر ہے۔ پس درویش کو احتراز کرنا چاہئے اور لسے ہر کسی کا لقمہ نہیں کھالینا چاہئے۔ کیونکہ درویش لطیف ہے اور اس پر چیزوں کا اثر ہوتا ہے۔ اور وہ اثر ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ سفید اور پاک کپڑے پر تھوڑی سے سیاہی کا نشان بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ لیکن جس سیاہ کپڑے پر سالہا سال میل جمتی رہی ہو۔ اور سفید رنگ اس میں نام کو باقی نہ رہا ہو۔ اس پر کتنی ہی میل اور چکنائی کیوں نہ جم جائے، خلقت کو اور اس کو معلوم نہیں ہوتی۔ پس جب یہ بات ہے تو درویش کو ظالموں، حرام خوروں اور جسمانیوں کا لقمہ نہیں کھانا چاہئے۔ کیونکہ ان کا لقمہ درویش پر اثر کرتا ہے۔ اور

اس لقمۂ بیگانہ کی تاثیر سے فاسد خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی طرح درویش کو اس لڑکی کے طعام سے احتلام ہوگیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سالکوں کے اوراد و وظائف

طالبوں اور سالکوں کے اوراد و وظائف یہ ہیں کہ وہ اجتہاد اور عبادت میں مصروف رہیں اور وقت کو جس طرح انہوں نے ہر کام پر تقسیم کیا ہوا ہے، اس کے پابند رہیں۔ اور تقسیم اوقات اس طرح ہے کہ زمانہ ان پر نگران کی طرح مسلط ہوگیا ہے۔

مثلاً جب وہ صبح کو اٹھتا ہے، اس گھڑی کی عبادت بہترین عبادت ہے۔ کیونکہ اس وقت نفس کو بہت سکون اور صفائی حاصل ہوتی ہے۔ ہر شخص اس طرح کی عبادت کہ جو اس کے قابل ہو، اور جس کا اندازہ اس کا شریف نفس کرے بجالاتا ہے۔

وانا لنحن الصافون وانا لنحن المسبحون. (سورۂ صافات: ع ۵) — ہم ہر وقت صف بستہ ہیں۔ ہم ہر وقت تسبیح کرنے والے ہیں۔

سو ہزار حیف ہے کہ جتنا کوئی زیادہ پاک ہو اتنا ہی اسے آگے لاتے ہیں اور جو کم تر ہو اسے پیچھے کی صف میں لے جاتے ہیں۔

اخروّھن من حیث اخروّھن اللہ[1] — ان میں اسی طرح تاخیر کرو جس طرح اللہ نے ان میں تاخیر کی ہے۔

یہ کہانی لمبی ہے۔ اور اس کی درازی سے مفر نہیں۔ جس کسی نے اس کہانی کو مختصر کیا۔ اس نے اپنی جان کو مختصر کرلیا۔

الا من عصم اللہ. — سوائے اس کے جسے اللہ محفوظ رکھے۔

---

[1] زاخروھن مراوش نفس نخست کو بآخر باید و عقلت نخست

میں واصل لوگوں کے اوراد و ظائف ان کی سمجھ کے مطابق بیان کرتا ہوں کہ صبح کی ان کی زیارت کے لیے مقدس ارواح اور پاک ملائکہ بھی آتے ہیں۔ اور وہ مخلوق بھی جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور اللہ نے ان کے نام کو بھی غایت غیرت کی وجہ سے لوگوں سے پوشیدہ رکھا ہے۔ اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ اور ملائکہ ان پر ہر دروازہ سے نازل ہو رہے ہیں۔

تو ان کے پہلو میں بیٹھا ہے[1] اور تو نہیں دیکھتا۔ اور ان کی باتوں اور سلام اور ہنسی کو نہیں سنتا اور یہ کیا تعجب ہوتا ہے کہ موت کے نزدیک پہنچی ہوئی حالت میں بیمار ایسے حالات کو دیکھ لیتا ہے جس کی اس کے پہلو میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو خبر نہیں ہوتی۔ اور وہ نہیں سنتے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ وہ حقائق ان خیالات سے ہزار مرتبہ لطیف تر ہیں۔ جب تک کوئی بیمار نہ ہو وہ نہ ان کو دیکھتا ہے اور نہ سنتا ہے۔ جب تک وہ مرے نہیں، ان حقائق کو نہیں دیکھتا۔ اور وہ زائر جو اولیاء کے نازک احوال ان کی عظمت اور جو کچھ ان کی خدمت میں ہے کو جانتا ہے، وہ اوّل اوّل ملائکہ اور پاک ارواح کی مدد ہی سے ان تک آیا ہے۔ اب وہ ان کے پاس آتے ہوئے بہت توقف کرتا ہے کہ کہیں وہ ان کے ورد و وظائف کے دوران میں نہ آئے۔ اس سے شیخ کو زحمت ہوتی ہے۔ جیسے بادشاہ کے محل کے دروازہ پر غلام حاضر ہوتے ہیں۔ ہر صبح ان کا وظیفہ یہ ہوتا ہے کہ ہر ایک کا مقام مقرر ہوتا ہے۔ خدمت مقرر ہوتی ہے اور عبادت مقرر ہوتی ہے۔ بعض دور رہ کر بادشاہ کی خدمت کرتے ہیں۔ انہیں بادشاہ نہیں دیکھتا۔ نہ وہ اس کے سامنے آتے ہیں۔ البتہ بادشاہ کے دوسرے غلام انہیں دیکھتے ہیں کہ فلاں نے فلاں خدمت کی ہے۔ جب وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔ تو اس کا وظیفہ یہ ہوتا ہے کہ ہر طرف سے اس کی خدمت میں غلام آئیں۔ اس لیے کہ اب وہ غلام نہیں

---

[1] اے بسا اصحاب کہف اندر جہاں پہلوئے تو پیش تو ہست ایں زماں
غار با تو یار با تو در سرود ہر بر چشم است و بر گوشت چہ سود

رہتا۔

تخلقوا باخلاق اللّٰہ.   اپنے اخلاق کو خدائی اخلاق سے متصف کرو۔

حاصل ہوا:

کنت لہٗ سمعًا وبصرًا.   میں اس بندے کا کان اور آنکھ بن جاتا ہوں۔

حاصل ہوا اور یہ مقیم سخت عظیم ہے۔ اس کا کہنا بھی حیف ہے کیونکہ اس کی عظمت عین، ظا، میم اور تاء سے فہم میں نہیں آتی اور اگر اس میں سے تھوڑی سی عظمت اسے مل جائے تو نہ عین باقی رہتا ہے[1] اور نہ عین کا مخرج۔ نہ ہاتھ باقی رہتا ہے اور نہ ہمت ہی باقی رہتی ہے۔ انوار کے لشکروں سے وجود کا شہر تباہ ہو جاتا ہے۔

ان الملوك اذا ادخلوا قریة افسدوها.   بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو
(سورۂ نمل: ع ۴)   اسے ویران کر ڈالتے ہیں۔

لوٹ اگر چھوٹے مکان میں گھس آئے تو مکان تباہ ہو جاتا ہے لیکن اس تباہی میں ہزار خزانے ہیں۔

ترجمہ شعر: خزانہ بے آباد جگہ پر ہوتا ہے اور آباد جگہ پر کتے ہی کتے ہوتے ہیں

اور جب سالکوں کے مقام کی شرح ہم نے طویل کر دی، تو واصلوں کی شرح احوال میں ہم کیا کہیں، سوائے اس کے کہ اُس کی کوئی انتہا نہیں۔ اور اس کی انتہا ہے۔ سالکوں کی انتہا وصال ہے۔ تو واصلوں کی انتہا کیا ہوگی۔ وہ وصل کہ جس کو فراق نہیں ہو سکتا۔ کوئی انگور دوبارہ غورہ نہیں بنتا[2] اور کوئی پختہ پھل دوبارہ کچا نہیں ہوتا[3]

---

[1] رو کہ بے یسمع و بے یبصر توئی   سر توئی چہ جائے صاحب سر توئی
آنکہ بے یسمع و یبصر شدہ است   در حق ایں بندۂ آں ہم بندہ است

[2] غورہ، انگور کچی حالت میں۔

[3] ہیچ انگورے دگر غورہ نشد   ہیچ میوہ پختہ باکورہ نشد

ترجمہ شعر: میں لوگوں سے بات کرنا حرام سمجھتا ہوں۔ مگر[1] جب تمہاری بات چھڑ جائے تو بات کو بڑی طوالت دیتا ہوں۔

خدا کی قسم میں بات کو لمبی نہیں کرتا ہوں، مختصر کرتا ہوں۔

ترجمہ شعر: میں خون پیتا ہوں اور تو اسے شراب سمجھتا ہے، تو جان نکال کر لیے جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جان دے رہا ہے۔

جس کسی نے اسے مختصر کیا تو یوں ہوا کہ اس نے سیدھا راستہ چھوڑ دیا اور ہلاک کر دینے والے بیاباں کا راستہ اختیار کیا کہ فلاں درخت قریب ہے۔

بہتر ورثہ ملے تو نہ چھوڑو!

مسیحی جراح نے کہا کہ شیخ صدر الدین کے اصحاب میں سے ایک گروہ نے میرے پاس شراب پی اور کہا عیسیٰ مسیح ابن مریم وہ خدا ہے جیسا کہ تم خیال کرتے ہو اور ہم اعتراف کرتے ہیں کہ یہی حق ہے۔ لیکن ہم قصداً اور ملت کی محافظت کے پیشِ نظر اسے پوشیدہ رکھتے اور اس سے انکار کرتے ہیں۔

مولانا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ اللہ کے دشمن نے جھوٹ بولا ہے۔ حاشا للہ یہ اس شخص کا کلام ہے، جسے شیطانی شراب نے بدمست کر دیا ہو۔ وہ خود گمراہ اور دوسروں کو گمراہ کرنے والا ہے۔ خود ذلیل ہے اور دوسروں کو ذلیل کرنے والا ہے۔ وہ راندۂ

---

[1] اسی خیال کو مولانا نے اپنی غزل میں بھی ادا کیا ہے۔

همه جمال تو بینم چو دیده باز کنم　　همه تنم دل گردد چو با تو راز کنم

حرام دارم با دیگراں سخن گفتن　　کجا حدیث تو آید سخن دراز کنم

(مثنوی مولانا روم)

درگاہِ حق ہے۔ یہ کیسے جائز ہے کہ یہود کے مکر سے ایک کمزور شخص ایک میدان سے دوسرے میدان میں بھاگ جائے اور صورت دو گز سے بھی کم ہو۔ سات آسمانوں کی حفاظت کے لیے ہر آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہو۔ اور ہر زمین سے دوسری زمین پانچ سو سال کی مسافت پر ہو۔ اور عرش کے نیچے ایک سمندر ہو، جس کی گہرائی اسی طرح پانچ سو سال کی مسافت ہو۔ اور اللہ تعالیٰ اس سمندر کا مالک ہو۔ پھر تیری عقل کیونکر مان لے گی کہ ان کا مصرّف اور مدبّر ایک بہت ہی ضعیف صورت ہے۔ پھر عیسیٰؑ سے پہلے زمینوں اور آسمانوں کا خالق کون تھا؟ جو کچھ یہ ظالم لوگ کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ہے۔ مسیحی نے کہا، مٹی، مٹی میں مل گئی اور پاک چیز پاک چیز میں۔ کہا اگر عیسیٰؑ کی روح اللہ تھی تو اس کی روح کہاں گئی؟ روح تو اپنے اصل کی طرف لوٹتی اور اپنے خالق کے پاس چلی جاتی ہے۔ اور اگر وہ یعنی عیسیٰؑ اصل ہیں تو خالق کہاں جائے گا؟

مسیحی نے کہا، ہم نے ایسا ہی پایا اور اسے ملت بنا لیا۔ کہا اگر تو اپنے باپ کے ترکہ میں کھوٹا سیاہ اور کاسد سونا پائے تو کیا تو کھرے سونے سے جو کھوٹ سے پاک ہو، اس کا تبادلہ نہیں کرلے گا؟ یا اگر تیرا ہاتھ شل اور بے حس و حرکت ہو اور تجھے اس کی دوا اور طبیب مل جائے جو تیرے شل ہاتھ کو درست کر دے۔ تو کیا تو اسے قبول نہ کرے گا؟ اور کیا تو کہے گا کہ میں اپنے ہاتھ کی تبدیلی پر رضامند نہیں ہوں؟ یا اگر تو نے کسی ایسے مقام پر پرورش پائی ہو جہاں تیرا باپ فوت ہو گیا ہو اور جس کا پانی کھاری ہو، اس کے بدلے تجھے دوسری وادی یا مقام مل جائے، جس کا پانی شیریں ہو، سبزیاں میٹھی ہوں اور باشندے صحت مند ہوں، تو کیا تو اس وادی میں منتقل ہو جانے پر راغب نہ ہو گا؟ اور اس کا شیریں پانی پینا نہ چاہے گا، جس سے تمام امراض دور ہو جائیں؟ اور کیا تو یہ نہ کہے گا کہ

ہم نے اپنی موروثی کھاری پانی والی وادی کے بدلے، جو بیماریوں کا گھر تھی، یہ اچھی وادی پا لی ہے اور اسے ہم نہیں چھوڑیں گے، ہرگز نہیں۔ کوئی عقلمند آدمی ایسا موقع نہیں جانے دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنے باپ سے علیحدہ عقل اور تمیز عطا فرمائی ہے۔ اس لیے تو اپنی عقل اور نظر کو معطل نہ کر۔ جو عقل تجھے دی گئی ہے، اس کی پیروی کر۔ اس کے سوا تجھے ہدایت نہیں ملے گی۔ کسی شخص کا باپ موچی ہو اور بادشاہ کے دربار میں پہنچ جائے۔ بادشاہ اسے آدابِ ملوک سکھا دے اور اعلیٰ مرتبہ پر فائز کر دے۔ تو وہ ہرگز یہ نہیں کہے گا کہ میرے آباء واجداد تو موچی تھے، ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے مرتبہ میں اضافہ ہو بلکہ اے بادشاہ ہمیں تو موچیوں کی ایک دکان بنا دے۔ ایک کتا جو خوبصورت ہو، بادشاہ اگر اسے شکار کھیلنا سکھا دے اور وہ شکاری کتا بن جائے۔ تو وہ اپنی اصلیت کو بھول جائے گا۔ اسی طرح باز ہے، جب بادشاہ اس کی تادیب کرے گا تو باز ہرگز یہ نہیں کہے گا کہ ہم نے تو اپنے باپ دادا سے یہ بات ورثہ میں پائی ہے کہ پہاڑ کی چٹانوں پر رہیں اور مردہ جانوروں کو کھائیں۔ اس لیے ہم طبلِ سلطانی اور شکار کی طرف التفات نہیں کرتے۔ پس جب عقلِ حیوانی میں یہ بات آجاتی ہے کہ اگر باپ کے ورثہ سے بہتر چیز مل جائے تو اسے نہ چھوڑنا چاہیے، تو انسان جسے عقل اور تمیز میں تمام اہلِ زمین پر فضیلت حاصل ہے، کی سمجھ میں کیوں یہ بات نہ آئے۔ کیا اس کی عقل اور تمیز حیوان کی عقل اور تمیز سے بھی کم ہے؟ **نعوذ باللہ من ذالک**۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ کہا جائے: عیسیٰؑ کے رب نے عیسیٰؑ کو عزت دی اور اپنا قرب عطا کیا۔ پس جس شخص نے عیسیٰؑ کی خدمت کی، اس نے خدا کی خدمت کی۔ اور جس نے اس کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے عیسیٰؑ سے بہت زیادہ فضیلت رکھنے والے نبی کو بھیجا۔ اور اس کے ہاتھوں اس سے زیادہ کچھ ظاہر ہوا، جو عیسیٰؑ کے ہاتھوں ظاہر ہوا تھا تو اس نبی کی اطاعت ہم پر واجب ہو گئی۔ اس کی ذات کی

وجہ سے نہیں بلکہ اس کے نبی ہونے کی وجہ سے۔ ذات کی وجہ سے صرف اللہ ہی کی عبادت کی جاتی ہے اور نہ کسی سے محبت کی جاتی ہے، سوائے اللہ کے، اور غیر اللہ سے محبت کی جاتی ہے تو اللہ ہی کے لیے۔ تیرے رب ہی کی طرف آخری منتہا ہے۔ یعنی تو کسی شے سے محبت کرے، تو اس شے کی وجہ سے نہ کرے۔ اور اس کی طلب کرے تو اس کے لیے نہ کرے۔ یہاں تک کہ اللہ پر جا کر منتہی ہو جائے اور تو اس سے اسی کے لیے محبت کرے۔

ترجمہ شعر: کعبے پر غلاف چڑھانا محض ایک خواہش کی تکمیل ہے۔ کعبے کا حسن یہی ہے کہ وہ اللہ کا گھر ہے۔

آنکھوں میں سرمہ لگانا، سرمہ کی مانند نہیں۔ جس طرح پھٹا پرانا لباس دولتمندی اور شان و شوکت کو پوشیدہ رکھتا ہے، اسی طرح عمدہ لباس اور اس کی پوشش فقراء کے جمال و کمال اور ان کی نورانیت کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ جب فقیر کا لباس پھٹا پرانا ہو تو اس کا دل کھل جاتا ہے۔

روحانی طلب کے بغیر رسد میسر نہیں

ایک سر وہ ہے جو کلاہِ زرّیں سے آراستہ ہوتا ہے۔ اور ایک سر ہے کہ کلاہِ زرّین اور تاجِ مرصع اس کے گھونگھریالے بالوں کے حسن کو چھپا دیتا ہے۔ اس لیے کہ گھونگھریالے بال عشق کے لیے بے حد کشش کا باعث ہیں۔ اور وہ دلوں کی تخت گاہ ہیں۔ تاجِ زرّیں بہر حال جمادات ہے۔ اسے پہننے والا معشوق ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی ہم نے سب چیزوں میں ڈھونڈی، اسے ہم نے فقر میں پایا۔ اس معشوق سے بھی

ہم نے محبت کی۔ وہ کسی چیز سے اتنا راضی نہ ہوا، جتنا کہ اس چیز سے۔ آخر میں بھی معشوق کا عاشق ہوں۔ عقل سے میرا کام ایسا کب ہوا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ موانع کو دور کرتا ہے، پردوں کو جلاتا ہے۔ سب عبادتوں کی اصل یہی ہے۔ باقی فرع ہے۔ جب تک تو بھیڑ کا گلا نہ کاٹے، اپلوں میں تو خواہ کتنا ہی دم پھونکے تجھے کیا فائدہ ہوگا۔ روزہ عدم کو لے جاتا ہے۔ کیونکہ آخر سب خوشیاں وہی ہیں۔

واللہ مع الصابرین۔ لور خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

بازار میں جو کوئی دوکان ہے۔ یا کوئی پہننے والی چیز ہے۔ یا کوئی سامان ہے یا کوئی ہنر ہے یا سررشتہ۔ ہر ایک کے لیے انسان کے نفس میں حاجت ہے لور وہ سررشتہ چھپا ہوا ہے۔ جب تک کوئی چیز چاہی نہ جائے وہ سررشتہ حرکت میں نہیں آتا لور ظاہر نہیں ہوتا۔ یہی حال ہر ملت، ہر دین لور ہر کرامت لور ہر معجزہ لور انبیاء کے احوال کا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا سررشتہ روحِ انسانی میں ہے۔ جب تک ان کی احتیاج نہ ہو وہ سررشتہ نہیں ہلتا لور ظاہر نہیں ہوتا۔

کل شیء احصیناہ فی امام مبین۔ (یٰسین ع:۱) ہر شے ہم نے ایک کھلی ہوئی کتاب میں محفوظ کردی ہے۔

کیا نیکی لور بدی کی فاعل ایک چیز ہے یا دو چیزیں ہیں؟ جب تک کہ انسان مناظرہ کے پھیر میں رہے گا، اس سوال کا جواب یہی ہوگا کہ دونوں کی فاعل دو چیزیں ہیں۔ اس لیے کہ ایک ہی چیز آپ اپنی ضد نہیں ہوسکتی۔ لیکن اگر اس لحاظ سے دیکھو کہ بدی نیکی سے جدا نہیں ہوسکتی، تو اس کی فاعل دو چیزیں نہیں ہیں، اس لیے کہ نیکی کا ترک بدی ہے۔ لور بدی کا ترک بغیر بدی کے محال ہے۔ یہ بیان کہ نیکی ترک بدی ہے کہ اگر بدی کی خواہش نہ ہو تو ترک نیکی نہ ہو۔ پس دو چیزیں نہ ہوئیں، جیسا کہ مجوسی کہتے

ہیں کہ یزداں نیکیوں کا خالق ہے اور اہرمن بدیوں اور مکروہات کا پیدا کنندہ ہے۔

ہم نے جواب دیا کہ محبوبات، مکروہات سے جدا نہیں ہیں۔ اس لیے مکروہ کے بغیر محبوب محال ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ محبوب دراصل مکروہ کا زوال ہے اور مکروہ کا زوال بغیر مکروہ کے محال ہے۔ خوشی غم کا زوال ہے اور غم کا زوال بغیر غم کے محال ہے۔ پس ایک ہی چیز ہوئی۔ لایتجزیٰ۔

عارف کی برائی اور نکوئی

میں نے کہا جب تک کوئی چیز فنا نہ ہو اس کا فائدہ ظاہر نہیں ہوتا۔ جیسا کہ سخن۔ جب تک اس کے حروف نطق میں فنا نہ ہوں، سننے والے کو اس کا فائدہ نہیں پہنچتا۔ جو شخص عارف کو بد کہتا ہے وہ درحقیقت عارف کی نکوئی کرتا ہے۔ کیونکہ عارف اپنی تعریف سے بھاگتا ہے۔ وہ اپنی نکوئی نہیں سنتا۔ عارف اپنی تعریف کا دشمن ہے۔ پس اس تعریف کو برا کہنے والا عارف کے دشمن کو برا کہنے والا ہوا، اور عارف کی ستائش کرنے والا ہوا۔ اب عارف اس برائی سے گریز کرتا ہے اور مذموم چیز سے گریز کرنے والا محمود ہوتا ہے۔

وبضدھا تبین الاشیاء۔ ہر چیز اپنی ضد سے واضح ہوتی ہے۔

پس حقیقت میں عارف جانتا ہے کہ وہ میرا دشمن نہیں، اور میری برائی چاہنے والا نہیں۔ کیونکہ میں خرما کے باغ کی طرح ہوں اور میرے گرد دیوار ہے اور اس دیوار پر نوکیلے شیشے اور کانٹے ہیں۔ جو کوئی گزرتا ہے باغ کو نہیں دیکھتا۔ اس دیوار اور آلائش کو دیکھتا ہے اور اسے برا کہتا ہے۔ پس باغ اس سے کیا غصے ہوگا، سوائے اس کے کہ وہ اسے برا

کہے گا جو دیوار پر چڑھنا چاہے تا کہ باغ میں پہنچ جائے۔ پس اس دیوار کی تکوئی باغ سے دور رہتی ہے۔ پس اس نے اپنے آپکو ہلاک کر لیا۔ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا:

انا الضحوك القتول. میں ہنستا ہوا قاتل ہوں۔

یعنی میرا کوئی دشمن نہیں تا کہ اس کے غصّے میں قہر ہو۔ وہ کافر کو اس واسطے قتل کرتا ہے کہ کافر اپنے آپ کو نہ مارے۔ یہ کئی طریقوں پر ہو سکتا ہے۔ پس یہ لازمی ہے کہ ایسی ہنسی قتل جیسی ہے۔

تشویش کی بجائے دُھن پیدا کرو

کوتوال چوروں کو لگا تار ڈھونڈتا ہے تا کہ انہیں پکڑے اور چور اس سے گریز کرتے ہیں۔ یہ طرفہ تماشا ہے کہ ایک چور کوتوال کو ڈھونڈتا ہے اور چاہتا ہے کہ کوتوال کو پکڑے اور خوش کرے۔ خداوند تعالیٰ نے بایزید سے کہا کہ اے بایزید! تو کیا چاہتا ہے؟ کہا میں چاہتا ہوں کہ کچھ نہ چاہوں[۱]

ارید ان لا ارید. میں چاہتا ہوں کہ نہ چاہوں۔

اب آدمی کی حالتیں دو سے زیادہ نہیں یا چاہتا ہے یا نہیں چاہتا۔ یہ کہ وہ کچھ بھی نہ چاہے۔ یہ آدمی کی صفت نہیں ہے۔ کچھ بھی نہ چاہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آپ سے تہی ہو گیا ہے اور کلی طور پر باقی نہیں رہا۔ کیونکہ اگر وہ باقی رہے تو آدمیت کی یہ صفت اس میں ضرور ہو گی کہ وہ چاہے اور نہ چاہے۔ اب خداوند تعالیٰ چاہتا ہے کہ اسے کامل بنائے اور مکمل شیخ بنا دے تا کہ اس کے بعد سے اسے وہ حالت حاصل ہو جائے۔ جس میں دوئی اور فراق کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کلّی وصل ہوتا ہے اور اتحاد۔ کیونکہ سب تکلیفیں اس وجہ

---

[۱] چنیں بساز کہ پیش تو انتہا نہ کنم بوقتِ کرب و بلا ہم خدا خدا نہ کنم

جب وہ نورِ خدا سے نظر ڈالتا ہے تو سب کو دیکھتا ہے۔ اوّل کو اور آخر کو، غائب کو اور حاضر کو۔ اس لیے نورِ خدا سے کوئی چیز کیسے پوشیدہ رہ سکتی ہے۔ اگر کوئی چیز پوشیدہ رہ جاتی ہے تو وہ نورِ خدا نہیں۔ پس وحی کا معنی ہے اگرچہ اسے وحی نہیں کہتے۔

زیادہ بولنے کی نسبت زیادہ کرنا بہتر ہے

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب بطور خلیفہ منبر پر چڑھے، خلقت منتظر تھی کہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ آپ جھک گئے اور کچھ نہ کہا اور خلقت پر نظر ڈالی تو اس پر وجد طاری کردیا۔ ان لوگوں کو اتنا بھی ہوش نہ رہا کہ باہر جائیں اور کسی کو خبر نہ تھی کہ کہاں بیٹھا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ سو تذکرہ، وعظ اور خطبہ سے بھی ان پر یہ اچھی حالت طاری نہ ہوتی۔ انہیں فائدے حاصل ہوئے اور ان پر ایسے اسرار منکشف ہوئے جو کتنے ہی عمل اور وعظ سے نہ ہوئے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے مجلس کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک یونہی نظر کی اور کوئی بات نہ فرمائی۔ جب منبر سے اترنا چاہا تو فرمایا:

ان لکم امام فعال خیراً لکم من امام قوّال۔ زیادہ بولنے والے امام سے زیادہ کرنے والا امام تمہارے لیے بہتر ہے۔

سچ فرمایا۔ جب قول کا مطلب فائدہ اور نرمی ہے اور اخلاق کی تبدیلی بات نہ کرنے پر اس سے کئی گنا ہوگئی، جو بات کرنے سے ہوتی، تو آپ نے جو کچھ فرمایا بالکل ٹھیک فرمایا۔ آدیم برسرِ مطلب کہ اپنے آپ کو انہوں نے فعال کہا اور اس حالت میں کہ آپ منبر پر تھے کوئی فعل نہ کیا جو نظر سے دیکھا جاسکتا۔ نماز نہ پڑھی۔ حج کو نہ گئے۔ صدقہ نہ دیا۔ ذکر نہ کیا۔ خود خطبہ تک نہ پڑھا۔ پس سمجھ گئے کہ عمل اور فعل تنہا ظاہرا طور پر ہی

نہیں، بلکہ یہ ظاہرین اس عمل کی صورت ہے اور وہ عمل جان ہے۔ یہ جو مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اھتدیتم۔[1] میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں۔ ان میں سے جس ستارہ کی بھی پیروی کروگے راہ پاؤ گے۔

یہ کہ کوئی شخص ستارے پر نظر ڈالتا ہے اور راستہ پکڑتا ہے۔ کیا اس سے ستارہ کوئی بات کرتا ہے؟ نہیں۔ صرف یہ بات ہے کہ وہ ستارہ کو دیکھتا ہے اور راستہ کو بغیر راہ کے جان لیتا ہے اور منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح تو اولیائے حق پر نظر کرے، تو وہ تجھ پر تصرف کرلیتے ہیں۔ گفتگو، بحث اور قیل و قال کے بغیر تجھے مقصود حاصل ہوجاتا ہے اور تجھے وہ وصل کی منزل پر پہنچادیتے ہیں۔

ترجمہ شعر: جس کا دل چاہے وہ مجھے دیکھ لے۔ اس لیے کہ مجھے دیکھنا اس کے لیے ایک انتباہ ہے جو عشق کو بہت آسان سمجھتا ہے۔

تحمّل اور مجاہدہ

خدا کی دنیا میں کوئی مشکل بات تحمل سے زیادہ محال نہیں۔ مثلاً تو کوئی کتاب پڑھ رہا ہوگا اور تصحیح اور درستی کررہا ہوگا اور اعراب لگا رہا ہوگا۔ کوئی شخص تیرے پہلو میں

---

[1] گفت پیغمبر کہ اصحابی نجوم راہرواں را شمع و شیطاں را رجوم
گفت پیغمبر کہ در بحر ہموم در دلالت دال تو یاراں را نجوم
ہادی یاراست یار اندر قدوم مصطفیٰ زایں گفت اصحابی نجوم
ماہ میگوید کہ اصحابی نجوم للسری قدوہ و للطاغی رجوم
(مثنوی مولانا روم)

بیٹھا ہے اور اس کتاب کو تتلا کر پڑھنے لگتا ہے۔ اب اسے برداشت کرسکنا ممکن نہیں اور اگر وہ اسے نہ پڑھتا ہوتا تجھے فرق نہ پڑتا۔ اب اس نے خواہ تتلا کر پڑھنے اور درست پڑھنے میں تمیز نہیں کی۔ تیرے لیے ایک ہی بات ہے۔ پس تحمل ایک بہت بڑا مجاہدہ ہے۔ اب انبیاء اور اولیاء اپنے آپ کو مجاہدہ میں نہیں ڈالتے۔ پہلا مجاہدہ جو طلب کے راستہ میں وہ کرتے ہیں قتلِ نفس، ترکِ مراد اور شہوات ہے اور یہ جہادِ اکبر ہے۔ اور جب وہ واصل ہوگئے، پہنچ گئے اور امن کے مقام پر مقیم ہوگئے، تو ان پر ٹیڑھا اور سیدھا منکشف ہوا۔ سیدھے کو ٹیڑھے سے تمیز کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ پھر بہت بڑے مجاہدہ سے دوچار ہیں۔ اس لیے کہ دنیا کے سب فعل ٹیڑھے ہیں اور وہ دیکھتے ہیں اور تحمل کرتے ہیں۔ اگر وہ تحمل نہ کریں اور کہدیں اور ان کے ٹیڑھے پن کو بیان کردیں، تو کوئی شخص ان کے پاس کھڑا نہ ہو اور مسلمانوں والا سلام انہیں نہ کہیں۔ مگر حق تعالےٰ نے انہیں بڑی وسعتِ دل اور حوصلۂ عظیم دے رکھا ہے کہ وہ تحمل کرتے ہیں۔ سو کجی میں سے ایک کجی کو بیان کرتے ہیں تاکہ اسے دشواری پیش نہ آئے اور باقی کجیوں کو چھپاتے ہیں۔ بلکہ ان کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ کجیاں صحیح ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ایک کرکے ان کجیوں کو دور کردیتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ استاد لڑکے کو خط لکھاتا ہے۔ جب سطر پر پہنچتا ہے تو لڑکا سطر لکھتا ہے اور استاد کو دکھاتا ہے۔ استاد کے لیے وہ سب ٹیڑھا اور بد ہوتا ہے۔ مگر وہ بناوٹ اور رعایت کے طریق پر اسے کہتا ہے کہ سب ٹھیک ہے اور تو نے خوب لکھا۔ تو نے بہت اچھا کیا۔ سوائے اس ایک حرف کے جو تو نے برا لکھا۔ اسے یوں ہونا چاہئے اور وہ ایک حرف بھی تو نے برا لکھا ہے۔ سطر میں سے چند حروف کو برا کہہ دیتا ہے اور اسے دکھا دیتا ہے کہ انہیں یوں لکھنا چاہئے اور باقی پر شاباش دیتا ہے۔ تاکہ اس کا جی نہ چھوٹ جائے اور اس کی کمزوری اس شاباش سے طاقت میں بدل جائے اور اسی طرح وہ لڑکا بتدریج تعلیم

حاصل کرتا اور مدد پاتا ہے۔

خدا کی عطا خدا کا اندازہ ہے

انشاء اللہ ہم امیدوار ہیں کہ خداوند تعالیٰ امیر کو مقصود حاصل کرائے گا۔ جو کچھ اس کے دل میں ہے اور وہ دولت بھی جس کا اس کے دل میں خیال نہیں، اور جس کے متعلق وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے تاکہ اسے چاہے۔ امید ہے کہ یہ سب اسے میسر آئے گا جب وہ انہیں دیکھے گا۔ اور وہ انعامات اسے ملیں گے، تو اسے اپنی پہلی خواہشات اور تمناؤں پر شرم آئے گی کہ ایسی چیزیں میرے سامنے موجود تھیں۔ ایسی دولتیں اور نعمتیں! تعجب ہے میں نے ان گھٹیا چیزوں کی تمنا کی۔ مجھے شرم آتی ہے۔ اب عطا اسے کہتے ہیں، جو آدمی کے وہم میں نہیں آتی۔ اس لیے جو کچھ اس کے خیال میں گزرتا ہے، وہ اس کی ہمت کا اندازہ اور اس کی قدر کا تخمینہ ہوتا ہے، لیکن خدا کی عطا خدا کا اندازہ ہوتی ہے۔

پس عطا وہ ہوتی ہے جو خدا کے لائق ہو، نہ کہ بندے کے وہم اور ہمت کے قابل۔

ما لا عین[1] رأت ولا اذن سمعت ولاخطر علیٰ قلب بشر۔ — جسے نہ آنکھ نے دیکھا، نہ کان سے سنا اور جو نہ کسی بشر کے دل پر منعکس ہوا۔

---

[1] ورنہ لا عین رأت چہ جائے باغ — گفت نور غیب را یزداں چراغ
کہ مرا از غیب نادر ہدیہ ہاست — کہ بشر آں را نیارد نیز خواست
باشد آنکہ از دواجات دگر — لا سمع اذن و لا عین بصر
قرض دہ کم کن ازیں لقمہ تنت — تا نماید وجہ لا عین رأت
آں دہد حق شاں کہ لا عین رأت — کاں نہ گنجد در زبان و در لغت
(مثنوی مولانا روم)

۱ ہر چند کہ میری عطا سے تو نے جو توقع کی، آنکھوں نے انہیں دیکھا ہوا تھا اور کانوں نے اس جنس کو سنا تھا۔ دلوں میں وہ جنس منقش تھی۔ لیکن میری عطاء ان سب کے احاطہ سے باہر ہوتی ہے۔

ظن، یقین میں فنا ہو جاتے ہیں

یقین کی صفت شیخِ کامل ہے۔ نیک ظن اس کے سچے مرید ہیں۔ ان ظنوں میں تفاوت ہے۔ ظن، اغلب ظن، اغلب اغلب ظن، وقس علیٰ ھذا۔ اسی طرح ہر ظن جو افزوں تر ہے، وہ یقین کے نزدیک تر ہے۔ انکار سے دور تر ہے۔

لووزن ایمان ابوبکر. اگر ابوبکرؓ کا ایمان تولا جائے..... الخ

سب سچے ظن، یقین کا دودھ پیتے ہیں اور بڑھتے ہیں۔ یہ دودھ پینا اور بڑھنا ظن کے علم و عمل کی زیادتی تحصیل کی نشانی ہے۔ یہاں تک کہ ہر ظن یقین بن جاتا ہے۔ اور سب ظن کلی طور پر یقین میں فنا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جب یہ یقین بن جاتے ہیں تو ظن نہیں رہتے۔ یہ ظاہراً شیخ اور مریدانِ شیخ عالمِ اجسام میں اس شیخ کے یقین اور اس کے مریدوں کے نقوش ہیں۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ یہ نقوش دور ابعد دور اور قرناً بعد قرن متبدل ہوتے رہتے ہیں۔ اور وہ شیخ یقین اور اس کے فرزند یعنی سچے ظن دُنیا میں برقرار رہتے ہیں۔ مرورِ زمانہ اور صدیوں کا امتداد بھی انہیں تبدیل نہیں کر سکتا۔ وہ ظن جو مٹانے والے، گمراہ کرنے والے اور انکار کرنے والے ہیں، سب کے سب شیخ یقین کے راندے ہوئے ہیں۔ یہ ظنون ہر روز اس سے دور تر ہوتے جاتے ہیں اور پیچھے رہتے جاتے ہیں۔ اور اس تحصیل میں ہر روز ترقی کرتے ہیں، جو ان برے ظنون کو بڑھاتی ہے۔

فی قلوبهم مرض فزادهم الله مرضا. (سورۂ بقر: ع ۲)	ان کے دلوں میں بیماری تھی، خدا نے ان کی بیماریاں بڑھادیں۔

قال الله تعالیٰ:

افلا ینظرون الی الابل (غاشیه)	کیا یہ لوگ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے؟
الّا من تاب وامن وعمل عملاً صالحاً فاولئك یبدل الله سیاٰتهم حسنات. (سورۂ فرقان: ع ۷)	البتہ جن لوگوں نے توبہ کی اور ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔ پس خدا ان کی بدیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا۔

ظن کے فساد میں جو تحصیل ہوئی، وہ اس گھڑی اصلاح ظن کے لیے قوت بن جاتی ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ کسی دانا چور نے توبہ کرلی، اور کوتوال بن گیا۔ چوری کی جن عیاریوں پر وہ عمل پیرا رہا تھا، وہ اس گھڑی احسان اور عدل میں اس کی قوت بن گئیں۔ اور اسے ان کوتوالوں پر فضیلت حاصل ہو گئی جو کبھی چور نہیں رہے تھے۔ اس لیے کہ یہ کوتوال جو چوریاں کرتا رہا تھا، چوروں کے طریقے جانتا ہے۔ چوروں کے احوال اس سے پوشیدہ نہیں رہتے۔ اور ایسا آدمی اگر شیخ بنے تو کامل ہو جاتا ہے، وہ بہت بڑا عالم اور مہدیٔ زمان بنتا ہے۔

مہار اور مہار کش میں فرق

وقالوا تجنبنا ولا تقربنا فکیف وانتم حاجتی اتجنّب

ترجمہ: وہ کہتے ہیں کہ ہم سے پرہیز کرو۔ اور ہمارے قریب نہ آؤ۔ جب تم ہی ہمارے مقصود ہو تو ہم تجھے کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ ہر شخص جس جگہ پر ہے، اپنی حاجت کا ایک پہلو ہے جو اس سے الگ نہیں ہوتا۔ اور ہر حیوان اپنی حاجت کا ایک پہلو ہے۔ اپنے باپ، ماں اور دوسرے اقرباء کی حاجت کا ملازم ہے۔ اور وہ حاجت اس کے گلے میں رسّی ہے، جو اسے مہار کی طرح ادھر ادھر کھینچے لیے پھرتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص خود اپنے آپ کو جکڑ لے۔ اس لیے کہ ہر شخص بندھن سے مخلصی پانے کا طالب ہے اور ناممکن ہے کہ مخلصی کی خواہش رکھنے والا قید وبند کا طالب ہو۔ پس ضرور اسے کسی نے باندھا ہے۔ مثلاً وہ صحت کا طالب ہے، پس اس نے اپنے آپ کو خود بیمار نہیں کیا ہو گا، اس لیے کہ یہ ناممکن ہے کہ وہ بیماری کی خواہش رکھتا ہو۔ اور ساتھ ہی اپنی صحت کا طالب بھی ہو۔ اور جب وہ اپنی ہی حاجت کا پہلو ہے تو اپنے حاجت دہندہ کا پہلوان بھی یہ خود ہی ہوا۔ اور جب وہ اپنی مہار کا آپ ہی ملازم ہے۔ تو اپنے مہار کشندہ کا ملازم بھی خود ہی ہوا۔ بات یہ ہے کہ اس کی نظر مہار پر ہے۔ اسی لیے وہ بے عزت اور ہیچ مقدار ہے۔ اگر اس کی نظر مہار کش پر ہوتی، تو مہار سے اسے مخلصی ہوتی۔ اس صورت میں اس کی مہار ہی اس کی مہار کش ہوتی۔ اس لیے کہ اس کو مہار اس لیے پہنائی گئی ہے کہ وہ بے مہار ہو کر مہار کنندہ کے پیچھے نہ جائے، اور اس کی نظر مہار کنندہ پر نہیں ہے۔

لاجرم سنسمیه علی الخرطوم. ہم اس کی ناک پر داغ لگائیں گے۔

ہم نے اس کی ناک میں مہار ڈالی اور اسے اپنی طرف کھینچا، بغیر اپنے مطلب کے، اس لیے کہ بغیر مہار کے وہ ہمارے پیچھے نہیں آتا۔

ترجمہ شعر: لوگ کہتے ہیں کہ اسّی کے بعد بھی کوئی کھیل ہوتا ہے؟ تو میں انہیں جواب دیتا ہوں کہ اسّی برس سے پہلے بھی کوئی کھیل ہوتا ہے؟

خداوند تعالیٰ نے بوڑھوں کو اپنے فضل سے ایک قسم کا بچپن عشا ہے کہ بچوں کو

اس کی خبر نہیں۔ اس لیے کہ اس سبب سے یہ بچپن تازگی بخشتا ہے، وہ کودتی ہے، ہنساتی ہے اور کھیلنے کی خواہش پیدا کرتی ہے۔ اس طرح وہ دُنیا کو نئی دیکھتا ہے اور اس سے ملول نہیں ہوتا۔ جب وہ اس بوڑھے جہان کو بھی نیا دیکھتا ہے تو اسی طرح اس سے کھیلنے کی آرزو کرتا ہے۔ اس سے وہ چست ہو جاتا ہے اور اس کا گوشت پوست بڑھ جاتا ہے۔

ترجمہ شعر: اگر ہمیشہ یہی ہوا کرتا کہ بڑھاپے میں گھوڑے کا کھیل ہوا کرے، تو بڑھاپے کی یہی شان ہوتی۔

پس پیری کا جلال خدا کے جلال سے زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا کے جلال کی بہار ظاہر ہوتی ہے۔ اور پیری کی خزاں اس پر غالب آجاتی ہے۔ اور اپنی خزاں والی فطرت کو وہاں رکھ دیا۔ پس بہار کا ضعف اللہ تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے کہ دانتوں کو گرانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی بہار کی ہنسی کم ہو جاتی ہے۔ اور سر کے بالوں کی سفیدی کی خاطر خدا کے فضل کی سرسبزی بیکار ہو جاتی ہے۔ اور بارانِ خزاں کے رونے کے لیے حقائق کا باغ مکدر ہو جاتا ہے۔

تعالی اللہ عما یقول الظالمون. ظالم لوگ جو باتیں بناتے ہیں، اللہ اس سے بہت بلند وبالا ہے۔

عارف کا تجزیہ

میں نے اسے وحشی حیوان کی صورت میں دیکھا۔ اس کا جسم لومڑی کا تھا۔ میں نے اسے پکڑنے کا ارادہ کیا۔ وہ ایک چھوٹے سے بالاخانہ میں تھا۔ اور اوپر دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے۔ اور دانت اس طرح اور اس طرح دکھاتا تھا۔ پھر میں نے

اس کے پاس جلال تبریزی کو ایک جانور کی شکل میں دیکھا۔ اور وہ بھاگا، پھر میں نے اسے پکڑ لیا۔ وہ مجھے کاٹنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے اس کا سر اپنے قدموں کے نیچے رکھ کر زور سے نچوڑا۔ یہاں تک کہ اس میں جو کچھ تھا، سب کا سب نکل آیا۔ پھر میں نے اس کی خوبصورت جلد کو دیکھ کر کہا۔ یہ اس لائق ہے کہ اسے سونے، جواہر، موتی، یاقوت اور ان سے بھی بہتر چیزوں سے بھر دیا جائے۔ پھر میں نے کہا، میں جو کچھ لینا چاہتا تھا، وہ میں نے لے لیا۔ اس لیے اے بھاگنے والے! اب تو جہاں دل چاہے بھاگ جا۔ اور جس طرف چاہے چھلانگیں مارتا چلا جا۔ اس کی یہ اچھل کود مغلوبیت کے ڈر سے تھی۔ اور مغلوبیت ہی میں اس کی سعادت تھی۔ اس کے دل میں رچ گیا۔ اور وہ یہ چاہتا تھا کہ تمام چیزوں کو اس طریقہ سے سمیٹ لے جس کو محفوظ رکھنے کی وہ کوشش کرتا رہا۔ لیکن یہ اس کے لیے ممکن نہ ہوا۔ کیونکہ عارف کے لیے بعض اوقات ایسی حالت ہوتی ہے کہ وہ اس جال سے شکار نہیں کر سکتا اور نہ اس کے لیے مناسب ہے کہ وہ اس جال سے اس شکار کو حاصل کرے۔ اگرچہ وہ کیسا ہی درست اور صحیح کیوں نہ ہو۔ پس عارف اس بات میں مختار ہے کہ کوئی پانے والا اسے پالے۔ اور کسی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ اسے پا سکے۔ مگر اس عارف کے اختیار سے اسے پایا جا سکتا ہے۔ تُو شکار کی گھات میں بیٹھ گیا، اور شکار تجھے دیکھتا ہے۔ اور تیری نیت اور حیلے کو سمجھتا ہے۔ اور وہ مختار ہے۔ اس کے عبور کرنے کے راستے محدود نہیں ہیں اور اس کا تیری گھات سے گزرنا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنے کئی راستوں سے گزر سکتا ہے۔ اور اللہ کی زمین وسیع ہے۔ اور اللہ کے علم کا اسی قدر احاطہ کیا جا سکتا ہے، جتنی اس کی مشیت ہو۔ پھر یہ باریکیاں جب تیری زبان اور تیرے ادراک میں آجائیں تو وہ فائق نہیں رہتے۔ بلکہ تیرے اتصال کی وجہ سے فاسد ہو جاتے ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی بری یا اچھی بات عارف کے منہ اور سینہ میں واقع ہونے کے بعد ویسی نہیں

رہتی۔ بلکہ وہ کوئی دوسری چیز بن جاتی ہے، جو عنایات اور کرامات کا لباس پہن لیتی ہے۔ کیا تجھے علم نہیں کہ عصانے حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ میں کیا لباس پہن لیا اور وہ عصانہ رہا۔ اور اسی طرح سے ستونِ حنانہ اور وہ لکڑی جو رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں تھی، اور دُعا عیسیٰؑ کے منہ میں اور لوہا داؤد کے ہاتھ میں اور اس کے ساتھ ہی پہاڑ بھی اپنی ماہیت پر قائم نہ رہے۔ بلکہ وہ ایک دوسری چیز بن گئے، جو وہ پہلے نہ تھے۔ پس اس طرح رقائق اور دعوات جب جسم کے ظلمانی ہاتھ میں آجائیں تو وہ اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہتے۔

ترجمہ شعر: تیری اطاعت کی وجہ سے کعبہ خرابات بنا ہوا ہے۔ تجھے جس سے واسطہ ہے، وہ تیری ذات کے اندر موجود ہے۔

کافر سات معدوں میں کھاتا ہے، اور یہ وہ گدھے کا بچہ ہے جس ایک جاہل فراش ہی پسند کرتا ہے۔ وہ ستر معدوں میں کھاتا ہے۔ اور اگر وہ ایک معدے میں کھاتا تو بھی وہ ستر ہی معدوں میں کھاتا۔ اس لیے کہ مبغوض کی ہر چیز مبغوض ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے محبوب کی ہر چیز محبوب ہوتی ہے۔ اور اگر فراش یہاں ہوتا تو میں اس کے پاس جاتا اور وہ اس کے دین، قلب، روح اور عقل کو خراب کرنے والا ہے۔ کاش کہ ان فسادات پر اسے کوئی دوسری چیز برانگیختہ کرتی، مثلاً شراب پینا، مطربہ کی صحبت۔ وہ اس سے زیادہ بہتر ہوتا۔ یہ اس کے زیادہ شایانِ شان ہوتا کہ کسی صاحبِ دل کی توجہ سے اس کی اصلاح ہوتی۔ لیکن اس نے تو اپنے گھر کو سجادوں سے بھر لیا۔ کاش کہ وہ ان میں ملفوف کر کے جلایا دیا جاتا، حتیٰ کہ فراش اس سے اور اس کی شر سے خلاصی پالیتا۔ کیونکہ اس کے صاحبِ دل کے متعلق اس کے اعتقاد کو فاسد کر دیتا ہے۔ اور اسے اس کے سامنے بہکا دیتا ہے۔ وہ اس کے سامنے بکواس کرتا ہے۔ اور وہ سکونت اختیار کیے رہتا ہے۔ اور اپنے آپ کو برباد کر لیتا ہے۔ حالانکہ اس نے اس نفس کو اوراد و وظائف اور مصلوں کے ذریعہ

قابو میں کیا تھا۔ شاید کہ اللہ کسی دن فراش کی آنکھوں کو کھول دے۔ اور اس نے جو نقصان اٹھایا ہے، اسے بھی دیکھ لے۔ اور صاحبِ عنایت کی رحمت سے جو دوری ہو گئی ہے، اسے بھی محسوس کرلے۔ اور وہ اپنے ہاتھ سے اس کی گردن مار ڈالے۔ اور کہے تو نے مجھے ہلاک کر دیا۔ مجھ پر میرے بوجھ اور میرے افعال کی شکلیں دونوں ایک جا اکٹھی ہو گئی ہیں۔ جس طرح انہوں نے مکاشفہ کے ذریعے میرے قبیح افعال، گمراہ اور فاسد اعتقادات کو میری پس پشت گھر کے ایک کونے میں یکجا دیکھ لیا۔ لیکن میں خود تو انہیں صاحبِ عنایت سے چھپاتا رہا۔ اور وہ صاحبِ عنایت اس سے جو میں پوشیدہ رکھتا تھا، واقف تھا۔ اور کہتا تھا تو مجھ سے کیا چھپاتا ہے۔ پس اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر میں ان خبیث صورتوں کو بلاؤں تو وہ ایک ایک کر کے میرے بالکل سامنے آجائیں۔ اور اپنے آپ کو اور اپنی حالت کو بالکل ظاہر کر دیں۔ اللہ اس قسم کے مظلوموں کو ایسے ڈاکوؤں سے نجات دے۔ اور ان سے بھی نجات دے جو خدا کے راستہ سے بہ طریقِ تعبد روکتے ہیں۔

بادشاہ میدان میں چوگان کھیلتے ہیں۔ تاکہ وہ اہلِ شہر کو دکھا سکیں۔ جو اہلِ شہر جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے۔ ان کو وہ ایک نمونہ دکھا سکیں کہ نبرو آزما کس طرح نبرو آزمائی کرتے ہیں۔ اور دشمنوں کے سروں کو کاٹ کر گیند کی طرح میدان میں لڑھکاتے ہیں۔ اور میدان کا یہ کھیل اصطرلاب کی طرح ہے، جس میں میدانِ جنگ کی کوششیں دکھائی ہوتی ہیں۔ اہل اللہ کے لیے اس کا مقصد لوگوں کو یہ دکھانا ہوتا ہے کہ جو اوامر و نواہی ان کے ساتھ مختص ہیں، ان کے مطابق وہ پوشیدگی میں کس طرح عمل کرتے ہیں۔ سماع میں گویے کی وہی حیثیت ہے جو نماز میں امام کی ہے۔ لوگ اس کا اتباع کرتے ہیں اگر وہ کوئی ثقیل چیز گائے تو ان کا رقص بھی ثقیل ہوتا ہے۔ اور اگر خفیف چیز گائے تو رقص خفیف ہوتا ہے۔ امر و نہی کی جو باطن میں پکار ہوتی ہے، ان کی پیروی کی یہ ایک مثال ہوتی ہے۔

اللہ کا لطف اور قہر لطیف ہیں

مجھے تعجب ہوتا ہے کہ جب ان حافظوں نے احوالِ عارفاں کے راستہ پر سفر نہیں کیا، تو جو یہ شرح فرماتے ہیں کہ :

ولا تطع کل حلاف. (قلم : ع ۱) کہنا نہ ماننا، قسمیں کھانے والے کا۔

یہ شرح خاص ان کی اپنی غمازی ہے کہ فلاں آدمی جو بات کہتا ہے، نہ من۔ کیونکہ مجھ سے وہ ایسا ہے :

همّاز مشآء بنمیم مناع للخیر. (سورۂ قلم : ع ۱) طعنہ دینے والا، چغلیاں کھاتے پھرنے والا، نیک کام سے روکنے والا۔

قرآن عجیب جادو ہے۔ وہ غیور انسان کو اس طرح باندھتا ہے کہ ظاہرا طور پر دشمن کے کان میں بھی اثر کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اسے سمجھ لیتا ہے۔ مگر اسے کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اور وہ اس کی لذت سے بے خبر رہتا ہے۔ یا وہ آپ ہی دوبارہ چھین لیتا ہے :

ختم الله. (سورۂ بقرہ) خدا نے مہر لگا دی۔

عجب لطف رکھتا ہے کہ وہ مہر لگا دیتا ہے۔ جس سے وہ سنتا تو ہے مگر سمجھتا نہیں۔ اور وہ بحث کرتا ہے مگر اس کے فہم میں نہیں آتا۔ اللہ لطیف ہے اور اس کا قہر لطیف ہے۔ اور اس کا قفل لطیف ہے۔ لیکن ایسا نہیں کہ قفل کھل جائے۔ کیونکہ اس کا لطف بیان میں نہیں سماتا۔ اگر میں اپنے اجزاء کو اس کے بے انتہا لطف اور ارادت سے کھولوں تو قفل کھل جائے اور وہ اس کا بے مثال کھولنے والا بن جائے گا۔ اور بیماری اور موت کو میرے حق میں متہم نہ کیجئے۔ کیونکہ اس میں مجھے مارنے والا چھپا ہوا ہے۔ یہ اس کا لطف اور بے مثالی ہوگی۔ وہ تلوار یا چھری جو سامنے آتی ہے، وہ اغیار کی نظروں سے چھپنے

کے لیے ہے۔ تاکہ نجس، ناپاک اور بیگانہ آنکھیں اس مقتل کا ادراک نہ کرنے پائیں۔

عشق ایک احتیاج ہے

صورت[1] عشق کی فرع بن گئی۔ کیونکہ عشق کے بغیر اس صورت کی قدر نہ تھی۔ فرع وہ ہوتی ہے جو اصل کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پس اللہ تعالیٰ کو صورت نہیں کہتے۔ جب صورت فرع ہوئی تو اللہ تعالیٰ کو فرع نہیں کہہ سکتے۔ کہا کہ عشق بھی صورت کے بغیر متصور نہیں ہے۔ صورت کے بغیر عشق کا انعقاد نہیں۔ پس فرع صورت ہوتی ہے۔ ہم کہتے ہیں، صورت کے بغیر عشق متصور کیوں نہیں؟ عشق تو صورت انگیز ہے۔ عشق سے سو ہزار صورت انگیختہ ہوتی ہے۔ ممثل بھی اور محقق بھی۔ اگرچہ نقش بغیر نقاش کے نہیں اور نقاش بغیر نقش کے نہیں ہوتا۔ لیکن نقش فرع ہے۔ اور نقاش اصل:

کحرکۃ الاصبع مع حرکۃ الخاتم۔ جس طرح انگلی کے ہلانے سے انگوٹھی ہلتی ہے۔

جب تک عشق خانہ نہ ہو، کوئی انجینئر خانہ کی صورت کا تصور نہیں کرتا۔ یہ اسی طرح ہے کہ ایک سال گندم سونے کے بھاؤ ہے اور ایک سال مٹی کے بھاؤ۔ گندم کی صورت وہی ہے، پس صورت گندم کی قدر و قیمت عشق ہوئی۔ اور اسی طرح وہ ہنر کہ

---

[1] این رہا کن عشق ہائے صورتے ۔۔ نیست برصورت نہ بر روئے ستے
آنچہ معشوقست صورت نیست آں ۔۔ خواہ عشق این جہاں خواہ آں جہاں
آنچہ برصورت تو عاشق گشتۂ ۔۔ چوں بروں شد جاں چرایش ہشتۂ
صورتش برجاست این زشتی زچیست ۔۔ عاشقا وا بیں کہ معشوق تو کیست
آنچہ محسوس است اگر معشوقہ است ۔۔ عاشقستی ہر کہ اورا حس است
چوں وفا آں عشق افزوں می کند ۔۔ کے وفا صورت دگرگوں می کند
(مثنوی مولانا روم)

جس کا تو طالب و عاشق ہوا ہو گا۔ تیرے نزدیک قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اور اس دور میں جبکہ ہنر کی مانگ نہ ہو کوئی شخص اس ہنر کو نہیں سیکھتا۔ اور اسے عمل میں نہیں ملاتا۔ کہتے ہیں کہ عشق آخر کسی چیز کی افلاس ہے، اور احتیاج ہے۔ پس احتیاج اصل ہوتی ہے۔ اور احتیاج لہیہ اس کی فرع۔ میں نے کہا کہ تو جو یہ بات کہتا ہے، حاجت ہی سے کہتا ہے۔ آخر یہ بات تیری حاجت سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ جب تجھے اس بات کا میلان ہوا تو بات پیدا ہو گئی۔ پس احتیاج مقدم ہو گی اور یہ بات اس سے پیدا شدہ ہے۔ پس اس کے بغیر احتیاج کا وجود تھا۔ پس عشق اور احتیاج اس کی فروغ نہ ہوئے۔ کہا آخر اس احتیاج کا مقصد یہ بات تھی۔ پس مقصود کے لیے فروغ ہوا۔ میں نے کہا فرع ہمیشہ مقصود ہوتی ہے کیونکہ مقصود درخت کے بیج سے ہے اور فرع درخت ہے۔

اولیاء دنیا سے قدیم تر ہیں

فرمایا کہ یہ کنیزک کا دعویٰ جو انہوں نے کیا اگرچہ جھوٹا ہے اور آگے نہیں جاسکے گا۔ لیکن اس جماعت کے وہم میں ایک بات بیٹھ گئی۔ آدمی کا یہ وہم اور باطن دہلیز کی طرح ہے۔ پہلے دہلیز پر آتے ہیں۔ وہاں سے گھر کے اندر جاتے ہیں۔ یہ ساری دنیا ایک گھر کی طرح ہے۔ جو شخص اندر آئے، ضروری ہے کہ گھر کی دہلیز اسے دکھائی دے۔ مثلاً یہ گھر کہ جس میں ہم بیٹھے ہیں انجینئر کے دل میں اس صورت میں پیدا ہوا۔ اس وقت یہ گھر بنا۔ پس ہم کہتے ہیں یہ ساری دنیا ایک گھر ہے۔ وہم اور فکر اور خیال اس گھر کی دہلیز ہیں۔ جو کچھ تو نے دہلیز پر دیکھا کہ موجود ہے۔ یہ حقیقت سمجھ کر کہ وہ گھر میں موجود ہے۔ خیر اور شر کے متعلق یہ تمام چیزیں جو دنیا میں ظاہر ہوئی ہیں، سب سے پہلے یہ

دہلیز میں ظاہر ہوئیں۔ پھر وہ یہاں اندر آئیں۔

خداوند تعالےٰ نے جب چاہا کہ وہ رنگا رنگ عجائب و غرائب، باغات، مرغزار، علوم و فنون اور رنگا رنگ تصانیف دنیا میں پیدا کرے تو ان کے اندر خواہش رکھدی اور اس تقاضا کی بنا رکھ دی، تاکہ اس سے یہ ظاہر ہوں اور اسی طرح تو اس دنیا میں جو کچھ دیکھتا ہے، سمجھ لے کہ اس عالم میں ہے مثلاً تو جو کچھ نمی میں دیکھتا ہے سمجھ لے کہ وہ دریا میں ہے۔ اس لیے یہ نمی اس دریا سے ہے۔ اسی طرح آسمان، زمین، عرش، کرسی اور دیگر عجائبات کی آفرینش کا تقاضا خداوند تعالیٰ نے اگلے زمانہ کے لوگوں کی ارواح میں رکھ دیا تھا۔ بالضرور یہ عالم اسی لیے پیدا ہوا۔

مرد جو یہ بات کہتے ہیں کہ دنیا قدیم ہے وہ کب سموع ہوتی ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ حادث ہے اور وہ اولیاء ہیں اور انبیاء ہیں کیونکہ یہ دنیا سے قدیم تر ہیں اور آفرینش عالم کا تقاضا خداوند تعالےٰ نے ان کی ارواح میں ڈالا تو اس وقت یہ عالم ظاہر ہوا۔ پس اولیاء اور انبیاء ہی در حقیقت جانتے ہیں کہ یہ عالم حادث ہے۔ یہ اپنے مقام سے خبر دیتے ہیں مثلاً ہم جو اس مکان میں بیٹھے ہیں۔ ہماری عمر ستاسٹھ برس ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ یہ مکان[1] پہلے نہیں تھا۔ چند سال ہوئے ہیں کہ جب سے یہ مکان ہے۔ اگر اس گھر میں اس کے درودیوار سے جانور مثلاً بچھو، چوہے، سانپ اور حقیر حیوانات پیدا ہوں اور وہ اس گھر کو آباد کریں اور وہ یہ کہیں کہ یہ گھر قدیم ہے تو ان کی یہ بات ہم پر حجت نہ ہوگی۔ جب ہم نے دیکھ لیا ہے کہ یہ گھر حادث ہے۔ وہ لوگ جو اس دنیا کے گھر میں اگے ہیں، ان جانوروں کی طرح ہیں جو اس گھر کے درودیوار سے اگے ہیں، اور اس گھر کے علاوہ کسی چیز کو نہیں جانتے۔ ان لوگوں میں کوئی خوبی نہیں۔ یہی ان کے اگنے کی جگہ ہے اور یہیں وہ

---

[1] پشہ کے داند کہ ایں باغ از کیست   کو بہاراں زاد و مرگش دردی است
کرم کاندر چوب زائد ست حال   کے بداند چوب را وقت نہال

آخر کار نیچے چلے جاتے ہیں۔ اگر یہ لوگ دنیا کو قدیم کہتے ہیں تو یہ بات انبیاء اور اولیاء پر حجت نہیں۔ انبیاء اور اولیاء کا وجود اس دنیا سے ہزاروں ہزار سال پہلے سے ہے۔ بلکہ کہاں کے سال اور کہاں کے عدد! ان کی نہ حد ہے اور نہ عدد۔ ان اولیاء اور انبیاء نے دنیا کا پیدا ہونا دیکھا ہے۔ جس طرح تو نے اس گھر کا پیدا ہونا دیکھا اور اس کے بعد وہ فلسفی ایک سنّی سے کہتا ہے کہ تو نے دنیا کی پیدائش کیسے جانی؟ اے گدھے! تو نے دنیا کا قدم کس وجہ سے سمجھا؟ آخر تیرا یہ کہنا کہ دنیا قدیم ہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ حادث نہیں اور یہ گواہی نفی پر ہے۔ نفی پر گواہی کی نسبت اثبات پر گواہی آسان ہوتی ہے۔ اس لیے کہ نفی پر گواہی کے یہ معنی ہیں کہ اس مرد نے فلاں کام نہیں کیا اور اس پر اطلاع مشکل ہونی چاہیے۔ چاہے وہ شخص عمر کے شروع سے اخیر تک سوتے جاگتے اس آدمی کا نوکر ہی رہا ہو۔ پھر بھی اگر وہ یہ کہے کہ اس نے کام نہیں کیا تو یہ حقیقت نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سو گیا ہو یا وہ حاجت کے لیے گھر گیا ہو اور اس کے لیے ممکن نہ رہا ہو کہ وہ حاضر رہے۔ نفی پر یہ گواہی روا نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ اس کی قدرت میں نہیں۔ لیکن اثبات میں گواہی اس کے مقدور میں ہے اور آسان ہے۔ اس لیے کہ وہ کہتا ہے میں لحظہ بھر اس کے ساتھ تھا۔ اس نے یوں کہا اور اس طرح کیا۔ بالضرور یہ گواہی قابلِ قبول ہے۔ اس لیے کہ یہ آدمی کے مقدور میں ہے۔ اب اے کتے! یہ جو حدوث گواہی دیتا ہے اس گواہی کا ماحصل یہ ہے کہ دنیا حادث نہیں ہے۔ پس تو نے نفی پر گواہی دی ہو گی۔ پس جبکہ دونوں کے بارے میں کوئی دلیل نہیں اور تو نے نہیں دیکھا کہ دنیا حادث ہے یا قدیم۔ تو اسے کہتا ہے تو نے کس طرح جانا کہ یہ حادث ہے؟ اور وہ بھی یہی کہتا ہے تو نے کس طرح جانا کہ اے دیوث! تو نے کیسے جانا کہ یہ قدیم ہے۔ آخر تیرا دعویٰ زیادہ مشکل اور زیادہ محال ہے۔

عقلِ جزوی اور عقلِ کل

مصطفیٰ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ کافروں نے اعتراض کرنے شروع کردیے۔ فرمایا کہ آخر تم سب متفق ہو کہ دنیا میں ایک شخص ہے جو صاحبِ وحی ہے۔ اس پر وحی اترتی ہے۔ ہر کسی پر نہیں اترتی اور جس شخص پر وحی اترتی ہے، اس کی علامتیں اور نشانیاں ہیں۔ اس کے فعل میں اور اس کے قول میں، اس کی پیشانی میں، غرضیکہ اس کے تمام اجزا میں نشان اور علامتیں ہوتی ہیں۔ اب جبکہ تم وہ نشانیاں دیکھتے ہو تو اس کی طرف متوجہ ہو اور اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑلو۔ تاکہ وہ تمہارا دستگیر ہو۔ وہ سب کے سب حجت میں مغلوب ہوگئے۔ اور کہنے کے لیے ان کے پاس کوئی اور بات نہ رہی۔ اب انہوں نے تلوار کا سہارا لیا اور صحابہؓ کو دکھ دینے لگے اور پیٹنے لگے اور ان کی تحقیر کرنے لگے۔ مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا۔ صبر کرو تاکہ کافر یہ نہ کہیں کہ تم ان پر غالب آگئے اور تم نے غلبہ اس لیے چاہا کہ دین کو پھیلاؤ۔ اس دین کو خدا پھیلائے گا۔ چنانچہ صحابہؓ مدت تک چھپ چھپ کر نماز پڑھتے اور مصطفیٰ ﷺ کا نام چھپ چھپ کر لیتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک مدت کے بعد وحی نازل ہوئی کہ تم بھی تلوار نکالو اور جنگ کرو۔

مصطفیٰ ﷺ کو جو امّی کہتے ہیں تو اس لیے نہیں کہتے کہ آپ انشاء اور علوم پر قادر نہ تھے، یعنی انہیں اس لحاظ سے امّی کہتے ہیں کہ انشاء اور علم اور حکمت ان کے مادر زاد تھے، سکول میں حاصل کردہ نہ تھے۔ جو شخص چاند پر رقمیں لکھتا ہے کیا اسے انشاء نہیں آسکتی؟ اور دنیا میں کیا ہے جو وہ نہیں جانتا۔ جبکہ سب اس سے سیکھتے ہیں؟ عقلِ جزوی کو کس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ جو عقلِ کل کو حاصل نہ ہو؟ عقلِ جزوی اس قابل نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کا اختراع کرسکے۔ جسے اس نے دیکھانہ ہو اور یہ جو آدمیوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں اور ہندسے لکھے ہیں اور نئی بنیادیں رکھی ہیں۔ یہ نئی تصانیف نہیں ہیں۔ اس جنس

کو انہوں نے پہلے دیکھا ہوتا ہے۔ ہاں اس پر جو اضافہ کرتے ہیں وہ اپنی طرف سے نئی اختراع کرتے ہیں وہ عقلِ کل ہوتے ہیں۔ عقلِ جزدی سیکھنے کے قابل ہے۔ وہ تعلیم کی محتاج ہے۔ عقلِ کل استاد ہے، محتاج نہیں ہے۔ اسی طرح جب تو ان سب پیشوں کو کرید کر ان کی اصل اور آغاز کو دیکھے گا تو ان کی بنیاد وحی پر ہو گی اور یہ پیشے انبیاء نے سکھائے ہیں اور وہ عقلِ کل ہیں۔ کوّے کی کہانی کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا۔ تو اسے (کوّے کی) سمجھ نہ آئی کہ کیا کرنا ہے۔ کوّے نے دوسرے کوّے کو مار ڈالا۔ مٹی کھودی اور اس ہلاک شدہ کوّے کو دفن کر دیا اور اس کے سر پر مٹی ڈال دی۔ قبر کھودنا اور دفن کرنا کوّے نے قابیل سے سیکھا۔ اسی طرح وہ تمام پیشے جو عقلِ جزدی سے ہیں تعلیم کے محتاج ہیں اور عقلِ کل چیزوں کو پیدا کرنے والی ہے۔ وہ اولیاء اور انبیاء ہی ہیں جنہوں نے عقل جزدی کو عقلِ کل سے ملایا ہے اور یہ ایک ہو گئی ہیں۔ مثال کے طور پر ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان اور انسان کے حواس اس لائق ہیں کہ دل اور عقل سے تعلیم حاصل کریں۔ پاؤں عقل سے چلنا سیکھتا ہے۔ ہاتھ دل اور عقل سے پکڑنا سیکھتا ہے۔ آنکھ اور کان، دیکھنا اور سننا سیکھتے ہیں۔ لیکن اگر دل اور عقل نہ ہوں تو کیا کوئی حس کام کرتی ہے؟ یا کر سکتی ہے؟ اب اسی طرح یہ جسم، عقل اور دل کی نسبت کثیف اور غلیظ ہے اور یہ لطیف ہیں اور یہ کثیف اس لطیف کی وجہ سے قائم ہے۔ اگر وہ لطافت اور تازگی حاصل کرتا ہے تو اسی سے کرتا ہے۔ اس کے بغیر یہ معطل ہے۔ پلید ہے اور کثیف اور ناشائستہ ہے۔

معنی کے ساتھ صورت بھی ضروری ہے

اسی طرح جزدی عقلوں کی نسبت عقلِ کل سے ہے اور وہ اس سے تعلیم پاتی

ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتی ہیں اور عقلِ کل کے سامنے وہ کثیف اور غلیظ ہیں
کہتا ہے کہ ہمیں ہمت سے یاد رکھ۔ اصل چیز ہمت ہے۔ جہاں بات کا تعلق ہے وہ فرع کا درجہ رکھتی ہے۔ فرمایا کہ آخر عالم سے پہلے یہ ہمت عالمِ اجسام سے پہلے عالمِ ارواح میں تھی۔ پس ہمیں عالمِ اجسام میں بغیر مصلحت کے لائے ہوں، یہ ممکن نہیں۔ پس بات بھی درکار ہے اور وہ فائدہ سے مُد ہے۔ اگر تو زرد آلو کا صرف گودا زمین میں بو دے تو کچھ نہیں اُگے گا۔ اگر چھلکے سمیت بوئے تو وہ اُگ آئے گا۔ پس ہم نے سمجھ لیا کہ صورت بھی درکار ہے۔ نماز بھی باطن میں ہے:

لاصلوٰۃ اِلّا بحضور القلب.   نماز حضورِ قلب کے بغیر نہیں ہوتی۔

لیکن ضروری ہے کہ تو نماز کو صورت میں لائے اور ظاہر ارکوع اور سجود کرے۔
اس وقت تو بہرہ مند ہو اور مقصود کو پہنچے۔

ھم علٰی صلاتھم دائمون. (معارج: ع ۱)   وہ ہمیشہ نماز میں رہتے ہیں۔

یہ نماز روح ہے۔ ظاہرا ساز وقت کی پابند ہے۔ وہ دائمی نہیں ہے اس لیے کہ عالم کی روح سمندر ہے۔ اس کی کوئی انتہا نہیں۔ جسم ساحل اور خشکی ہے۔ وہ محدود اور ناپا تلا ہوتا ہے۔ پس دائمی نماز روح کے بغیر نہیں ہوتی۔ روح کا ایک رکوع اور ایک سجود ہے۔ لیکن اسے ظاہرا رکوع اور سجود سے ادا کرنا چاہئے۔ اس لیے کہ معنی کا صورت سے اتصال ہے۔ جب تک وہ دونوں اکٹھے نہ ہوں فائدہ نہیں دیتے۔ یہ جو تو کہتا ہے کہ صورت معنی کی فرع ہے اور یہ کہ صورت رعیت ہے اور دل بادشاہ ہے۔ یہ اضافی نام ہیں۔ تو کہتا ہے کہ یہ اس کی فرع ہے۔ جب تک فرع نہ ہو اس کے اصل کا نام اس پر کیسے بیٹھے۔ پس وہ اصل فرع سے ہوا اور اگر وہ فرع نہ ہوتی۔ تو خود اس کا بھی نام نہ ہوتا اور جب تو عورت کہے تو ناچار مرد چاہیے اور جب تو رب کہے تو مربوب چاہیے اور جب تو حاکم کہے تو محکوم چاہیے۔

عالمِ فقر کا امتیاز

حسام الدین زنجانی فقراء کی خدمت میں پہنچنے اور ان سے صحبت رکھنے سے پیشتر بہت بڑا مناظر تھا۔ وہ جہاں بھی جاتا اور بیٹھتا بحث و مناظرہ میں بڑی کوشش کرتا۔ وہ خوب مناظرہ کرتا اور اچھا بولتا۔ لیکن جب وہ درویشوں کا ہم مجلس بنا تو بحث مباحثہ کی طرف سے اس کا دل سرد ہو گیا۔ عشق کو دوسرے عشق کے سوا کوئی نہیں کاٹتا۔[۱]

من اراد ان یجلس مع الله فلیجلس مع اهل التصوّف.	جو شخص خدا کی ہم نشینی چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ اہلِ تصوف کی ہم نشینی کرے۔

احوالِ فقراء کی نسبت یہ اعمال ایک کھیل ہیں اور یہ عمر ضائع کرنے کے مرادف ہیں کہ

انما الحیٰوۃ الدنیا لعب. (حدید : ع ۳)	دُنیا کی زندگی محض ایک کھیل ہے۔

جب آدمی بالغ ہو جاتا ہے، اور عاقل اور کامل ہو جاتا ہے تو وہ کھیلتا کودتا نہیں۔ اور اگر وہ کھیلتا کودتا ہے، تو انتہائی شرم کی وجہ سے چھپ کر ایسا کرتا ہے، تاکہ اسے کوئی دیکھے نہیں۔ یہ علم، قیل و قال اور دُنیا کی ہوس و ہوا ہے۔ اور آدمی خاک ہے۔ جب مٹی ہوا سے ملتی ہے تو جس جگہ پہنچتی ہے، آنکھوں کو خراب کرتی ہے، اور اس کے وجود سے تشویش اور اعتراض کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن اب اگرچہ وہ خاک ہے، جو بات بھی وہ سنتا ہے، روتا ہے۔ اس کے آنسو پانی کی طرح رواں ہو جاتے ہیں :

ترآی اعینهم تفیض من الدمع. (سورۂ مائدہ : ع ۱۱)	تم ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے دیکھو گے۔

خاک پر ہوا کی بجائے پانی ڈال دیا جائے تو کام اس کے برعکس ہوتا ہے۔ بے

---

[۱] ببرو عشق را جز عشق دیگر چرا یارے نگیری زو نکو تر

شک جب خاک کو پانی ملتا ہے تو اس پر سبزہ، پھول، بنفشہ اور گل و گلزار پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ راستہ فقر کا راستہ ہے، کہ اس پر چل کر تُو تمام آرزوؤں تک پہنچتا ہے۔ ہر وہ چیز جس کا تو تمنائی رہا تھا، اس راستہ سے تجھے پہنچتی ہے۔

لشکروں کو شکست دینا، دشمنوں پر فتح حاصل کرنا، ملکوں کو قابو میں کرنا، خلق کو مسخر کرنا، اپنوں پر تفوق پانا اور فصاحت و بلاغت اور اس دُنیا میں جو کچھ ہے، جب تو فقر کا راستہ اختیار کر لے تو یہ سب تجھے اسی راستہ سے ملتا ہے۔ کوئی شخص اس راستہ پر نہیں چلا، جس نے شکایت کی ہو۔ بر خلاف دوسرے راستوں کے کہ جو شخص ان پر چلے اور انہوں نے کوشش کی تو سو ہزار میں سے ایک کو مقصود حاصل ہوا۔ وہ بھی اس طرح نہیں کہ اس کا دل ٹھنڈا ہو اور اسے چین آ جائے۔ اس لیے کہ ہر راستہ کے لیے جدا اسباب اور طریقے ہیں۔ ان اسباب کے راستہ کے بغیر مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ اور وہ راستہ دور ہے اور مصیبت سے پُر ہے، اور ممانعت سے بھرا ہوا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ اسباب مقصود سے دور ہو جائیں۔

اب جب تو عالمِ فقر میں آ گیا اور اس میں کام کیا تو خداوند تعالیٰ نے تجھے ممالک اور دُنیائیں بخش دیں، جو تیرے وہم و گمان میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ اور جس چیز کی تو نے پہلے تمنا کی اور جسے تُو نے پہلے چاہا، اس سے تو شرمندہ ہوا کہ آہ! میں نے ایسی چیز کے ہوتے ہوئے جو مجھے مل گئی، اس حقیر چیز کی کیوں تمنا کی۔ لیکن خداوند تعالیٰ فرماتا ہے۔ اگر تُو اس سے منزہ ہو گیا اور تو نہیں چاہتا اور تو بیزار ہے۔ مگر اس وقت تیرے دل میں اس کا خیال گزرا تھا اور تو نے اسے ہماری خاطر ترک کر دیا۔ تو ہمارا کرم بے انتہا ہے۔ بے شک ہم تجھے وہ بھی میسر کرائیں گے۔ چنانچہ مصطفیٰ ﷺ نے اپنی مقبولیت اور شہرت سے پہلے عرب کی فصاحت و بلاغت دیکھی تو خواہش کی کہ مجھے بھی ایسی فصاحت و

بلاغت حاصل ہو۔ جب آپ پر عالمِ غیب منکشف ہو گیا اور آپ مستِ حق ہو گئے تو اس طلب اور تمنا کی طرف سے آپ کا دل سرد ہو گیا۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ جس فصاحت وبلاغت کی تو تمنا کرتا ہے، وہ میں نے تجھے دی۔ کہا یاالٰہی! وہ میرے کس کام آئیگی؟ میں اس سے باز آیا۔ میں وہ نہیں چاہتا۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا غم نہ کھا۔ یہ بھی ہے اور فراغت بھی قائم ہے۔ اس میں تیرا کوئی نقصان نہیں۔ خداوند تعالیٰ نے آپ کو وہ سخن دیا کہ تمام زمانہ نے آپ کے وقت سے لے کر آج تک کتنی جلدیں، اس سخن کی شرح میں تیار کیں اور تیار کر رہا ہے۔ اور ابھی اس کے ادراک سے دُنیا قاصر ہے۔ اور خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ صحابہؓ کمزوری، خوف اور حاسدوں کی وجہ سے تیرا نام چھپ کر[1] کان میں لیتے ہیں۔ میں تیری بزرگی کو اس حد تک نشر کروں گا کہ دُنیا بھر کی ولایتوں میں بلند میناروں پر سے ہر روز پانچ مرتبہ لطیف، خوش الحان اور بلند آواز سے مشرق اور مغرب میں اس کی شہرت ہو گی۔ اب جس کسی نے اپنے آپ کو اس راستہ میں ڈال دیا، اسے دین اور دُنیا کے تمام مقاصد حاصل ہو گئے۔ اور کسی نے اس راستہ کی شکایت نہیں کی۔ ہمارا سخن تمام کا تمام نقد ہے اور دوسروں کے سخن نقل ہیں۔ اور یہ نقل نقد کی فرع ہے۔ نقد آدمی کے پاؤں کی طرح ہے۔

اور نقل ایسی ہے کہ لکڑی کا سانچہ آدمی کے پاؤں کی شکل پر ہے۔ اب اس لکڑی کے پاؤں کو اس اصلی پاؤں سے انہوں نے چرا لیا ہے۔ اور اس کا اندازہ انہوں نے اس

[1] نامِ تو از ترسِ پنہاں می برند | چوں نماز آرند پنہاں بگذرند
خفیہ می گویند نامت را کنوں | خفیہ ہم بانگِ نماز اے ذوفنون
از ہراس و ترس کفار لعئیں | دینت پنہاں می شود زیرِ زمیں
من منارہ برکنم آفاق را | کور گردانم دو چشم عاق را
چاکرانت شہر ہا گیرند و جاہ | دینِ تو گیرند زماہی تا بماہ
تا قیامت باقیش داریم ما | تو مترس از نسخ دیں اے مصطفیٰ

سے کیا ہے۔ اگر دُنیا میں پاؤں نہ ہوتا تو اس سانچے کو کیسے شناخت کرتے۔ پس بعض سخن نقد ہیں، اور بعض نقل ہیں۔ اور یہ ایک دوسرے کی مانند ہیں۔ تمیز کرنے والا چاہیے، جو نقد کو نقل سے پہچان سکے۔ اور تمیز ایمان ہے اور کفر بے تمیزی ہے۔ کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ فرعون کے زمانے میں جب عصائے موسوی سامان بن گیا اور جادوگروں کی لکڑیاں اور رسیاں سانپ بن گئیں تو جس شخص کو تمیز نہ تھی، اس نے ان سب کو یک رنگ دیکھا اور ان میں فرق نہ کیا۔ اور جو شخص تمیز رکھتا تھا، اس نے جادو اور حق کے درمیان تمیز کر لی، اور تمیز کے ذریعہ مومن بن گیا۔ پس ہم نے سمجھ لیا کہ ایمان تمیز ہے۔

یہ فقہ

آخر یہ فقہ اصل میں وحی تھی، لیکن جب خلقت کے افکار اور حواس اور تصرف کی آمیزش ہو گئی، تو وہ لطف نہ رہا۔ اور اس گھڑی لطافت وحی میں سے کیا باقی رہا؟ یہ اسی طرح ہے جیسے پانی جو نالی میں شہر کو رواں ہے۔ جہاں اس کا سرچشمہ ہے، وہاں یہ کتنا صاف اور لطیف ہے۔ اور جب یہ شہر کے اندر آتا ہے اور باغوں، محلوں، اہلِ شہر کے مکانوں کے پاس سے گزرتا ہے تو اس میں خلقت اپنے ہاتھ، چہرہ، پاؤں اور دیگر اعضاء کی غلاظت اور کپڑوں، قالینوں کی میل، محلوں کے پیشاب اور گھوڑے خچروں کی نجاست اس میں ملا دیتی ہے۔ جب یہ پانی دوسرے سرے تک پہنچتا ہے تو تُو دیکھتا ہے کہ اگرچہ یہ وہی پانی ہے، یہ بدستور مٹی کو کیچڑ بناتا ہے، پیاسے کو سیر لب کرتا ہے، جنگل کو سرسبز بناتا ہے۔ لیکن تمیز کرنے والی آنکھ چاہیے۔ تجھے معلوم ہے کہ اس پانی میں جو لطافت پہلے تھی، وہ اب باقی نہیں رہی۔ اور اس میں بری چیزیں مل گئی ہیں۔

المومن کیس ممیز فطن عاقل. مومن صاحبِ کیاست ہوتا ہے، صاحبِ تمیز ہوتا ہے، صاحبِ فطانت و عقل ہوتا ہے۔

بوڑھا آدمی جب کھیل میں مشغول ہو تو عقلمند نہیں۔ خواہ وہ عمر میں سو سال کا ہو، ابھی خام ہے اور لڑکا ہے۔ اور اگر لڑکا ہے تو جب وہ کھیل میں مشغول نہیں، بوڑھا ہے۔ یہاں سن معتبر نہیں۔

ماءِ غیر آمن. نہ سڑنے والا پانی۔

"غیر آمن" پانی وہ ہوتا ہے جو دُنیا کی تمام پلیدیوں کو پاک کرتا ہے اور اس پر کوئی چیز اثر نہیں کرتی۔ وہ اتنا صاف اور لطیف ہوتا ہے کہ معدہ میں جا کر مضمحل نہیں ہوتا۔ نہ وہ خلط ملط ہوتا ہے اور نہ گندہ ہوتا ہے۔ اور وہ آبِ حیات ہے۔ ایک شخص نے نماز میں نعرہ مارا اور رو دیا۔ اس کی نماز باطل ہوئی یا نہیں[۱]؟ اس کا جواب تفصیل سے ہے۔ اگر اس کا رونا اس وجہ سے تھا کہ اسے ایک دوسرا عالم دکھایا گیا، جو بیرونِ محسوسات تھا، اور وہ اشکبار ہو گیا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس نے کیا دیکھا؟ ایسی چیز دیکھی جو نماز کی جنس سے ہے۔ اور مکمل نماز ہوئی جو نماز کا مقصود ہے۔ ایسی نماز صرف درست ہی نہ ہو گی بلکہ کامل تر ہو گی۔

اور اگر اس کے برعکس دیکھا۔ دُنیا کی خاطر رویا۔ یا دشمن پر غالب ہوا اس کی عداوت کی وجہ سے رونا آیا۔ یا کسی شخص سے حسد کیا کہ اسے اتنے اسباب کیوں میسر ہیں

---

[۱]
آں یکے پرسید از مفتی بہ راز | گر کسے گرید بہ نوحہ در نماز
آں نماز او عجب باطل بود | یا نمازش جائزہ و کامل بود
گفت آبِ دیدہ نامش بہر چیست | بنگری تا او چہ دیدہ کہ گریست
آبِ دیدہ تا چہ دیدہ است از نہاں | تا چنیں از چشمۂ خود شد رواں
آں جہاں گر دیدہ است آں پُر نیاز | رونقے یابد ز نوحہ او نماز
ور ز رنجِ تن بود و ز دردِ سوگ | ریسماں بگسست و ہم بشکست دوک

اور مجھے میسر نہیں۔ اس کی نماز بتر، ناقص اور باطل ٹھہری۔ پس ہم نے سمجھ لیا کہ ایمان تمیز ہے جو فرق کرتا ہے حق اور باطل میں اور نقد اور نقل میں۔ جس کسی کو تمیز نہیں، وہ محروم ہے۔ اب میں جو بات کہہ رہا ہوں، سننے والوں میں سے جس کسی کو تمیز ہے، وہ اس سے پھلے پھولے گا اور جس کو تمیز نہیں ہے، اس کے لیے یہ بات ضائع ہو گئی۔ یہ ایسے ہے کہ دو عقلمند اور قابل شخص جو شہر کے رہنے والے ہیں، شفقت کی بنا پر ایک دہقان کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے گواہی دینے جاتے ہیں۔ لیکن وہ دہقان اپنی جہالت سے کوئی بات ان دو کے خلاف کہہ دیتا ہے، جس سے گواہی کا کچھ نتیجہ نہیں نکلتا اور ان کی کوشش ضائع ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ دہقان آپ اپنا گواہ ہے۔ لیکن جب سکر کی حالت مستولی ہو جاتی ہے، تو مست آدمی یہ نہیں دیکھتا کہ یہاں کوئی تمیز کرنے والا موجود ہے یا نہیں۔ اور یہ کہ اس سخن کا مستحق یا اس سخن کا اہل یہاں پر کوئی ہے یا نہیں۔ وہ لاف زنی کر دیتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے، جیسے دودھ سے کسی عورت کے پستان بہت بھر جائیں اور وہ درد کرنے لگیں، تو وہ محلہ بھر کے کتوں کے بچے اکٹھے کر کے دودھ ان کے آگے ڈال دیتی ہے۔ اس طرح سخن تمیز کرنے والے آدمی کے ہاتھ آ جاتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قیمتی موتی تو نے اس بچے کو دے دیا، جو اس کی قدر و قیمت نہیں جانتا۔ وہ جب اس جگہ سے آگے بڑھتا ہے تو لوگ ایک سیب اس کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں اور وہ موتی اس سے ہتھیا لیتے ہیں۔ کیونکہ اس بچے کو اس کی تمیز نہیں، پس تمیز کے معنی بڑے ہیں۔

بایزید کو بچپن میں اس کے باپ نے مدرسہ میں بھیجا کہ وہ فقہ سیکھ لے۔ جب اسے مدرس کے سامنے لے گئے تو بایزید بولا، کیا یہ خدا کی فقہ ہے؟ کہنے لگے، یہ ابو حنیفہ کی فقہ ہے۔ بولا، میں خدا کی فقہ چاہتا ہوں۔ جب اسے نحوی کے پاس لے گئے، تو وہ بولا کیا

خدا کی نحو ہے؟ جواب ملا یہ سیبویہ کی نحو ہے۔ بولا مجھے یہ نہیں چاہیے۔ اسی طرح اسے جہاں بھی لے گئے۔ اس نے یونہی کہا۔ باپ اس سے عاجز آگیا اور اسے چھوڑ دیا۔ بعد میں وہ اسی طلب میں بغداد آیا۔ جنید کو دیکھتے ہی نعرہ مارا۔ کہا یہ ہے خدا کی فقہ۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بکری کا بچہ اپنی ماں کو نہ پہچانے، جس کا اس نے دودھ پیا ہے۔ اور وہ عقل اور تمیز اس میں ودیعت کی گئی ہے۔ پس ظاہریت کو چھوڑ دے۔

ایک شیخ تھا، وہ مریدوں کو اپنی خدمت میں دست بستہ کھڑا رکھتا۔ لوگوں نے کہا، اے شیخ! تو اس جماعت کو بٹھاتا کیوں نہیں؟ یہ درویشوں کی راہ و رسم نہیں۔ یہ عادت امراء اور ملوک کی ہے۔ بولا نہیں خاموش رہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اس طریق کار کی تعظیم کریں تاکہ پھلیں پھولیں۔ اگرچہ تعظیم دل سے ہے۔ پھر بھی:

الظاهر عنوان الباطل. ظاہر باطن کا عنوان ہے۔

عنوان کا معنی کیا ہے؟ یعنی یہ کہ عنوان سے مکتوب کو سمجھ لیتے ہیں کہ مکتوب کس کے لیے ہے اور کس کے پاس ہے۔ اور عنوان سے کتاب کو سمجھ لیتے ہیں کہ اس میں کیا کیا باب اور کیا کیا فصلیں ہیں۔ ظاہر اتعظیم یعنی سر جھکانے اور پاؤں پر کھڑے رہنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی کے دل میں خدا کی کتنی تعظیم ہے۔ اور وہ کس طرح تعظیم کرتا ہے۔ اور اگر وہ ظاہر اتعظیم نہیں کرتا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا باطن بے باک ہے اور وہ مردانِ حق کی تعظیم نہیں کرتا۔

سوال کے لیے زبان ضروری نہیں

جوہر خادمِ سلطان نے سوال کیا کہ زندگی میں ایک آدمی کو پانچ بار تلقین کرتے ہیں، وہ نہ بات کو سمجھتا ہے، اور نہ ضبط کرتا ہے۔ مرنے کے بعد اس سے کیا سوال کریں

گے ؟ کیونکہ وہ یاد کیے ہوئے سوال اپنی موت کے بعد بھول جاتا ہے۔ میں نے کہا جب یاد کیا ہوا بھول جاتا ہے تو ضرور صاف اور شائستہ ہو جاتا ہے۔ خاص کر نا آموختہ سوال سے۔ اس گھڑی سے لے کر اب تک تو میرے کلمات سنتا ہے، ان میں سے بعض کلمات کو تو قبول کرتا ہے کیونکہ اس قسم کے کلمات تو سن چکا ہے اور قبول کر چکا ہے۔ بعض کلمات کو تو نیم قبول کرتا ہے اور تو بعض پر توقف کرتا ہے۔ تیرے اس اندرونی ردّ و قبول اور بحث کو کوئی نہیں سنتا۔ اسے معلوم کرنے کے لیے کوئی آلہ موجود نہیں۔ ہر چند کہ تو کان رکھتا ہے، اندر سے تیرے کان میں کوئی آواز نہیں آتی۔ اگر تو اپنے اندر تلاش کرے تو کسی بات کرنے والے کو اپنے اندر نہیں پائے گا۔ زیارت کے لیے تیرا یہ آنا عین سوال ہے۔ بغیر منہ اور زبان کے کہ ہمیں راہ دکھاؤ اور ہماری راہ کو روشن سے روشن تر کرو۔ ہم خاموش رہیں یا باتیں کریں۔ ہمارا آپ کے پاس بیٹھنا ہی آپ کے سوال ہائے پنہاں کا جواب ہے۔ یہاں سے اٹھ کر تو پھر بادشاہ کے حضور میں جاتا ہے۔ تو تیرا اس کے حضور میں جانا ہی بادشاہ سے سوال و جواب ہے۔ اور بادشاہ کا اپنے غلاموں کے سامنے سارا دن خاموش رہنا سوال ہے کہ وہ کس طرح اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے اور دیکھتے ہیں۔ اگر باطن میں کسی کی نظر کج ہو تو اس کا جواب اسے ٹیڑھا ہی ملتا ہے۔ وہ خود سمجھتا ہے کہ اسے اندر سے جواب سچا نہیں مل رہا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کسی کی زبان میں لکنت ہو تو وہ خواہ کتنا ہی چاہے کہ ہر بات ٹھیک طرح سے کرے، مگر نہیں کر سکتا۔ زرگر سونے کو پتھر سے پیٹتا ہے، تو یہ سوال ہے۔ سونا جواب دیتا ہے کہ میں خالص ہوں یا مجھ میں آمیزش ہے۔

ترجمہ شعر : جب تو صاف ہو تو کھٹالی تجھے خود بتائے گی کہ تو خالص سونا ہے یا سونے میں تانبا ملا ہوا ہے۔

بھوک طبیعت کی طرف سے سوال ہے کہ جسم کے گھر میں خلل ہے۔ اینٹ

دے، مٹی دے۔ کھانا جواب ہے کہ پکڑ۔ نہ کھانا جواب ہے کہ ابھی حاجت نہیں۔ وہ مہرہ ابھی خشک نہیں ہوا۔ اس مہرہ کے سر کو پیٹنا نہیں چاہیے۔ طبیب آتا ہے۔ نبض پکڑتا ہے، وہ سوال ہے۔ رگ کا ہلنا جواب ہے۔ قارورہ پر نظر ڈالنا سوال ہے۔ اور لاف زنی کے بغیر بات کرنا جواب ہے۔ دانہ زمین میں ڈالنا سوال ہے کہ مجھے فلاں پھل چاہیے۔ درخت کا اگنا جواب ہے، زبان کی لاف زنی کے بغیر۔ چونکہ جواب بغیر حرف کے ہے، سوال بھی بے حرف ہی ہونا چاہیے۔ اب دانہ بہت پرانا ہو تو درخت پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بھی سوال وجواب ہے:

اما علمت ان ترك الجواب جواب. — کیا تو نہیں سمجھا کہ جواب نہ دینا جواب ہے۔

ایک بادشاہ نے کسی کا رقعہ تین مرتبہ پڑھا، جواب نہ لکھا۔ اس نے شکایت کی کہ میں نے تین مرتبہ خدمت میں عرض کی ہے۔ آپ اسے قبول فرمائیں یا رد فرمائیں۔ بادشاہ نے رقعہ کی پشت پر لکھا۔ اما علمت ان ترك الجواب جواب۔ کیا تو نہیں سمجھا کہ جواب نہ دینا جواب ہے۔

وجواب الاحمق سکوت. — اور احمق کا جواب خاموشی ہے۔

درخت کا نہ اگنا ترک جواب ہے، لازمی طور پر یہ جواب ہے۔ ہر حرکت جو آدمی سے سرزد ہوتی ہے، ایک سوال ہے اور اس کے سامنے خوشی یا غم جو کچھ آتا ہے، وہ جواب ہے۔ اگر جواب اچھا سنے تو چاہیے کہ شکر کرے اور شکر یہ ہوتا ہے کہ ویسا ہی سوال کرے۔ اس سوال پر جواب ملے اور اگر جواب برا سنے تو جلد استغفار کرے اور ویسا دوسرا سوال نہ کرے۔

فلولا اذ جاء هم باسنا تضرّعوا ولكن قست قلوبهم. (سورۂ انعام: ع ۵) — جب ہمارا عذاب آپہنچا تو انہوں نے تضرع اور عاجزی سے کیوں نہ کام لیا۔ نہیں بلکہ ان

کے دل تو سخت ہو چکے تھے۔

یعنی وہ نہ سمجھے کہ جواب ان کے سوال کے مطابق ہے:

وزيّن لهم الشيطان ماكانوا يعملون. — شیطان نے ان کے کرتوت خوشنما کر دکھائے۔
(سورۂ انعام: ع ۵)

یعنی وہ اپنے سوال کو جواب دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ زشت جواب اس سوال کے لائق نہیں ہے اور وہ نہیں جانتے کہ دھواں ایندھن سے تھا، نہ کہ آگ سے۔ ایندھن جتنا زیادہ خشک ہوگا، دھواں اتنا ہی کم ہوگا۔ تو نے ایک باغ کسی باغبان کے سپرد کیا۔ اب اگر اس میں اچھی خوشبو نہ آئے تو الزام باغبان پر ہے، باغ پر نہیں۔

کہا ماں کو کیوں قتل کیا؟[1] میں نے ایک بات دیکھی تھی جو اس کے لائق نہ تھی۔
کہا اس بیگانے مرد کو قتل کرنا چاہیے تھا۔ بولا کیا میں ہر روز ایک مرد کو قتل کرتا؟
اب جو کچھ پیش آئے۔ اپنے نفس کی تادیب[2] کر۔ تاکہ ہر روز کسی سے تجھے جنگ نہ کرنی پڑے۔

تُو جو کہے گا، وہی سنے گا

اگر وہ کہیں:

ل آں یکے از خشم مادر را بکشت — ہم بزخم خنجر و ہم زخم مشت
آں یکے گفتش کہ از بد گوہری — یاد ناوردی تو حق مادری
ہی تو مادر را چرا کشتی بگو — اوچہ کرد آخر بگو اے زشت خو
ہیچ کس کشتہ است مادرائے عنود — می نگوئی کوچہ کرد آخر چہ بود
گفت کارے کرد کاں عارویست — کشتمش کآں خاک ستارویست
گفت آں کس را بکش اے محتشم — گفت پس ہر روز مردے را کشم
م نفس کشتی باز رستی زا عتذار — کس ترا دشمن نماند در دیار

کُلٌ من عنداللہ (سورۂ نساء : ع ۱۱) ہر شے خدا ہی کی جانب سے ہے۔

ہم کہتے ہیں، اپنے نفس کا عتاب کرنا اور ایک دنیا کو رہا کرنا بھی خدا ہی کی طرف سے ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص زرد آلو[1] کے درخت سے پھل گراتا ہے اور کھاتا ہے۔[2] باغ کا مالک آجاتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے تو خدا سے کیوں نہیں ڈرتا کہ چوری کر رہا ہے۔ وہ شخص جواب دیتا ہے۔ کیوں ڈروں؟ پھل خدا کا ہے اور میں جو کھا رہا ہوں خدا کا بندہ ہوں۔ خدا کے مال سے کھا رہا ہوں۔ باغ کا مالک دوسروں سے کہتا ہے، مجھے ایک رسّی لادو تاکہ میں اسے جواب دوں۔ وہ اس شخص کو درخت سے باندھ دیتا ہے اور مارتا ہے تاکہ اسے جواب معلوم ہو۔ وہ فریاد اور آہ و زاری کرتا ہے کہ تو خدا سے کیوں نہیں ڈرتا؟ باغ کا مالک کہتا ہے کیوں ڈروں؟ تو خدا کا بندہ ہے اور میں تجھ بندۂ خدا کو خدا کی اس لکڑی سے پیٹتا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ اس دنیا کی مثال پہاڑ کی سی ہے۔ تو اچھا یا برا[3] جو کہے گا پہاڑ سے وہی سنے گا اور اگر تو خیال کرے کہ میں نے اچھی بات کہی تھی مگر پہاڑ نے برا جواب دیا تو یہ ناممکن ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ پہاڑ میں بلبل چہکے تو وہاں سے آواز کوّے کی آئے یا آدمی کی آواز یا گدھے کی آواز آئے۔ اگر پہاڑ سے گدھے کی آواز آتی ہے تو یقین کر کہ

---

[1] اصل لفظ قمرالدین ہے۔ یہ زرد آلو کی ایک قسم ہے۔

[2]
آں یکے بر رفت بالائے درخت — می فشاندآوه میوه را و ز دانه سخت
صاحبِ باغ آمد و گفت اے دنی — از خدا شرمیت کو چہ می کنی
گفت از باغِ خدا بندۂ خدا — گر خورد خرما کہ حق کردش عطا
عامیانہ چہ ملامت می کنی — بخل بر خوانِ خداوندِ غنی
گفت اے ایبک بیاور آں رسن — تا بگویم من جوابِ بوالحسن
پس بہ بستش سخت آں دم بر درخت — می زند بر پشت و پہلو چوب سخت
گفت آخر از خدا شرمی بدار — می کشی ایں بے گنہ را زار زار
گفت کز چوبِ خدا ایں بندہ اش — می زند بر پشت دیگر بندہ خوش
چوبِ حق و پشت و پہلو آنِ او — من غلام و آلتِ فرمانِ او

[3] ایں جہاں کوہست و فعلِ ما ندا — سوئے ما آید ندا ہا را صدا

تو نے گدھے کی آواز ہی نکالی ہوگی۔

ترجمہ شعر: جس وقت تو پہاڑ میں آئے۔ تو آواز کو خوش الحان رکھ۔ پہاڑ میں کھڑا ہو کر گدھے کی طرح کیوں ہینکتا ہے۔ اس آسمان کے گنبد کی صدا بھی ایسی اچھی ہے جیسی کہ تیری آواز ہے۔

تخصیصِ ذوق کی اہمیت

ہم پانی پر پیالے کی طرح ہیں[۱] پیالے کا پانی پر چلنا پیالے کے حکم سے نہیں ہے، یہ پانی کے حکم سے ہے۔ کہا یہ عام ہے۔ لیکن بعض جانتے ہیں کہ وہ پانی پر ہیں اور بعض نہیں جانتے۔ فرمایا اگر عام ہوتا تو اس کی تخصیص درست نہ ہوتی کہ:

قلب المومن بین اصبعین. من اصابع الرحمٰن. (سورۂ رحمٰن) — مومن کا قلب خدا کی دو انگلیوں[۲] کے درمیان ہے۔

اور نیز فرمایا:

الرحمٰن علّم القرآن. (رحمٰن: ع ۱) — وہ رحمٰن جس نے قرآن کی تعلیم دی۔

اور نہیں کہہ سکتے کہ یہ عام ہے۔ تمام علوم اسی نے سکھائے۔ قرآن کی کیا تخصیص ہے اور اسی طرح:

خلق السمٰوات والارض. (ہود) — زمین اور آسمان کو پیدا کیا۔

۱۔ صورتِ ما اندریں بحرِ عذاب ۔۔۔ می دود چوں کاسہ ہائے بر روئے آب
تا نشد پُر بر سرِ دریا چو طشت ۔۔۔ چونکہ پُر شد ووولے غرق گشت

۲۔ در کفِ حق بہر داد و بہر زیں ۔۔۔ قلبِ مومن ہست بین اصبعین
مرغ مضطر مردہ اندر وصل و بیں ۔۔۔ خوانده القلب بین اصبعین
منکرِ حق سرچشمۂ ایں مکرہاست ۔۔۔ قلب بین الاصبعین کبریاست

آسمان اور زمین کی کیا تخصیص ہے۔ جب تمام اشیاء کو علی العموم اس نے پیدا کیا تو بے شک پانی پر سب پیالے اسی کی قدرت اور مشیت سے ہیں لیکن زشت چیزوں کو اس سے منسوب کریں تو یہ بے ادبی ہوتی ہے جیسا کہ:

یا خالق السرقین والضراط والفسا یاخالق السموٰات ویاخالق العقول.	اے گوہر اور بے آواز اور آواز دار یادوں کے خالق۔ اے آسمانوں کے خالق اور عقلوں کے خالق۔

پس اس تخصیص کا فائدہ ہے اگرچہ عام ہے۔ پس کسی چیز کی تخصیص اس چیز کو کاٹنے پر دلالت کرتی ہے۔ پیالہ پانی پر چلتا ہے اور پانی اس لیے لے جاتا ہے کہ سب لوگ اس پیالہ کا نظارہ کریں اور پانی کو پانی اس وجہ سے لے جاتا ہے کہ سب لوگ طبعاً اس سے گریز کرتے ہیں اور باعث ننگ کہتے ہیں اور پانی انہیں گریز کا کام کرتا ہے اور گریز کرنے کی طاقت دیتا ہے اور ان کے دل میں ڈال دیتا ہے کہ:

الهم زدنا منه بُعداً.	اے خدا اس سے ہمارا بعد زیادہ کر۔

اور اس پہلے سے:

اللّهم زدنا منه قرباً.	اے خدا اس سے ہمارا قرب زیادہ کر۔

اب وہ شخص جو عام دیکھتا ہے کہتا ہے کہ تسخیر کے اعتبار سے دونوں ہی پانی کے مسخر ہیں۔ ایک ہے جو جواب دیتا ہے کہ اگر تو نے پانی پر پیالہ کے گھومنے کی خوبی، وصف اور حسن کو دیکھا ہوتا تو تجھے اس صفتِ عام کی پروا نہ ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی کے معشوق میں گوہ اور پلیدی بھی شامل ہوتی ہے۔ عاشق اس بات کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا کہ میرے معشوق میں گندگی اور پلیدی بھی ہے۔ اور یہ کہ میرا معشوق اور پلیدی دونوں کی جسامت ہے، دونوں مکانی ہیں، شش جہت کے اندر ہیں، حادث ہیں اور خالی

ہیں۔ اس کے نزدیک کچھ معنی نہیں رکھتے۔

من الاوصاف العامه. — عام اوصاف میں سے۔

یہ اس میں ہر گز نہیں سماتا اور جو شخص اسے یہ صفتِ عام یاد دلاتا ہے، اسے وہ دشمن سمجھتا ہے اور اپنا ابلیس خیال کرتا ہے۔ پس جب تجھ میں یہ گنجائش ہے کہ تو اس جہت عام میں نظر کرتا ہے تو میرے حسنِ خاص کے نظارہ کا تُو اہل نہیں ہے۔ اسے مناظرہ کرنا مناسب نہیں، اس لیے کہ ہمارے مناظرہ میں حسن ملا ہوا ہے اور حسن کا اظہار اس پر کرنا جو اس کا اہل نہ ہو ظلم ہوتا ہے۔

لا تعطوا الحکمة غیر اهلها فتظلموها — حکمت نااہل لوگوں کو نہ دو ورنہ حکمت پر ظلم کرو گے نہ اس کے لائق لوگوں سے حکمت کو
ولا تمنعوها عن اهلها فتظلموها. — روکو ورنہ حکمت پر ظلم کرو گے۔

یہ علم نظر ہے، علم مناظرہ نہیں ہے۔ خزاں سے پھول شگفتہ نہیں ہوتے اور پھل نہیں پکتے کیونکہ یہ مناظرہ ہوتا ہے۔ یعنی مخالفت خزاں سے مقابلہ اور مقاومت کرتی ہے اور پھول کی یہ فطرت نہیں کہ وہ خزاں کا مقابلہ کرے۔ اگر آفتاب کی نظر عمل کرے تو پھول معتدل ہوا میں باہر آجاتا ہے ورنہ وہ کنارہ کش رہتا ہے اور اپنے اصل کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ خزاں اس سے کہتی ہے اگر تو خشک شاخ نہیں تو میرے سامنے باہر آ۔ اگر وہ مرد ہو تو کہتا ہے تیرے سامنے میں ایک خشک شاخ ہوں۔ میں نامرد ہوں۔ تو جو چاہے کہہ۔

ترجمہ شعر: اے صادقوں کے بادشاہ! کیا تُو نے مجھ جیسا منافق دیکھا ہے؟ تیرے زندوں کے ساتھ میں زندہ ہوں۔ تیرے مردوں کے ساتھ میں مردہ ہوں۔[۱]

---

[۱] مولانا کی غزل کا ایک شعر ہے۔

اے عاشقاں اے عاشقاں پیمانہ گم کردہ ام — آں مے کہ در پیمانہ ہا اند نگجد خوردہ ام

تو جو بہاء الدین ہے، ایک کم رُو بوڑھی عورت جس کے منہ میں دانت نہ ہوں
جس کا چہرہ سوسمار کی پیٹھ کی طرح ہو، جھریوں پر جھریاں پڑی ہوں۔ اگر تجھ سے کہے کہ
اگر تو جوان ہے اور مرد ہے تو اپنی مردمی دکھا۔ یہ گھوڑا ہے، یہ معشوق ہے اور یہ میدان۔ تو
یہی کہے گا کہ معاذ اللہ میں مرد نہیں ہوں۔ اگر لوگوں نے مجھے نوجوان اور مرد مشہور کر
رکھا ہے تو یہ جھوٹ ہے۔ اگر تم ہمارا جوڑا ہو تو اس سے نامردی بہتر ہے۔ ایک بچھو ڈنگ
اٹھائے ہوئے یہ کہتا ہوا تیرے عضو پر سے گزرتا ہے کہ میں نے سنا ہے تو مرد ہے۔ بڑا
ہنس مکھ ہے۔ ذرا ہنس کہ میں بھی تیری ہنسی دیکھوں۔ تو اس کے جواب میں یہی کہے گا کہ
تمہارے آنے کے بعد ہمیں کوئی ہنسی نہیں آسکتی اور نہ کوئی خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔
لوگوں نے جو کچھ بھی کہا ہے، جھوٹ کہا ہے۔ میری ہنسی اس بات پر موقوف ہے کہ تم
یہاں سے چلے جاؤ، دور ہو جاؤ۔ کہا تو نے آہ کی، اور میرا ذوق جاتا رہا۔ آہ نہ کرتا کہ ذوق نہ
جائے۔ فرمایا کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر آہ نہ کرو تو ذوق چلا جاتا ہے۔ یہ مختلف موقعے
ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یوں نہ فرمایا جاتا کہ حضرت ابراہیمؑ بڑے آہ کرنے والے اور
حلیم تھے۔ اپنی کسی طاعت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ یہ بھی ذوق کا اظہار ہے۔ اور یہ
بات بھی جو تو کہتا ہے، اس لیے کہتا ہے کہ ذوق آئے۔ اس کی یہ مثال ہے کہ سوئے
ہوئے آدمی کو آواز دیتے ہیں کہ اٹھ بیٹھ، دن چڑھ آیا، قافلہ روانہ ہو رہا ہے۔ کہتے ہیں،
اسے آواز نہ دو کہ وہ ذوق میں ہے۔ اس کا ذوق جاتا رہے گا۔ کہتا ہے وہ ذوق ہلاکت ہے، اور
یہ ذوق ہلاکت سے مخلصی ہے۔ کہتے ہیں اسے فکر میں نہ ڈال۔ کیونکہ یہ آواز فکر کے مانع
ہے۔ کہتا ہے اس آواز سے سونے والے کو فکر ہوتا ہے، ورنہ اسے نیند کی حالت میں کیا فکر
ہے۔ ہاں جب نیند سے بیدار ہو گا تو فکر کرے گا۔ آواز دو قسم کی ہوتی ہے۔ اگر آواز دینے
والا اس سے علم میں بلند ہے، تو یہ آواز زیادتیٔ فکر کا باعث ہو گی۔ اس لیے کہ اسے تنبیہ

کرنے والا صاحبِ علم ہے اور بیدار ہے۔ تو خدا جب اسے خوابِ غفلت سے آگاہ کرتا ہے، اسے اپنے عالم سے آگاہ کرتا ہے اور اسے اس جگہ کھینچتا ہے، تو اس کا فکر بلند ہوتا ہے۔ بات یہ تھی کہ اس نے بلندی پر سے آواز دی تھی۔ لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو، یعنی بیدار کرنے والا عقل میں اس سے نیچے ہو تو جب وہ اسے بیدار کرتا ہے، بیدار ہونے والے کی نظر نیچے پڑتی ہے۔ چونکہ اس کا بیدار کنندہ اسفل ہے، اس کی نظر بھی اسفل ہی پڑتی ہے، اور اس کا فکر عالمِ سفلی کی راہ لیتا ہے۔

بے حرف و صوت گفتگو

یہ لوگ جنہوں نے علم حاصل کیا اور کر رہے ہیں، خیال کرتے ہیں کہ اگر وہ یہاں حاضر ہوں تو علم کو بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جب وہ یہاں آتے ہیں تو ان کے علم میں جان پڑ جاتی ہے۔ سب علم نقش ہیں۔ جب ان میں جان آتی ہے تو یوں ہوتا ہے گویا قالب بے جان میں جان آگئی۔ ان سب علوم کی اصل وہیں سے ہے۔ عالمِ بے حرف و صوت سے اس نے انہیں عالمِ حرف و صوت میں منتقل کیا ہے۔ اس عالم میں گفتگو بے حرف و صوت ہے کہ

کلم اللہ موسیٰ تکلیما۔ (نساء :ع ۲۳)   اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے کلام کیا۔

خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بات کی۔ بات آخر حرف اور صوت میں نہیں کی، اور منہ اور زبان سے نہیں کی۔ اس لیے کہ حرف کے لیے منہ اور ہونٹ چاہئیں تاکہ حرف ظاہر ہو۔ خدا کی برتری اور تقدس، ہونٹ اور کام و دہن سے منزہ ہے۔ پس خدا سے انبیاء کی گفت و شنید عالمِ بے حرف و صوت میں ہوتی ہے کیونکہ ان

جزوی عقول کے وہم اس تک نہیں پہنچتے، اور اس راستہ میں نہیں لے جاتے۔ لیکن انبیاء عالمِ بے حرف سے عالمِ حرف میں آجاتے ہیں۔ اور طفل بن جاتے ہیں، ان اطفال کیلئے کہ
بُعثت معلماً. میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اب اگرچہ یہ جماعت جو حرف و صوت میں رہی ہے، اس کے احوال تک نہیں پہنچتی لیکن اس سے طاقت حاصل کرتی ہے اور نشوونما پاتی ہے اور اس سے آرام پاتی ہے۔ یہ اسی طرح ہے کہ بچہ ماں کو تفصیل کے ساتھ نہ جانتا ہے، نہ پہچانتا ہے لیکن اس سے آرام پاتا ہے اور طاقت حاصل کرتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے پھل شاخ پر آرام کرتا ہے اور شیریں ہو جاتا ہے اور پک جاتا ہے، اور درخت کی اسے خبر نہیں ہوتی۔ یہی مثال اس بزرگ اور اس کے حرف و صوت کی ہے کہ اگرچہ وہ اسے نہیں جانتے اور اس تک نہیں پہنچتے لیکن وہ اس سے طاقت حاصل کرتے ہیں اور پرورش پاتے ہیں۔ ان جملہ نفوس میں ایک ایسی بات ہے جو عقل، حرف اور صوت سے ماورا ہے، اور یہ ایک عالم عظیم ہے۔ تو نے نہیں دیکھا کہ تمام خلقت دیوانوں کی طرح ان کی طرف مائل ہوتی ہے اور ان کی زیارت کو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ وہی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ ایسی ہی بات ہے لیکن اس کا محل انہوں نے غلط سمجھا ہے۔ وہ بات عقل میں نہیں سماتی لیکن یہ نہیں کہ ہر وہ چیز جو عقل میں نہ سمائے، وہ وہی ہے۔

کُل جوز مدور ولیس کل مدور جوز. ہر اخروٹ گول ہوتا ہے لیکن ہر گول چیز اخروٹ نہیں ہوتی۔

اس کی نشانی یہ ہوتی ہے جو ہم نے کہا کہ اگرچہ اس کی ایک حالت ہوتی ہے جو گفتگو اور ضبط میں نہیں لیکن اس سے عقل اور جان قوت پاتی ہے اور ان کی پرورش ہوتی ہے۔

اچھی لگنے والی چیز کی حقیقت

جن دیوانوں کے گرد خلقت گھومتی ہے، ان میں یہ نہیں ہے اور دیوانے اپنے حال سے واپس نہیں لوٹتے اور اس سے آرام نہیں پاتے اور اگرچہ وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے آرام پالیا ہے، ہم اسے آرام نہیں کہتے۔ یہ ایسا ہے کہ ایک بچہ اپنی ماں سے الگ ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحہ اسے چین آگیا۔ ہم اسے چین نہیں کہتے، اس لیے کہ یہ غلط بات ہے۔ طبیب کہتے ہیں کہ جو چیز مزاج کو اچھی لگے وہ مٹھی بھر ہی انسان کو طاقت دیتی ہے اور اس کے خون کو صاف کرتی ہے لیکن اس وقت پسند آئے جب بیماری نہ ہو۔ اگر مٹی کھانے والے کو مٹی پسند آجائے تو ہم اسے یہ نہیں کہیں گے کہ مصلح مزاج ہے اگرچہ وہ اسے اچھی لگتی ہے۔ اسی طرح صفرائی طبیعت کو ترشی اچھی لگتی ہے اور شکر اچھی نہیں لگتی۔ اس "اچھا لگنے" کا اعتبار نہیں۔ اس لیے کہ اس کی بنیاد بیماری پر ہے۔ اچھا لگنا یہ ہے کہ بیماری سے پہلے وہ چیز اچھی لگے۔ مثلاً لوگوں نے کسی کا ہاتھ کاٹ دیا ہے اور توڑ دیا ہے اور وہ ٹیڑھا ہو کر لٹک رہا ہے۔ جراح اسے ٹھیک کرتا ہے اور پہلی حالت پر بٹھا دیتا ہے۔ اسے وہ اچھا نہیں لگتا اور درد کرتا ہے۔ اسے وہ ٹیڑھا پن ہی اچھا لگتا ہے۔ جراح کہتا ہے۔ تجھے پہلے یہ اچھا لگتا تھا کہ تیرا ہاتھ تو سیدھا ہے اور تجھے اس سے آرام تھا۔ جب انہوں نے اسے ٹیڑھا کر دیا تو اس سے تو متالم ہوا اور تجھے دکھ ہوا۔ اس گھڑی اگر تجھے وہ ٹیڑھا پن اچھا لگتا ہے تو یہ اچھا لگنا جھوٹی بات ہے۔ اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے کہ عالمِ قدس میں ارواح کو ملائکہ کی طرح استغراق اور ذکرِ حق بہت اچھا لگتا تھا۔ اجسام کے واسطہ سے یہ دکھی اور بیمار ہو گئے اور مٹی کھانا انہیں اچھا لگنے لگا۔ نبی اور ولی جو طبیب ہیں کہتے ہیں۔ یہ تجھے اچھا نہیں لگتا۔ تجھے اس کا اچھا لگنا جھوٹی بات ہے۔ تجھے دراصل کوئی اور چیز اچھی لگتی

ہے۔ اسے تو نے بھلا دیا ہے۔ تیرے اصلی مزاج کو صحیح طور پر وہ چیز اچھی لگتی ہے جو تجھے سب سے پہلے اچھی لگتی تھی جو چیز اب اچھی لگ رہی ہے وہ بیماری ہے۔ تو سمجھتا ہے کہ تجھے یہ اچھی لگتی ہے اور تو اب اس بات کا یقین نہیں کرتا۔

اصلاح کا اچھا طریقہ

ایک عارف ایک نحوی کے پاس بیٹھا تھا۔ نحوی نے کہا سخن ان تین سے باہر نہیں۔ یا اسم ہوتا ہے یا فعل یا حرف۔ عارف نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے کہ افسوس میری بیس سال عمر اور میری جستجو اور کوشش ضائع ہو گئی۔ کیونکہ میں اس کی امید پر مجاہدہ کرتا رہا ہوں، جو اس سخن سے باہر ہے۔ تو نے میری امید کھو دی۔ ہر چند کہ عارف اس سخن اور مقصود کو پہنچا ہوا تھا، اس طریق پر اس نے نحوی کو تنبیہ کر دی۔

کہتے ہیں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ نے طفلی کے عالم میں دیکھا کہ ایک شخص غلط اور غیر شرعی طریق پر وضو کر رہا ہے۔ انہوں نے چاہا کہ اسے بطریقِ احسن وضو کرنے کی تعلیم دیں۔ چنانچہ وہ اس کے پاس آئے۔ ان میں سے ایک نے اس شخص سے مخاطب ہو کر کہا، یہ میرا ساتھی مجھے کہتا ہے، تو غلط طریق پر وضو کرتا ہے۔ ہم دونوں آپ کے سامنے وضو کرتے ہیں۔ تو دیکھ کہ ہم میں سے کس کا وضو شرع کے مطابق ہے۔ دونوں نے اس کے سامنے وضو کیا۔ وہ شخص بولا۔ بیٹو! تمہارا وضو بالکل شرع کے مطابق اور درست ہے۔ میرا وضو نہ ہونے کے برابر اور غلط ہوا ہے۔

خیال مہمان کی طرح ہے

جتنے مہمان زیادہ ہوں اتنا ہی گھر کو بڑے سے بڑا بناتے ہیں اور اتنی ہی اس کی

آرائش زیادہ ہوتی ہے اور کھانا زیادہ تیار کرتے ہیں۔ کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ جب بچے کا قد چھوٹا ہوتا ہے تو اس کا خیال بھی چھوٹا ہی ہوتا ہے، یعنی خیال مہمان ہے اور جسم گھر ہے۔ جیسا مہمان ویسا گھر۔ چھوٹے بچے کا خیال بھی اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ وہ دودھ اور دایہ کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا۔ اور جب وہ بڑا ہوتا ہے تو اس کے مہمان یعنی خیالات بھی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ عقل، ادراک اور تمیز وغیرہ سے گھر بڑا ہو جاتا ہے، اور جب عشق کے مہمان آتے ہیں تو وہ گھر میں سماتے نہیں اور گھر کو اجاڑ دیتے ہیں، اور وہ نئی عمارت بناتے ہیں۔ بادشاہ کے پردے اس کا سازوسامان اور نوکر چاکر، لشکر اور حشم اس کے گھر میں نہیں سماتے اور وہ پردے اس دروازہ کے لائق نہیں ہوتے۔ اتنے بڑے، بے حد حشم کے لیے مقام بھی بے حد بڑا چاہیے اور جب ان پردوں کو لٹکاتے ہیں تو وہ سب روشنی دیتے ہیں۔ حجاب اٹھ جاتے ہیں اور ہر چھپی ہوئی چیز ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس دنیا کے پردے ان پردوں کے برعکس ہیں۔ یہاں پردے حجاب کو بڑھاتے ہیں۔

ترجمہ شعر : میں کچھ ایسے مصائب کا گلہ کر رہا ہوں جن کو میں معیّن نہیں کرتا، تاکہ لوگ ہمارے عذر اور ہماری ملامت دونوں سے بے خبر رہیں۔

ترجمہ شعر : اس کی مثال ایسی ہے جیسے شمع روتی ہے اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے آنسو کس وجہ سے ہیں۔ آگ سے ہمکناری کی وجہ سے یا شہد سے کنارہ کشی کی وجہ سے۔

فقر سے عشق

ایک شخص نے کہا کہ یہ قاضی ابو منصور ہروی کا کہا ہوا ہے۔ کہا، قاضی منصور پوشیدہ کہتا ہے اور لپیٹ کر کہتا ہے، اور بات واضح نہیں ہوتی لیکن منصور برداشت نہ کر سکا،

اس نے کھل کر اور ظاہر ہو کر کہا کہ سارا عالم قضا کا اسیر ہے اور قضا اسیر شاہد ہے۔ شاہد پیدا کرتا ہے اور وہ چھپاتا نہیں۔

کہا قاضی کے سخن میں سے ایک صفحہ پڑھ۔ اس نے پڑھا۔ اس کے بعد فرمایا کہ خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جو کسی عورت کو چادر اوڑھے دیکھتے ہیں تو حکم دیتے ہیں کہ نقاب اتار تاکہ ہم تیرا چہرہ دیکھیں کہ تُو کون شخص اور کیا بات ہے۔ کیونکہ جب تو چھپ کر گزرتی ہے اور تجھے ہم نہیں دیکھتے، تو ہمیں تشویش ہوتی ہے کہ یہ کیا تھا، اور کون شخص تھا۔ ہم وہ نہیں ہیں کہ اگر تیرا چہرہ دیکھ لیں تو تجھ پر عاشق ہو جائیں اور تجھ سے وابستہ ہو جائیں۔ ہماری عبادت گاہ خدا ہے جس نے ہمیں تجھ سے پاک اور فارغ کیا ہوا ہے۔ اس سے ہم محفوظ ہیں کہ اگر تجھے دیکھ لیں تو ہمیں تشویش اور عشق ہو جائے۔ البتہ اگر نہ دیکھیں تو ہمیں تشویش ہو گی کہ کون شخص تھا۔ اس کے برعکس اہلِ نفس کا گروہ ہے۔ اگر یہ لوگ حسینوں کا چہرہ دیکھ لیں تو عاشق ہو جاتے ہیں اور تشویش میں پڑ جاتے ہیں۔ پس ان کے حق میں یہ بہتر ہے کہ ان کے سامنے چہرہ نہ کھولو تاکہ انہیں عشق نہ ہونے پائے اور اہلِ دل کے حق میں یہ بہتر ہے کہ چہرہ کو کھول دیں، تاکہ فتنہ سے رہائی پائیں۔ ایک شخص نے کہا خوارزم میں کوئی عاشق نہیں ہوتا، اس لیے کہ خوارزم میں حسین بہت ہیں۔ جب وہ ایک حسین کو دیکھتے ہیں اور اس سے دل لگاتے ہیں تو اس کے بعد اس سے بہتر حسین دیکھ پاتے ہیں۔ اس سے پہلا حسین دل سے اتر جاتا ہے۔ فرمایا اگر خوارزم کے حسینوں پر کوئی عاشق نہیں ہوتا تو خوارزم پر عاشق ہونا چاہیے کیونکہ اس میں حسین بے حد ہیں۔ تُو خواہ کسی کے سامنے بھی جھکے اور اس سے سکون پائے، ایک دوسرا حسین سامنے آجاتا ہے، جس سے تُو پہلے کو فراموش کر دیتا ہے۔ پس ہم فقر کے نفس پر عاشق ہوئے کیونکہ اس میں ایسے حسین ہیں۔

رؤیت فی الوجود[۱]

سیف الدین عثاری کسی شہر میں گیا، جہاں ہر شخص آئینہ سے محبّت کرتا تھا اور آئینے کی صفائی اور فوائد کی وجہ سے اس پر عاشق تھا۔ آئینے سے محبّت کرنے والا اپنے چہرے کی حقیقت کو ہرگز نہیں پہچانتا۔ وہ اپنے چہرے کو چہرہ سمجھتا ہے۔ آئینہ پردہ ہے اور چہرہ آئینہ ہے۔ تُو اپنے چہرے کو کھول، تو مجھے اپنے چہرے کے لیے آئینہ پائے گا۔ پس ثابت ہو گیا کہ میں اس قول کا آئینہ ہوں، جو میرے نزدیک انبیاء اور اولیاء ظنِ باطل پر ہیں۔ وہاں محض دعوٰی ہی دعوٰی ہے۔ کہا گیا تُو دیکھ کر ایسا کہتا ہے تو تُو نے "رؤیت فی الوجود" کی حقیقت کو سمجھ لیا اور تیرے نزدیک یہ ایک بڑی چیز ہے۔ پس انبیاء سچّے ہیں کیونکہ انہوں نے "رؤیت" کا دعوٰی کیا اور تو نے بھی اس کا اقرار کر لیا۔

پھر "رؤیت" تمام اور مکمل نہیں ہوتی۔ جب تک کوئی مرئی چیز سامنے نہ ہو کیونکہ رؤیت متعدی افعال میں سے ہے۔ رؤیت کے لیے مرئی چیز اور دیکھنے والے کا ہونا ضروری ہے۔ پس مرئی "مطلوب" اور رائی (دیکھنے والا) "طالب" ٹھہرا، یا اس کے برعکس۔ پس اگر تُو اور مطلوب کا انکار کر دے تو ثابت ہو جائے گا کہ تُو "رؤیت فی الوجود" کا بھی منکر ہے۔ اس لیے "الوہیت" اور "معبودیت" نفی وجود دو جملے ہوں گے۔ اس لیے یقیناً وہ واجب الثبوت ہے۔

کہا گیا ہے کہ لوگوں کی یہ جماعت اس نادان اور غافل کی مرید ہے اور یہ لوگ اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ میں نے کہا یہ شیخ مغفل، پتھر اور بت سے کم نہیں ہے۔ ان دونوں کی عبادت میں تعظیم و تفخیم، شوق، سوال، حاجات اور گریہ موجود ہیں اور پتھر کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں۔ نہ کوئی خبر اور نہ حِس ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے

[۱] لفظی ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ بڑی کوشش اور علماء سے مشورہ کے بعد بھی مطلب واضح نہ ہو سکا۔

ان کی صداقت کا سبب بنایا ہے۔

ایک فقیہ کسی لڑکے کو پیٹ رہا تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا تو اسے کیوں مارتا ہے؟ اس کا کیا گناہ ہے؟ اس نے جواب دیا۔ کیا تم یہ نہیں پہچانتے کہ یہ ولدالزنا ہے، بدکار ہے۔ لوگوں نے پوچھا یہ کس وقت ایسا عمل کرتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ انزال کے وقت بھاگتا ہے۔ یعنی خراشیدگی کے وقت اس کا خیال بھاگتا ہے (پراگندہ ہوجاتا ہے) اس لیے انزال باطل ہوجاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا عشق اس کے خیال کا مانع ہوتا ہے اور اس لڑکے کو اس کی خبر ہے۔ پس اسی طرح ان لوگوں کا عشق اس بطال شیخ کے خیال کی معیت میں ہے، اور وہ ان کے ہجر و وصال اور حال سے غافل ہے۔ اگرچہ عشق خطا اور غلط خیال سے وجد کا موجب ہے۔ لیکن حقیقی خبیر و بصیر معشوق کے عشق میں عاشق کی ایسی حالت نہیں ہوتی۔ اس شخص کی طرح جو رات کی تاریکی میں ایک ستون کو یہ سمجھ کر کہ وہ معشوق ہے، معانقہ کرکے روتا ہے اور گریہ وزاری کرتا ہے۔ مگر اسے وہ لذت حاصل نہیں ہوتی، جو اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو اپنے لطیف اور خبیر دوست سے معانقہ کرکے حاصل کرتا ہے۔

تقدیر کے سامنے ناکامیٔ تدبیر

کوئی شخص جب کسی جگہ کا عزم کرتا ہے اور سفر پر روانہ ہوتا ہے تو اس کے دل میں معقول خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب میں وہاں جاؤں گا تو بہت سی نیک صلاحیں اور کام میسر آجائیں گے، اور میرے حالات میں ایک نظام پیدا ہوجائیگا۔ دوست خوش ہوجائیں گے اور میں دشمنوں پر غالب آجاؤں گا۔ اس کا دلی ارادہ یہ ہوتا ہے اور مقصود حق کچھ اور

ہوتا ہے۔ وہ جتنے دلی ارادے باندھتا ہے اور جتنے خیالات دل میں لاتا ہے، اس کی مراد کے مطابق ان میں سے ایک بھی اسے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود وہ اپنی تدبیر اور اپنی طاقت پر اعتماد کرتا ہے۔

ترجمہ شعر: بندہ تدبیر کرتا ہے۔ وہ تقدیر کو نہیں جانتا۔ خدا کی تقدیر کے سامنے تدبیر نہیں ٹھہرتی۔

اس کی مثال یوں ہے کہ کوئی شخص خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ کسی اجنبی شہر میں جا پڑا ہے اور وہاں اس کا کوئی آشنا نہیں۔ نہ اسے کوئی پہچانتا ہے اور نہ وہ کسی کو پہچانتا ہے۔ وہ سرگرداں پھرتا ہے۔ یہ شخص پشیمان ہوتا ہے۔ اسے غصہ اور افسوس آتا ہے کہ میں اس شہر میں کیوں آیا۔ یہاں نہ کوئی میرا آشنا ہے اور نہ دوست۔ وہ ہاتھ ملتا ہے اور ہونٹ چباتا ہے۔ جب بیدار ہوتا ہے تو وہ نہ اس شہر کو دیکھتا ہے اور نہ آدمیوں کو۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا غصہ کھانا اور تاسف اور افسوس کرنا بے فائدہ تھا۔ اپنی اس حالت پر وہ پشیمان ہوتا ہے اور اسے ضائع شدہ خیال کرتا ہے۔ پھر دوسری مرتبہ جب وہ سوتا ہے تو خواب میں اپنے آپ کو اتفاقاً پھر اسی شہر میں دیکھتا ہے اور وہ غصہ اور غم کھانا اور افسوس کرنا شروع کر دیتا ہے اور ایسے شہر میں آنے پر پشیمان ہوتا ہے۔ اسے کچھ خیال نہیں آتا اور یاد نہیں رہتا کہ میں یہ غم کھانے سے بیداری میں پشیمان ہو چکا ہوں اور میں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ ضائع ہو گیا اور وہ محض ایک خواب تھا اور بے فائدہ تھا۔ اب پھر اسی طرح ہے۔

خلقت نے سو ہزار مرتبہ دیکھا ہے کہ ان کے عزائم اور تدابیر باطل ہوئیں اور ان کی وجہ سے ان کی کوئی مراد بر نہیں آئی۔ البتہ خداوند تعالیٰ ان پر نسیان طاری کر دیتا ہے اور وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں اور اپنے خیال اور اختیار کے تابع ہو جاتے ہیں۔ انّ اللہ یحول بین المرء وقلبہ. اللہ تعالیٰ انسان اور اس کے قلب کے درمیان میں حائل رہتا ہے۔

ابراہیم ادھمؒ اپنی بادشاہی کے زمانہ میں شکار کو گیا ہوا تھا[1] ایک ہرن کے پیچھے اس نے گھوڑا دوڑایا، یہاں تک کہ وہ لشکر سے بالکل جدا ہو گیا اور دور نکل گیا۔ اس کا گھوڑا خستگی سے پسینہ میں غرق ہو رہا تھا۔ وہ اسے برابر دوڑاتا اور آہو کا تعاقب کرتا رہا۔ اس بیابان میں جب وہ حد سے گذر گیا تو ہرن بولنے لگا۔ اس نے پیچھے کو منہ موڑ کر کہا۔ ما خلقت لھٰذا۔ تجھے اس لیے نہیں پیدا کیا گیا، تجھے انہوں نے اس لیے پیدا نہیں کیا اور عدم سے تجھے عالمِ وجود میں اس لیے نہیں لائے کہ تو مجھے شکار کرتا پھرے۔ اگر تو مجھے شکار کیا ہوا سمجھ لے تو کیا ہو جائے گا۔ ابراہیم ادھم نے جب یہ سنا تو ایک نعرہ مارا اور اپنے آپ کو گھوڑے پر سے گرا دیا۔ اس صحرا میں ایک گڈریا کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس کی خوشامد کی اور اس سے کہا تو میرا جواہرات سے مرصّع شاہانہ لباس اور گھوڑا مجھ سے لے لے اور اپنا نمدہ مجھے دے دے۔ یہ بات کسی کو نہ بتانا اور میری حالت کا کسی کو پتہ نہ دینا۔ اس نے وہ نمدہ پہن لیا اور راہ لی۔

اب دیکھو کہ ابراہیم بن ادھمؒ کی غرض کیا تھی اور خدا کا مقصود کیا تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ آہو کو شکار کرے اور خداوند تعالیٰ نے آہو کے ذریعے اسے شکار کر لیا۔ اس سے تو سمجھ لے کہ دنیا میں وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے اور مراد اس کی ملکیت ہے اور مقصود اس کے تابع ہے۔

اسلام لانے سے پہلے حضرت عمرؓ اپنی ہمشیرہ کے گھر آئے۔ آپ کی ہمشیرہ بلند آواز سے قرآن پڑھ رہی تھیں ما انزلنا...... (ہم نے نہیں اتارا...... الخ) جونہی بھائی کو دیکھا قرآن کو چھپا دیا اور خاموش ہو گئیں۔ عمر نے تلوار نیام سے نکال لی اور کہا۔ جلد بتا تو

---

[1] روزے پسر ادھم اندر پے آہو   مانند فلک مرکب شبدیز براندند
درویش یکے شربت کز لذت درویش   مستیش بسر برشد و از اسب درافتد
گفتند ہمہ کس بسر کوئے تحیر   مسکین پسر ادھم تاج و کمر افتد

کیا پڑھ رہی تھی؟ اور اسے چھپا کیوں دیا؟ بتا ورنہ میں تلوار سے ابھی تیری گردن کاٹتا ہوں۔ تجھے کوئی امان نہیں ملے گی۔ ان کی ہمشیرہ بہت ڈریں۔ وہ ان کے غصّہ اور ہیبت کو جانتی تھیں۔ جان کے ڈر سے انہوں نے اقرار کرلیا اور بولیں "میں اس کلام میں سے پڑھ رہی تھی جو خداوند تعالیٰ نے حضرت محمدؐ پر نازل فرمایا"۔ عمر بولے "پڑھ تاکہ میں بھی سنوں"۔ انہوں نے سورہ طٰہٰ کی تلاوت کی۔ عمر سخت برہم ہوئے۔ ان کا غیض سو گنا ہوگیا۔ بولے "اب اگر میں تجھے اسی گھڑی قتل کروں تو یہ قتل اچھا نہ ہوگا۔ میں جاتا ہوں اور پہلے اس (حضور سرورِ کائنات) کا سر قلم کرتا ہوں۔ اس کے بعد تیرا کام تمام کردوں گا"۔ عمر اسی طرح انتہائی غصّے کی حالت میں شمشیر برہنہ ہاتھ میں لے کر مسجدِ نبوی کی طرف لپکے۔ راستہ میں قریش سرداروں نے انہیں دیکھا تو بولے "بہت خوب عمر (حضرت) محمدؐ کے قتل کو نکلا ہے۔ بیشک اگر یہ کام سرانجام ہوگا تو اسی سے ہوگا"۔ اس لیے کہ عمر قوت اور مردانگی میں بہت بڑی شخصیت تھے۔ جس لشکر کی طرف وہ رخ کرتے، غالب آتے، اور ان کے سر کاٹ کر نشانی کے طور پر لاتے۔ اس حد تک کہ مصطفیٰؐ ہمیشہ فرمایا کرتے کہ اے خدا میرے دین کو عمر کے ذریعے مدد دے یا ابو جہل کے ذریعے۔ اس لیے کہ آپ کے زمانہ میں قوت اور مردانگی کے لیے یہ دونوں مشہور تھے۔ آخر جب عمر مسلمان ہوگئے تو وہ ہمیشہ یہ کہہ کر روتے۔ "یا رسول اللہ مجھے کتنا افسوس ہوتا، اگر ابو جہل کو حضورؐ مجھ پر مقدم رکھتے اور فرمادیتے کہ اے خدا میرے دین کو ابو جہل کے ذریعے مدد دے، یا عمر کے ذریعے سے۔ میرا کیا حال ہوتا۔ میں گمراہی میں رہتا۔"

حاصل کلام یہ کہ عمر شمشیر برہنہ ہاتھ میں لیے رسول اللہؐ کی مسجد کی طرف بڑھے۔ اس اثنا میں جبرائیلؑ مصطفیٰؐ کے پاس خدا کا پیغام لائے کہ یا رسول اللہ اب عمر آرہے ہیں تاکہ اسلام لے آئیں۔ انہیں گلے سے لگایئے۔ اتنے میں عمر مسجد میں آگئے۔

انہوں نے دیکھا کہ نور کا ایک تیر مصطفیٰؐ کے وجود سے پرّاں ہوا اور عمر کے دل میں جا پیوست ہوا۔ عمر نے ایک نعرہ مارا اور بیہوش ہو گئے۔ محبت اور عشق ان کی جان میں ظاہر ہو گئے۔ انہوں نے چاہا کہ وہ انتہائی عشق سے مصطفیٰؐ میں گداز ہو جائیں اور آپ میں محو ہو جائیں۔ بولے اے اللہ کے نبی! ایمان ظاہر فرمایئے اور وہ کلمۂ مبارک ارشاد کیجئے تاکہ میں سنوں۔ جب وہ مسلمان ہو گئے تو بولے "میں شمشیر برہنہ لے کر آپ کو قتل کرنے کے ارادہ سے آیا تھا۔ اب میں شکرانہ اور کفارہ کے طور پر یہ کروں گا کہ جس کسی کے متعلق میں سنوں گا کہ وہ آپ کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے اسے امان نہیں دوں گا، اور اسی تلوار سے اس کا سر تن سے جدا کر دوں گا۔ عمر مسجد سے باہر آئے۔ اتفاقاً ان کا باپ سامنے آگیا۔ باپ بولا "تو اپنے دین سے پھر گیا؟" عمر نے اسی وقت اس کا سر تن سے جدا کر دیا اور خون آلود تلوار ہاتھ میں لیے روانہ ہوئے۔ قریش سرداروں نے خون آلود تلوار دیکھی تو بولے "تو نے تو وعدہ کیا تھا کہ میں کاٹ کر سر لاؤں گا۔ سر کہاں ہے؟ عمر بولے "یہ ہے" سردار بولے "یہ سر تو یہیں کا ہے۔ یہ وہ سر نہیں ہے۔" عمر نے جواب دیا "نہیں۔ یہ وہ سر نہیں۔"

اب دیکھو کہ عمر کا کیا ارادہ تھا اور اس سے اللہ تعالیٰ کی مراد کیا تھی۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ تو سمجھ لے کہ سب کام جس طرح وہ چاہے، ہوتے ہیں۔

ترجمہ شعر: شمشیر بکف عمر رسول کو قتل کرنے آتا ہے۔ خدا کے دام میں پڑ جاتا ہے اور مقدر سے فیض یاب ہوتا ہے۔

کعبہ سے کیا مراد ہے؟

اب اگر تمہیں بھی کہیں کہ تم کیا لائے ہو؟ تو تم کہو گے ہم سر لائے ہیں اور اگر

وہ یہ کہیں کہ ہم نے یہ سر دیکھا تھا۔ تم کہو گے یہ وہ سر نہیں ہے۔ یہ ایک دوسرا سر ہے۔ سر وہ ہے جس میں ایک سِرّ ہو۔ ورنہ ہزار سر ایک پیسہ میں سستے ہیں۔ اس آیت کو پڑھو۔ واذ جعلنا البیت مثابة للناس وامناً واتخذوا من مقام ابراهیم مصلی (سورۂ بقرہ: ع ۱۵) جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے جمع ہونے اور امن کی جگہ ٹھہرایا اور حکم دیا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا۔ اے خدا! جب تو نے اپنی رضا کے خلعت سے مجھے مشرف کیا ہے اور مجھے بزرگی دی ہے تو میری نسل کو بھی یہ بزرگی عطا فرما۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا۔ لاینال عهدی الظالمین (سورہ بقر: ع ۱۵) میرا اقرار ظالموں کے لیے نہیں۔ جو ظالم ہوں وہ میرے خلعت اور بزرگی کے قابل نہیں ہیں۔ جب حضرت ابراہیم نے سمجھ لیا کہ ظالموں اور باغیوں پر خداوند تعالیٰ کی عنایت نہیں ہے تو اس نے پابندی لگائی اور کہا خداوندا! وہ جو ایمان لائے اور ظالم نہیں ہیں۔ انھیں اپنے رزق سے خوش نصیبی عطا فرما اور ان سے دریغ نہ کر۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ رزق عام ہے۔ سب کو اس میں سے نصیب ہوتا ہے اور اس مہمان خانہ سے تمام خلائق منتفع اور بہرہ مند ہوتی ہے۔ البتہ رضا و قبولیت اور بزرگی چنے ہوئے خاص لوگوں کے لیے ہے۔ اہلِ ظاہر کہتے ہیں کہ اس سے مراد خانہ کعبہ ہے کہ جو شخص اس میں بھاگ آئے وہ آفات سے امان پاتا ہے اور اس جگہ شکار کرنا حرام ہے اور وہاں کسی کو دکھ دینا جائز نہیں، اور وہ جگہ خدا کی چنی ہوئی ہے۔ یہ سچ ہے اور ٹھیک ہے۔ یہ ظاہر قرآن ہے۔ محقق کہتے ہیں کہ خانہ آدمی کے اندر ہے۔ یعنی خداوندا! باطن کو وساوس اور نفسانی مشاغل سے خالی کر دے۔ اسے سودا اور فاسد اور باطل خیالات سے پاک کر دے تاکہ اس میں کوئی خوف باقی نہ رہے اور امن پیدا ہو اور وہ کلی طور پر تیرا پیغام اترنے کی جگہ ہو۔ اس میں ابلیس اور وسوسوں کو راہ نہ ملے۔ اسی طرح خداوند تعالیٰ نے آسمان پر شہاب مقرر کر رکھے ہیں۔

تاکہ وہ راندے ہوئے شیاطین کو ملائکہ کے اسرار سننے سے روکیں، تاکہ ان کے اسرار سے کوئی واقف نہ ہو اور یہ آفت سے دور رہیں۔ خداوندا! تو اپنی عنایت کے پاسبان ہمارے باطن پر بھی مقرر فرما تاکہ وہ شیاطین کے وساوس نفس کے حیلوں اور حرص کو ہم سے دور رکھیں۔ یہ قول اہل باطن اور محققوں کا ہے۔ جو شخص بھی اپنی جگہ سے حرکت کرے قرآن اس کے لیے ایک ایسا کپڑا ہے جو دونوں طرف سے مخمل ہے۔ بعض لوگ اس جہت سے بہرہ اندوز ہوجاتے ہیں اور بعض اس جہت سے۔ اور دونوں ہی درست ہیں اور جب خداوند تعالیٰ چاہتا ہے کہ دونوں قومیں اس سے مستفیض ہوں تو وہ مستفید ہوجاتی ہیں۔ اس کی مثال ایسی عورت کی ہے جس کا خاوند بھی ہو اور ایک شیر خوار بچہ بھی۔ دونوں کو اس سے جدا جدا لطف آتا ہے۔ بچے کو اس کے پستان اور دودھ میں مزا آتا ہے اور شوہر کو اس سے جماع میں لذت آتی ہے۔ خلقت گویا چلنے والے بچے ہیں۔ قرآن سے ظاہرا لذت پاتے اور دودھ پیتے ہیں۔ باقی رہے وہ جو کمال یافتہ ہیں، انہیں قرآن کے معانی میں ایک دوسرا ہی لطف آتا ہے، اور یہ کچھ اور ہی سمجھتے ہیں۔ کعبہ کے نواح میں مقام و مصلائے ابراہیم ایک جگہ ہے۔ اہلِ ظاہر کہتے ہیں وہاں دو رکعت نماز ادا کرنی چاہیے۔ یہ اچھا ہے لیکن محققوں کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کی خاطر ابراہیمؑ کی طرح اپنے آپ کو آگ میں ڈال دے اور جدوجہد اور کوشش سے اپنے آپ کو خدا کی راہ میں اس مقام پر پہنچا دے، یا اس مقام کے قریب، جہاں اس نے اپنے آپ کو خدا پر فدا کیا۔ یعنی اس کے سامنے نفس کو کوئی خطرہ نہیں رہتا اور وہ اپنے آپ ہی سے نہیں لرزتا۔ مقام ابراہیم میں دو رکعت نماز اچھی ہے۔ لیکن ایسی نماز جس کا قیام اس دنیا میں ہو اور رکوع اس دنیا میں۔ کعبہ[1] سے مراد

---

[1] حق آں جاے کہ جانت دیدہ است   کہ مرا بر بیت خود بگزیدہ است
کعبہ ہر چندے کہ خانہ بر اوست   خلقتِ من نیز خانہ و سزاوست
تاکرد آں خانہ را دروے نرفت   واندر ایں خانہ بجز آں حی نرفت

انبیاء اور اولیاء کا دل ہے جو خدا کی وحی نازل ہونے کی جگہ ہے اور کعبہ اس کی فرع ہے۔ اگر دل نہ ہو تو کعبہ کس کام آتا ہے؟

انبیاء اور اولیاء نے کلی طور پر اپنا مقصد ترک کر دیا ہوتا ہے اور وہ خدا کے مقصد کے تابع ہوتے ہیں، تاکہ جو کچھ وہ فرمائے وہ کریں اور جس پر اس کی نظرِ عنایت نہ ہو خواہ وہ ان کے باپ اور ماں ہی کیوں نہ ہوں، اس سے بیزار ہو جاتے ہیں اور ان کی نظر میں وہ دشمن ہوتے ہیں۔

ترجمہ شعر: ہم نے تیرے ہاتھ میں اپنے دل کی عنان دے دی تاکہ جب تو کہے پک جا۔ میں کہوں جل گیا۔ [ا]

مثل اور مثال میں فرق

جو کچھ میں کہتا ہوں مثال ہے، مثل نہیں ہے۔ مثال اور چیز ہے اور مثل اور چیز ہے۔ خداوند تعالیٰ نے مثال کے طور پر اپنے نور کو مصباح (چراغ) سے تشبیہ دی ہے اور اولیاء کے وجود کو زجاجہ (شیشہ کی قندیل) سے۔ اس جہت سے یہ نور کی مثال ہے۔ نور تو کون و مکان میں نہیں سماتا، وہ زجاجہ اور مصباح میں کیا سمائے گا؟ خداوند تعالیٰ کے مشارقِ انوار دل میں کیسے سمائیں؟ وہاں جب تو اس کا طالب ہو تو اسے اپنے دل میں پاتا ہے۔ از رُوئے ظرفیت نہیں کہ وہ نور وہاں ہے، بلکہ وہ تجھے وہاں ملتا ہے۔ اسی طرح جیسے تو اپنا نقش آئینے میں پاتا ہے اور اس کے باوجود تیرا نقش آئینے میں نہیں ہے۔ ہاں جب تو آئینے میں نظر کرتا ہے تو خود کو دیکھتا ہے۔ عقل میں نہ آنے والی چیزیں ظاہر ہوں تو

ا آناں کہ بسر در طلب کعبہ دویدند چوں عاقبۃ الامر بمقصود رسیدند
بندہ بروقف تو دل افروختہ است ہر کہ گوئی بپخت گوید سوختہ است

انہیں جب مثال دے کر بیان کیا جائے، وہ عقل میں آجاتی ہیں اور محسوس ہوتی ہیں۔ اسی طرح تو کہتا ہے کہ جب تو آنکھ جھپکتا ہے، عجیب و غریب چیزیں دیکھتا ہے اور محسوس صورتوں اور شکلوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور جب آنکھ کھولتا ہے تو کچھ نہیں دیکھتا۔ یہ کسی شخص کی عقل میں نہیں آتا اور کوئی یقین نہیں کرتا۔ مگر جب تو مثال سے بیان کرے تو معلوم ہو جاتا ہے اور یہ ایسے ہوتا ہے جیسے کوئی شخص خواب میں سو ہزار ایسی چیزیں دیکھتا ہے، بیداری میں جن میں سے ایک بھی ممکن نہیں ہے اور انجینئر کی طرح کہ وہ اپنے باطن میں گھر کا تصور باندھتا ہے اور اس کے عرض اور طول اور شکل کا۔ یہ کسی کی عقل میں نہیں آتا۔ لیکن تصور کی حالت سے نکل کر جب وہ اس گھر کا خاکہ کاغذ پر بناتا ہے تو وہ ظاہر ہو جاتا ہے، اور جب وہ اسے معیّن کرتا ہے اس کی کیفیت عقل میں آجاتی ہے اور اس کے بعد جب وہ پوری طرح عقل میں آجاتی ہے تو اس ترتیب سے مکان بن جاتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ عقل میں نہ آنے والی تمام باتیں مثال کے ذریعہ معقول اور محسوس بن جاتی ہیں۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ اس عالم میں نام پرواز کرتے ہیں۔ بعض دائیں ہاتھ کو اور بعض بائیں ہاتھ کو اور وہ ملائکہ، عرش، آگ اور جنت بن جاتے ہیں۔ اور میزان اور حساب و کتاب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جب تک مثال نہ دی جائے، ان میں سے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگرچہ یہ باتیں عالم مثل (اس دنیا) میں نہیں ہوتیں لیکن مثال سے وہ معین ہو جاتی ہیں اور اس کی مثال[۱] اس دنیا میں یہ ہے کہ رات کو تمام خلقت، موچی، بادشاہ،

---

[۱] صد ہزاراں نیک و بد را آں بہی   می کند ہر شب ز دلہا شاں تہی
روز دلہا را ازاں پُر می کند   آں صدفہا را پُر از دُر می کند
آں ہمہ اندیشۂ پیشانہا   می شناسد از ہدایت جانہا
پیشہ و فرہنگ تو آید بہ تو   تا در اسباب بکشاید بہ تو
پیشۂ زرگر بآہنگر نشد!   خوئے ایں خوش خو بداں منکر نشد
پیشہ ہا و خلقہا ہمچوں جہیز   سوئے خصم آیند روز رستخیز
(مثنوی مولانا روم)۔

قاضی، درزی وغیرہ سب سوتے ہیں۔ ان میں سے تمام خیالات اُڑ جاتے ہیں اور کسی کو کوئی خیال نہیں رہتا۔ جب سپیدۂ صبح صورِ اسرافیل کی طرح بروئے کار آتا ہے تو ان کے ذرات اجسام کو زندہ کردیتا ہے۔ ہر شخص کا خیال اڑتے ہوئے نامہ کی طرح اس کی طرف آتا ہے۔ اس میں کچھ غلطی نہیں ہوتی۔ درزی کا خیال درزی کی طرف، فقیہ کا خیال فقیہ کی طرف، لوہار کا خیال لوہار کی طرف، ظالم کا خیال ظالم کی طرف اور عادل کا خیال عادل کی طرف بھاگتا ہے۔ کیا یہ کبھی ہوا ہے کہ رات کو کوئی درزی سویا اور صبح کو وہ اٹھا تو وہ موچی تھا؟ نہیں۔ اس لیے کہ اس کا عمل اور شغل وہ تھا۔ اسی میں وہ پھر مشغول ہو جاتا ہے۔ تاکہ تو سمجھ لے کہ اس دنیا میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے اور یہ محال نہیں ہے اور اس دنیا میں واقع ہے۔ پس اگر کوئی شخص اس مثال کو سامنے رکھے اور کسی نتیجہ پر پہنچ جائے تو وہ اس عالم کے تمام حالات کا مشاہدہ اس دنیا میں کرلیتا ہے اور اس تک لے جاتا ہے اور اس پر منکشف ہو جاتا ہے تاکہ وہ جان لے کہ خدا کی قدرت میں سب کے لیے گنجائش ہے۔ قبر میں تُو بیشمار بوسیدہ ہڈیاں دیکھتا ہے۔ وہ راحت میں ہیں، وہ خوش ہیں اور سرمست سوئے ہوئے ہیں اور اس لذت اور مستی سے باخبر ہیں۔ آخر یہ کوئی لاف نہیں ہے جو کہہ دیتے ہیں "اس پر مٹی خوش ہو!" مٹی کو اگر خوشی کی خبر نہ ہوتی تو یہ کیوں کہتے۔

ترجمہ شعر: اس چاند جیسے معشوق کو سو سال بقا ہو۔ اس کے تیرِ غم کے لیے میرا دل ترکش بنا رہے!

ترجمہ شعر: اس کی خاکِ در پر میرا دل خوشی سے مرگیا۔ اے خدا کس نے دعا کی کہ اس کی مٹی خوش رہے۔

اور اس کی مثال عالم محسوسات میں حقیقت ہے۔ یہ ایسا ہے کہ دو آدمی[۱] ایک

---

[۱] رگ ہائے جسم ما مانندہ اند لیک ہر جانے برنجے زندہ اند
(بقیہ اگلے صفحے پر)

بستر میں سوئے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک آدمی خواب میں اپنے آپ کو بہترین حسینوں میں باغ اور بہشت کے درمیان دیکھتا ہے اور ایک اپنے آپ کو سانپوں، دوزخ کے شعلوں اور بچھوؤں کے درمیان دیکھتا ہے۔ اور اگر تُو تحقیق کرے، تو ان دو کے درمیان نہ اسے دیکھے گا اور نہ اسے۔ پس کیا تعجب ہے کہ بعض لوگوں کے اجزا قبر میں بھی راحت و مستی کے مزے لے رہے ہوں اور بعض عذاب، غم اور دکھ میں ہوں، اور کوئی نہ یہ دیکھتا ہو اور نہ وہ۔ پس معلوم ہوا کہ عقل میں آنے والی بات مثال کے ذریعہ عقل میں آجاتی ہے، اور مثال مثل سے نہیں رہتی۔ اسی طرح عارف نے کشادہ اور خوشی اور فراخی کا نام بہار رکھا ہے اور قبض اور غم کو وہ خزاں کہتا ہے۔ ازروئے صورت بہار سے خوشی اور خزاں سے غم۔ کیا بات ہوئی؟ ہاں یہ مثال ہے کہ اس کے بغیر عقل اس معنی کا تصور اور ادراک نہیں کر سکتی۔ اسی طرح خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ **وما یستوی الاعمٰی والبصیر ولا الظلمات ولا النور ولا الظل ولا الحرور** (سورۂ فاطر: رکوع ۳) نہ اندھا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں، نہ اندھیرا اور روشنی اور نہ سایہ اور آفتاب۔ ایمان کو نور سے نسبت دی اور کفر کو ظلمت سے۔ ایمان کو اچھے سایہ سے اور کفر کو آفتاب سے جس سے کہ امان نہیں، اور جو مغز تک کو ابال دیتا ہے۔ ان دو چیزوں میں سے کونسی چیز باقی رہتی ہے؟ اس جہان کے نور سے روشنی اور لطف یا اس جہان کی تاریکی سے زشت روئی اور کفر کی ظلمت؟

غفلت سے نہیں بلکہ امن سے

اگر میری گفتگو کے دوران میں کوئی سو جائے تو وہ نیند غفلت سے نہیں ہوتی

خلق در بازار یکساں می روند آں یکے در ذوق و دیگر دردمند
ہمچناں در مرگ یکساں می روم نیم در خسراں و نیمے خسرویم
(مثنوی مولانا روم)

بلکہ امن سے ہوتی ہے، جیسے اندھیری رات میں قافلہ دشوار راستہ پر ڈرتے ڈرتے جارہا ہو اور اہلِ قافلہ کے کان میں کتے یا مرغ کی آواز آجائے اور وہ گاؤں میں پہنچ کر آسودہ ہوجائیں اور پاؤں پھیلا کر خوشی خوشی سوجائیں۔ راستہ میں جہاں کوئی آواز اور شور نہ تھا، انہیں خوف کے مارے نیند نہ آئی اور گاؤں میں جہاں امن نہ تھا کتوں کے شور اور مرغوں کے خروش کے باوجود انہیں آسودگی اور خوشی سے نیند آگئی۔ ہمارا سخن بھی امن اور آبادی کے مرادف ہے اور ہم انبیاء اور اولیاء ہی کی بات کرتے ہیں۔ روحیں جب اپنے آشناؤں کی بات سنتی ہیں تو امن پاتی ہیں اور خوف سے ان کی خلاصی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس سخن سے امید اور اقبال کی بو آتی ہے جیسے کوئی شخص تاریک رات میں کسی قافلہ کے ہمراہ ہو۔ انتہائی خوف کی وجہ سے وہ ہر لمحہ خیال کرتا ہو کہ راہزن قافلہ میں شامل ہیں۔ وہ چاہتا ہو کہ ہمراہیوں کی باتیں سنیں اور انہیں باتوں سے پہچانتا ہو۔ چنانچہ جب وہ ان کی باتیں سنے تو اسے چین آجائے۔ قل یا محمد اقرأ (کہا اے محمد پڑھ!) کیونکہ تیری ذات لطیف ہے اس لیے اس تک نظریں نہیں پہنچتیں۔ جب تو بات کرتا ہے تو ارواح معلوم کرلیتی ہیں کہ تو آشنا ہے۔ انہیں چین آجاتا ہے اور وہ آرام کرتی ہیں۔ بات کر۔

ترجمہ شعر: میرے جسم کو بیمار ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ میں ایک ایسا آدمی ہوں کہ اگر میرا تخاطب تجھ سے نہ ہوتا تو تُو مجھے نہ دیکھتا۔

دل راہنمائی کرتا ہے

کھیت میں کون سا جانور ہے جو انتہائی طور پر چھوٹا ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتا۔ جب وہ آواز نکالتا ہے تو اسے دیکھتے ہیں، آواز کے ذریعے سے۔ دوسرے لفظوں میں یہ

کہ دنیا کے کھیت میں خلقت مستغرق ہے، اور تیری ذات انتہائی لطافت کی وجہ سے نظر نہیں آتی۔ بات کر تاکہ تجھے پہچانیں۔ جب تُو چاہتا ہے کہ کسی جگہ جائے تو پہلے تیرا دل وہاں جاتا ہے اور دیکھتا ہے اور وہاں کے حال پر مطلع ہوتا ہے۔ پھر دل واپس آتا ہے اور جسم کو کھینچتا ہے۔ اب یہ ساری خلقت انبیاء اور اولیاء کی نسبت سے جسم ہیں۔ انبیاء اور اولیاء دنیا کا دل ہیں۔ پہلے یہ اس عالم کی سیر کرتے ہیں اور بشریت، گوشت پوست سے باہر آجاتے ہیں۔ اس دنیا کے نیچے اور اوپر کا مطالعہ کرتے ہیں اور منزلیں قطع کرتے ہیں تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ راہ کیسی ہے۔ پھر واپس آتے ہیں اور خلقت کو دعوت دیتے ہیں کہ آؤ اس عالم اصلی کو کیونکہ یہ عالم خراب ہے اور سرائے فانی ہے، اور ہم تمہیں خبر دیتے ہیں کہ ہم نے اچھی جگہ حاصل کرلی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ میرا دل تمام حالات میں دلدار کی حضوری میں ہے اور اسے قطع منازل، خوف، رہزن، پالان اور خچر کی حاجت نہیں ہے۔ جسم مسکین ہے جو ان کا مقید ہے۔

ترجمہ شعر: میں نے اپنے دل سے کہا اے دل تو اپنی نادانی سے کس کی خدمت سے محروم ہو رہا ہے؟

ترجمہ شعر: دل نے کہا تو نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ میں تو خدمت کو لازم سمجھتا ہوں، تُو ہی سرگرداں ہے۔

عشق کی شرح ممکن نہیں

تو جس جگہ ہو اور جس حال میں ہو، کوشش کر تاکہ تو محبّ بن جائے اور عاشق بن جائے اور جب محبت تیری ملکیت بن گئی تو ہمیشہ کے لیے محبّ بن گیا۔ قبر میں، حشر

میں اور بہشت میں۔ جب تو نے گندم بوئی تو قطعی طور پر گندم ہی اُگے گی اور ڈھیر میں گندم ہی ہوگی اور تنور میں بھی گندم ہی ہوگی۔

مجنوں نے چاہا کہ لیلیٰ کو خط لکھے۔ قلم ہاتھ میں لیا اور یہ شعر کہا: (ترجمہ) "تیرا خیال آنکھ میں مقیم ہے اور تیرا نام میری زبان پر ہے اور تیری یاد میرے دل میں ہے۔ پس جب ان مقامات میں تو ہی تو ہے تو میں خط کس کو لکھوں؟" مجنوں نے قلم توڑ ڈالا اور کاغذ پھاڑ دیا۔

کئی شخص ہیں جن کے دل ان باتوں سے پُر ہیں لیکن عبارت اور الفاظ میں وہ انہیں نہیں لاسکتے، اگرچہ وہ اس کے عاشق، طالب اور نیاز مند ہیں۔ اس میں تعجب نہیں اور یہ بات عشق میں مانع نہیں ہوتی۔ بلکہ خود اصل دل ہے اور نیاز مندی اور عشق اور محبت۔ بچہ دودھ کا عاشق ہوتا ہے اور وہ اس سے مدد حاصل کرتا ہے اور قوت پاتا ہے اور اس کے باوجود وہ دودھ کی شرح نہیں کرسکتا کہ دودھ پینے سے مجھے کیا لذت ملتی ہے اور اس کے نہ پینے سے کس طرح کمزور اور رنجیدہ ہوجاتا ہوں۔ اگرچہ وہ دل و جان سے دودھ کا عاشق ہے اور بالغ آدمی دودھ کی خواہ کتنی ہی شرح کرے اور تعریف کرے، لیکن دودھ کچھ مزا نہیں دیتا اور اس سے لذت نہیں ملتی۔

سالک کی جدوجہد اور خدا کی عطاء

اس نوجوان کا کیا نام ہے؟ سیف الدین۔ فرمایا کہ سیف غلاف میں ہے، اسے دیکھا نہیں جاسکتا۔ سیف الدین وہ ہوتا ہے جو دین کے لیے جنگ کرے اور کلی طور پر اس کی کوشش حق کے لیے ہو۔ وہ خطا سے صواب پیدا کرے اور باطل سے حق کی تمیز

کرے۔ بے شک وہ پہلے اپنے آپ سے جنگ کرتا ہے اور اپنے اخلاق کو مہذب بناتا ہے۔ ابدأ بنفسك (ابتدا کر اپنے نفس سے) اور سب نصیحتیں وہ اپنے آپ کو کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہتا ہے آخر تُو بھی آدمی ہے۔ تُو ہاتھ پاؤں، گوش ہوش، آنکھیں اور منہ رکھتا ہے۔ اور انبیاء اور اولیاء جنہوں نے دولتیں پائیں اور مقصود کو پہنچے، وہ بھی بشر ہی تھے۔ میری طرح ان کے بھی کان، عقل، زبان، ہاتھ اور پاؤں تھے۔ اس کا کیا مطلب کہ انھیں اجازت مل گئی اور ان کے لیے دروازہ کھول دیا گیا۔ مگر میرے لیے ایسا نہیں ہوا۔ وہ اپنے آپ کو سزا دیتا ہے اور دن رات اپنے آپ سے جنگ کرتا ہے۔ تُو نے کیا کیا اور تجھ سے کیا حرکت سرزد ہوگئی کہ تو مقبول نہیں ہوا۔ اگر تو مقبول ہوتا تو خدا کی تلوار اور خدا کی زبان بن جاتا۔ مثلاً دس آدمی چاہتے ہیں کہ ایک گھر میں داخل ہوں۔ ان سے نو آدمیوں کو راستہ مل جاتا ہے اور ایک باہر رہتا ہے۔ اسے اندر جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ یہ شخص اپنے آپ میں سوچتا ہے اور روتا ہے کہ میں عجیب ہوں۔ میں کیا کر بیٹھا کہ مجھے اندر نہیں جانے دیتے اور مجھ سے کیا بے ادبی ہوگئی۔ چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو گناہ کا ذمہ دار ٹھہرائے اور اپنے آپ کو قصور وار اور بے ادب گردانے۔ نہ یہ کہ وہ یہ کہے کہ گناہ مجھ سے خدا نے کرایا ہے۔ میں کیا کروں۔ خدا ہی ایسا چاہتا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو مجھے نیکی کی اجازت دے دیتا۔ ایسی بات سے خدا کو گالی دینے کا پہلو نکلتا ہے اور یہ خدا کو تلوار مارنے کے مترادف ہے۔ پس ان معنوں میں وہ "خدا پر تلوار" ہوا نہ کہ "خدا کی تلوار"۔ خداوند تعالیٰ خویش و اقربا سے منزہ ہے۔ (سورۂ اخلاص) نہ کوئی اس کی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ بندگی کے ذریعہ کے بغیر اس تک کسی کو راہ نہیں ملتی۔ واللہ الغنی وانتم الفقراءُ (سورۂ محمدؐ، ع ۴) اللہ بے نیاز ہے اور تم سب محتاج ہو۔ ممکن نہیں کہ تُو یہ کہہ سکے کہ جس شخص نے خدا کا راستہ پالیا وہ خدا کا زیادہ اپنا اور زیادہ آشنا تھا۔ اور خدا کا زیادہ تعلق دار تھا۔ اس کا قرب حاصل

نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ بندگی کو ذریعہ بنایا جائے۔ وہ معطی ہے علی الاطلاق۔ اس نے دریا کا دامن موتیوں سے بھر دیا۔ کانٹے کو پھول کی خلعت پہنا دی اور مشتِ خاک کو بغیر کسی غرض کے زندگی اور روح بخشی۔ عالم کے تمام اجزاء اس سے نصیب یافتہ ہیں۔ جب کوئی سنتا ہے کہ فلاں شہر میں ایک سخی ہے جو بہت بڑی بخشش اور احسان کرتا ہے تو وہ بے شک اس امید پر وہاں جاتا ہے کہ اس سے بہرہ مند ہو۔ پس جب خدا کا انعام اتنا مشہور ہے اور سارا عالم اس کے لطف سے باخبر ہے تو کیوں اس کی گدائی نہیں کرتا؟ اور تو خلعت اور صلہ کی طمع کیوں نہیں رکھتا؟ تو کاہلوں کی طرح بیٹھا ہے کہ اگر وہ چاہے تو مجھے دے گا اور تو خود کوئی تقاضا نہیں کرتا۔ کتا جس میں عقل اور ادراک نہیں ہے، اسے بھی جب بھوک لگتی ہے اور روٹی نہیں ملتی تو تیرے سامنے آتا ہے اور اپنی دُم ہلاتا ہے۔ مطلب یہ کہ مجھے روٹی دے۔ میرے پاس روٹی نہیں۔ تیرے پاس ہے۔ اسے اتنی تمیز ہوتی ہے۔ آخر تو کتے سے کم نہیں ہے۔ کتا اس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ مٹی میں سویا رہے اور کہے کہ تم چاہو گے تو مجھے روٹی دے دو گے۔ وہ خوشامد کرتا ہے اور دم ہلاتا ہے تو بھی دم ہلا اور خدا سے مانگ۔ اور گدائی کر۔ ایسے عطا کرنے والے کے سامنے گدائی کرنا بہت ہی مطلوب ہے۔ جب تیرے پاس نصیب نہیں ہے تو وہ کسی سے مانگ کیونکہ وہ بخیل نہیں ہے۔ وہ صاحبِ دولت ہے۔ خدا تیرے بہت ہی قریب ہے۔ ہر فکر اور تصور جو تو امکانی طور پر کر سکتا ہے وہ اس میں موجود ہے۔ اس لیے کہ ہر تصور اور ہر فکر کو وہی ہستی بخشتا ہے۔ البتہ انتہائی طور پر نزدیک ہونے کی وجہ سے تو اسے دیکھ نہیں سکتا۔ اس کے اثر سے تو اسے دیکھتا ہے۔ بے شک اس کی ذات کو تو نہیں دیکھ سکتا۔ مثلاً کوئی شخص حمام میں جائے تو گرم ہو جاتا ہے۔ حمام میں وہ جدھر بھی پھرے آگ اس کے ساتھ ہے۔ تاب آتش کی تاثیر سے وہ گرمی حاصل کرتا ہے۔ لیکن وہ آگ نہیں دیکھتا۔ جب وہ حمام سے باہر آتا ہے تو اسے لازماً دیکھتا

ہے اور سمجھتا ہے کہ اسے آگ سے گرم کرتے ہیں۔ وہ جان لیتا ہے کہ حمام کی وہ گرمی بھی آگ ہی سے تھی۔ آدمی کا وجود بھی ایک عجیب حمام ہے۔ اس میں عقل، روح اور نفس سب کی گرمی ہے۔ لیکن جب تو وجود کے حمام سے باہر آتا ہے اور اس جہان کو جاتا ہے تو بے شک تو عقل کی ذات کو دیکھتا ہے اور ذاتِ نفس اور ذاتِ روح کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اب تو سمجھ لیتا ہے کہ وہ زیرکی عقل کی گرمی سے تھی۔ اور وہ مکر و فریب اور حیلے نفس کے تھے۔ اور زندگی، روح کا اثر تھی۔ بے شک تو ہر ایک کی ذات کو دیکھتا ہے۔ ہاں جب تک تو حمام میں ہے آگ کو نہیں دیکھ سکتا۔ اسے صرف اس کے اثر کی وجہ سے محسوس کرتا ہے۔ اگر کسی کی آنکھیں بند کر کے اسے بہتے ہوئے پانی میں ڈال دیا جائے تو وہ آبِ رواں کو نہیں دیکھ سکتا۔ کوئی تر اور نرم چیز اس کے جسم پر پڑتی ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے۔ اگر اس کی آنکھیں کھول دی جائیں تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ بے شک وہ پانی تھا پہلے اس نے پانی کو اس کے اثر سے سمجھا تھا۔ اب اس کی ذات کو دیکھا۔ پس خدا کی گدائی کر اور اس سے حاجت طلب کر۔ کیونکہ کوئی ضائع نہیں ہوتا۔ اُدعونی استجب لکم (سورۂ مومن ع ۶) ہم سے دعا مانگتے رہو۔ ہم قبول کرتے رہیں گے۔

خدا پر پورا بھروسہ

ہم سمرقند میں تھے اور خوارزم شاہ سمرقند کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ لشکر کو صف آرا کیے وہ جنگ کر رہا تھا۔ اس مقام پر ایک بہت ہی بہتر صاحبِ جمال لڑکی تھی۔ ایسی حسین کہ شہر بھر میں اس کی نظیر نہ تھی۔ میں نے سنا کہ وہ ہر لحہ کہتی تھی۔ اے خدا تو کیونکر روا رکھے گا کہ مجھے ظالموں کے ہاتھ میں دے دے اور میں جانتی ہوں کہ تو ہرگز یہ

روا نہیں رکھتا۔ اور میں تجھ پر اعتماد رکھتی ہوں اور اپنے آپ کو تیرے سپرد کرتی ہوں۔ جب شہر کو حملہ آوروں نے تباہ کر دیا۔ اور وہاں کی ساری آبادی کو اسیر کر کے لے گئے۔ تو اس عورت کی لونڈیاں بھی قیدی بنالی گئیں۔ مگر اسے کوئی تکلیف نہ پہنچی۔ اور اس کے انتہائی حسین ہونے کی وجہ سے کسی نے اس پر نظر نہ کی۔ یہ اس لیے ہوا کہ تو سمجھ لے جو شخص اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے۔ وہ تمام آفتوں سے امن پاتا ہے اور سلامت رہتا ہے اور اس کے حضور میں کسی کی حاجت ضائع نہیں جاتی۔

ایک درویش نے اپنے بیٹے کو سکھا رکھا تھا کہ وہ جو چیز باپ سے مانگتا وہ کہتا خدا سے مانگ۔ جب وہ روتا اور کوئی چیز خدا سے مانگتا تو باپ اسی وقت وہ چیز حاضر کر دیتا۔ اسی طرح کئی سال گذر گئے۔ ایک دن وہ لڑکا گھر میں تنہا رہ گیا تھا۔ اسے ہریسہ (حلیم) کھانے کی خواہش ہوئی۔ عادت معہودہ کے مطابق اس نے کہا مجھے ہریسہ چاہیے۔ اسی وقت غیب سے ہریسہ حاضر ہو گیا۔ لڑکے نے پیٹ بھر کر کھایا۔ جب اس کے ماں باپ آئے تو پوچھنے لگے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ بولا مجھے ہریسہ چاہیے تھا۔ وہ میں نے کھا لیا ہے۔ باپ نے کہا۔ خدا کا شکر ہے کہ تو اس مقام پر پہنچ گیا اور خدا پر تیرا اعتماد اور بھروسہ قوی ہو گیا۔

حضرت مریم کی ماں نے جب مریم کو جنا تو اس نے خدا کی منت مان رکھی تھی کہ وہ اسے خانۂ خدا کے لیے وقف کر دے گی، اور اس سے کچھ تعلق نہیں رکھے گی۔ اور وہ مسجد کے ایک گوشہ میں جا پڑی۔ زکریا نے چاہا کہ اس کی تیمارداری کرے۔ اور ہر کوئی یہی چاہتا تھا۔ چنانچہ سب میں اس بات پر جھگڑا ہو گیا۔ اور اس زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ کسی چیز پر جھگڑے کی صورت میں پانی میں لکڑی ڈالتے جس کی لکڑی پانی کی سطح پر رہتی وہ چیز اس کی ملکیت ہو جاتی۔ اتفاق سے اس موقع پر زکریا کی فال درست ہوئی۔ اب سب نے اتفاق کر لیا کہ یہ زکریا کا حق ہے۔ زکریا ہر روز اس کے لیے کھانا لاتا۔ وہ جو بھی کھانا لاتا مسجد کے

ایک گوشہ میں وہی پہلے سے موجود ہوتا۔ بولا، اے مریم! آخر میں تیرا وصی ہوں۔ مجھے بتا تو سہی یہ کھانا تو کہاں سے لاتی ہے؟ بولی جب مجھے کھانے کی حاجت ہو تو میں جو مانگوں خداوند بھیج دیتا ہے۔ اس کے کرم اور رحمت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ جس کسی نے اس پر اعتماد کیا ضائع نہ ہوا۔ زکریا نے کہا، اے خدا سب کی حاجت تو ہی پوری کرتا ہے۔ تو میں بھی ایک آرزو رکھتا ہوں۔ اسے پوری فرما، مجھے ایک بیٹا دے جو تیرا دوست ہو۔ میری طرف سے اس کو رغبت دلائے بغیر ہی اسے تجھ سے موانست ہو اور وہ تیری بندگی میں مشغول رہے۔ خداوند تعالیٰ حضرت یحیٰؑ کو وجود میں لے آیا۔ اس وقت بڑھاپے سے یحیٰؑ کے باپ کی کمر دوہری ہو چکی تھی۔ وہ بے حد ضعیف ہو چکا تھا۔ اس کی ماں بانجھ تھی اور بوڑھی ہو چکی تھی۔ اسے بہت حیض آیا اور وہ حاملہ ہو گئی۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے تاکہ تو سمجھ لے کہ خدا کی قدرت کے سامنے یہ سب ایک بہانہ ہے اور سب کچھ اسی سے ہے۔ اور اشیاء کا حاکم مطلق وہی ہے۔ مومن وہ ہے جو سمجھ لے کہ اس کے پیچھے کوئی ہے۔ اور ہمارے حالات سے ہر لحاظ سے مطلع ہے اور دیکھتا ہے۔ اگرچہ ہم اسے نہیں دیکھتے۔ اور اس کا اسے یقین ہوتا ہے۔ خلاف اس شخص کے جو کہتا ہے، نہیں یہ سب افسانہ ہے اور باور نہیں کرتا۔ ایک وہ وقت آتا ہے جب اسے سزا ملتی ہے۔ پھر وہ کہتا ہے۔ آہ میں نے برا کیا اور خطا کی۔ سب کچھ وہی تھا۔ میں نے خواہ مخواہ اس کی نفی کی۔ مثال کے طور پر تو جانتا ہے کہ میں دیوار کے پیچھے ہوں۔ تو رباب بجاتا ہے اور پوری توجہ سے بجاتا ہے۔ اور اس کا سلسلہ منقطع نہیں کرتا۔ کیونکہ اس نماز کی رعایت اس لیے نہیں ہے کہ تو سارا دن قیام، رکوع اور سجدہ کرتا رہے۔ اس سے غرض یہ ہے کہ جو حالت نماز میں طاری ہوتی ہے وہ تجھ سے پیوست رہے۔ خواہ تو سویا ہوا ہو۔ خواہ بیدار ہو، خواہ لکھ رہا ہو اور خواہ پڑھ رہا ہو۔ کسی حال میں تو یادِ حق سے خالی نہ ہو۔ تاکہ تو

علی صلاتھم دائمون. (سورہ معارج :ع ۱)   وہ نماز میں ہمیشہ رہتے ہیں۔
کے مصداق ہو، پس گفتگو، خاموشی، کھانا، سونا، غصہ، عفو، یہ سب اوصاف چکی کی گردش کے ہیں کہ وہ گھومتی رہتی ہے۔ چکی کی گردش پانی کے واسطہ سے ہے۔ اس نے اپنے آپ کو پانی کے بغیر بھی آزما دیکھا ہے۔ پس اگر چکی اس گردش کو سمجھے کہ یہ از خود ہے۔ تو یہ اس کی جہالت اور بے خبری ہے۔ پس اگر گردش کے لیے میدان تنگ ہے۔ کیونکہ دُنیا کا یہی حال ہے۔ تو خداوند تعالیٰ کے حضور میں گریہ وزاری کر کہ اے خدا! مجھے اس نظارہ اور اس گردش کے بغیر ایک دوسری روحانی گردش عطا فرما۔ جب تمام حاجتیں تجھ ہی سے پوری ہوتی ہیں اور تمام موجودات پر تیرا اکرم اور تیری رحمت عام ہے تو میری حاجت بھی تو ہی پوری کر۔ پس اپنی حاجتیں ہر لحظہ عرض کیے جا اور اس کی یاد کے بغیر نہ رہ۔ کیونکہ اس کی یاد مرغِ روح کے لیے پروبال کی قوت ہے۔ اگر وہ مقصود کلی حاصل ہو جائے تو نوراً علی نور۔ ایک دفعہ خدا کو یاد کرنے سے باطن تھوڑا تھوڑا منور ہوتا ہے۔ اور دنیا سے تیرا انقطاع ہونے لگتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک پرندہ چاہے کہ وہ آسمان پر اڑے اگرچہ وہ آسمان پر نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن لحظہ بلحظہ زمین سے دور ہوتا جاتا ہے۔ اور دوسرے پرندوں سے بلند ہو جاتا ہے۔ یا مثلاً ایک ڈبیہ میں مشک ہو۔ اس ڈبیہ کا منہ تنگ ہو تو اس میں ہاتھ ڈال کر مشک باہر نہیں نکال سکتا۔ لیکن اس کے باوجود تیرا ہاتھ معطر ہو جاتا ہے۔ اور مشام کو اچھا لگتا ہے۔ پس خدا کی یاد ایسی ہی ہے۔ اگرچہ تو اس ذات تک نہیں پہنچتا۔ اس کی یاد بڑا اثر کرتی ہے۔ اور تجھے اس کی یاد سے بہت بڑے بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

اجتہاد اور خدا کی عنایت

شیخ ابراہیم ایک عزیز درویش ہے۔ جب ہم اسے دیکھتے ہیں تو دوست یاد آجاتے

ہیں۔ مولانا شمس الدین کی ان پر ایک بڑی عنایت تھی۔ وہ ہمیشہ کہتے ہمارا شیخ ابرہیمؒ اور اپنے آپ سے نسبت کرتے۔ عنایت اور چیز ہے اور اجتہاد اور بات۔ انبیاء نبوت کے مقام پر اجتہاد کے واسطہ سے نہیں پہنچتے۔ یہ دولت انہیں عنایت سے ملتی ہے۔ البتہ سنت یہ ہے کہ جسے یہ حاصل ہو اس کی سیرت اور زندگی، اجتہاد اور نیکی کے طریق پر ہوتی ہے۔ اور یہ بھی عوام کے لیے ہے تاکہ وہ ان پر اور ان کے قول پر اعتماد کریں۔ کیونکہ ان کی نظر باطن پر نہیں پڑتی۔ یہ ظاہر بین ہیں اور جب عوام متابعت کرتے ہیں تو اس کے واسطہ اور برکت سے وہ باطن کا راستہ پاتے ہیں۔ آخر فرعون نے بھی سخاوت، احسان اور اشاعت خیر میں بہت جدوجہد کی تھی۔ لیکن عنایت نہ تھی اس لیے اس بندگی، جدوجہد اور احسان کو فروغ نہ ہوا اور ان سب پر پردہ پڑگیا۔ اس کی مثال اس امیر جیسی ہے جو قلعہ میں اہلِ قلعہ پر احسان اور نیکی کرتا ہے اور اس سے اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ بادشاہ سے باغی اور سرکش نہ ہوجائیں۔ ضروری ہے کہ اس احسان کی نہ قدر ہوگی نہ اسے فروغ حاصل ہوگا اور اگرچہ فرعون سے عنایت کی نفی کلی طور پر نہیں کی جاسکتی اور ہوسکتا ہے کہ اس پر خداوند تعالیٰ کی عنایت خفی ہو۔ کسی مصلحت سے اس کو مردود گردانا گیا ہو۔ اس لیے کہ بادشاہ میں قہر اور لطف دونوں ہونے چاہئیں اور وہ خلعت بھی دے سکتا ہو اور قید بھی کرسکتا ہو۔ اہل دل اس سے عنایت کی کلی نفی نہیں کرتے۔ البتہ اہلِ نظر اسے کلی طور پر مردود سمجھتے ہیں اور بقائے ظاہر کی جہت میں یہی مصلحت ہے۔

اعلیٰ مرتبہ ایک پھانسی ہے

بادشاہ کسی کو پھانسی پر چڑھاتا ہے تو اسے خلقت کے سامنے بہت اونچی جگہ پر

لٹکا دیتے ہیں۔ اسے گھر میں پھانسی دی جا سکتی ہے اور حقیر سی میخ سے اسے لٹکایا جاسکتا ہے لیکن چاہتے ہیں کہ لوگ اسے دیکھیں اور ان کے دلوں میں اعتماد پیدا ہو اور بادشاہ کے حکم کا نفاذ اور حکم کی تعمیل کا لوگوں کو علم ہو۔ آخر ہر پھانسی لکڑی کی نہیں ہوتی۔ منصب، بلندی اور دنیا کی دولت بھی تو بہت اونچی پھانسیاں ہیں۔ خداوند تعالیٰ جب چاہتا ہے کہ کسی کو پکڑے تو اسے بہت بڑا منصب اور بڑی بادشاہی دے دیتا ہے، جیسے فرعون اور نمرود وغیرہ کے ساتھ کیا۔ ان کے لیے وہ سب ایک پھانسی ہیں۔ خداوند تعالیٰ انہیں اس پھانسی پر چڑھا دیتا ہے تاکہ تمام خلقت اس سے مطلع ہو۔ اسی لیے خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف (حدیث قدسی) میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ پس میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں۔ یعنی میں نے سارے جہان کو پیدا کیا اور اس سے میری غرض اپنے آپ کو ظاہر کرنا تھا۔ کبھی لطف سے اور کبھی قہر سے۔ یہ ایسا بادشاہ نہیں ہے جس کے ملک کو پہچاننے والا ایک ہی شخص کافی ہو۔ اگر دنیا کے ذرات تمام کے تمام اسے پہچاننے والے بن جائیں تو بھی وہ اس کی تعریف میں قاصر اور عاجز ہیں۔

نفی اور اثبات

تمام خلائق دن رات اظہارِ حق کرتی ہیں۔ البتہ بعض ایسے ہیں جو یہ جانتے ہیں اور اظہار سے واقف ہیں اور بعض غافل ہیں۔ ایا ما کان جو کچھ بھی ہو اظہارِ حق ثابت ہو جاتا ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسے کوئی امیر فرمائے کہ فلاں کو مارو اور اس کی تادیب کرو۔ وہ چیختا اور فریاد کرتا ہے اور اس کے باوجود دونوں ہی امیر کے حکم کا اظہار کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ درد کی وجہ سے چلاتا ہے۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ پیٹنے والا اور پٹنے والا دونوں امیر کے

محکوم ہیں اور ان دونوں سے حکم امیر کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ شخص جو خدا کو ثابت کرنے والا ہے ہمیشہ خدا کا اظہار کرتا ہے اور جو نفی کرتا ہے وہ بھی مظہر ہے۔ اس لیے کہ کسی چیز کا اثبات نفی کے بغیر متصور نہیں اور اس میں کچھ لذت اور مزا نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی مناظر مجلس میں مسئلہ بیان کرے تو وہاں اگر معترض نہ ہو جو لا نسلّم (ہم تسلیم نہیں کرتے) نہ کہے، وہ اثبات کیا کرے گا؟ اور اس کے نکتہ کا کیا مزا آئے گا۔ اس لیے کہ اثبات، نفی ہی کے مقابلہ میں اچھا لگتا ہے۔ اس طرح یہ دنیا بھی خدا کے اظہار کی محفل ہے۔ خدا کو ثابت کرنے والے اور اس کی نفی کرنے والے دونوں ہی سے اس محفل میں رونق ہے اور دونوں ہی خدا کے مظہر ہیں۔

دوست پر فدا ہو جاؤ

کچھ دوست میر اکدشاں کے پاس گئے۔ وہ ان پر بہت خفا ہوا کہ ان سب کا یہاں کیا کام؟ کہنے لگے ہمارا یہ غلبہ اور یہ اژدہام اس لیے نہیں ہے کہ ہم کسی پر ظلم کریں۔ یہ اس لیے ہے تاکہ ہم تحمل اور صبر میں معاون ہوں اور ایک دوسرے کی مدد کریں جس طرح تعزیت کے لیے لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں اس لیے نہیں کہ وہ موت کو دور کر دیں۔ بلکہ غرض یہ ہوتی ہے کہ جس پر مصیبت آئی ہے اسے تسلی دیں اور اس کی طبیعت سے وحشت کو دور کریں۔ المؤمنون کنفس واحدۃ: تمام مومنین مثل ایک ذاتِ واحد کے ہیں۔ سب درویش ایک جسم کا حکم رکھتے ہیں۔ اعضاء میں سے اگر ایک عضو کو تکلیف ہو تو سب اجزا کو دکھ ہوتا ہے۔ آنکھ دیکھنا چھوڑ دیتی ہے، کان سننا ترک

لہ مشفقاں گردند ہچوں والدہ مسلموں را گفت نفسِ واحدہ
چوں نماند خانہ ہا را قاعدہ مومناں گردند نفسِ واحدہ

کر دیتے ہیں اور زبان گفتگو سے رک جاتی ہے۔ سب باہم متحد ہو جاتے ہیں۔ دوستی کی شرط یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دوست پر فدا کر دے اور دوست کی خاطر اپنے آپ کو شورش میں ڈال دے۔ اس لیے کہ سب کی توجہ ایک ہی چیز کی طرف ہوتی ہے اور ایک ہی بحر میں غرق ہوئے ہوتے ہیں۔ ایمان کا اثر اور اسلام کی شرط یہی ہے۔ جس بوجھ کو جسم اٹھائے وہ کس طرح اس بوجھ جیسا ہو سکتا ہے جسے روح اٹھاتی ہے۔ **لاخیر انا الی ربنا منقلبون** (سورۂ شعراء ۳) کچھ ہرج نہیں۔ ہمیں تو اپنے پروردگار کی طرف پلٹنا ہے۔

مومن جب اپنے آپ کو خدا پر فدا کرتا ہے تو اسے مصیبت، خطرہ، ہاتھ اور پاؤں کی کیا فکر ہوتی ہے۔ جب وہ خدا کی طرف جاتا ہے ہاتھ پاؤں کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ ہاتھ پاؤں اس لیے دیئے گئے ہیں تاکہ ان سے تو اس طرف روانہ ہو۔ لیکن جب تو ہاتھ اور پاؤں بنانے والے کی طرف جاتا ہے تو ہاتھ کے بل چلے اور پاؤں کو اٹھالے اور بے دست وپا ہو جائے۔ جادوگرانِ فرعون کی طرح چلنے لگے تو حرج کیا ہے۔

ترجمہ شعر: چاندی جیسا جسم رکھنے والے یار کے ہاتھ سے زہر کھایا جاسکتا ہے۔ اس کی باتوں کی تلخی شکر کی طرح کھائی جاسکتی ہے۔

ترجمہ شعر: دوست نمک کی طرح ہے۔ جس جگہ پر ایسا نمک ہو وہاں اپنا کلیجہ بھی نکال کر کھایا جاسکتا ہے۔

امر اور نہی کی حقیقت

اللہ تعالیٰ خیر اور شر دونوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ مگر وہ پسند خیر ہی کو کرتا ہے۔ کیونکہ اس نے کہا ہے:

کنت کنزاً مخفیاً فاحببتُ ان اعرف۔ میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا۔ مگر میں نے پسند کیا کہ میں پہچانا جاؤں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ امر اور نہی کا ارادہ رکھتا ہے اور "امر" صحیح طور پر وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ مگر اس وقت جبکہ ماموروہ کام کرنے کو مکروہ جانے، جس کے کرنے کا حکم دیا گیا ہو۔ بھوکے آدمی کو یہ نہیں کہا جاتا کہ مٹھائی اور شکر کھالو اور اگر ایسا کہا جائے تو اس کا نام "امر" نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کا نام تو "کرم" ہوگا۔ اسی طرح جس چیز سے انسان کو پہلے ہی بے رغبتی ہو[1] اس سے نہی وقوع نہیں ہوتی۔ یہ درست نہیں کہ کسی سے کہا جائے تو پتھر نہ کھا۔ تو کانٹے نہ کھا اور ایسا کہا جائے تو اس کا نام نہی نہیں ہوگا۔ اس لیے امر بالخیر اور نہی عن الشر صحیح معنوں میں اس وقت وقوع پذیر ہوگی، جب کوئی شخص شر کی طرف راغب ہو اور فعل شر کی رغبت اور فعل خیر سے بے رغبتی رکھنے والا ہو۔ لیکن شر کو پسند نہ کرتا ہو۔ مگر اس کا ایسا ظاہر کرنا محض اس ارادہ سے ہو کہ وہ متکلم کو اس کی جہالت کی وجہ سے امر بالخیر اور نہی عن الشر کا سبق پڑھانا چاہتا ہے کیونکہ سبق دینا اس صورت میں ممکن ہے کہ متعلم جاہل ہو۔ اور کسی چیز کے متعلق ارادہ کرنے سے مراد اس چیز کے لوازم کا ارادہ کرنا ہے۔ لیکن ارادہ کرنے والا اس کی جہالت کو پسند نہیں کرے گا۔ اسی طرح طبیب لوگوں کے مرض کا ارادہ کرے گا جبکہ وہ تشخیص اور علاج کو ظاہر کرنے کا ارادہ کرے۔ مگر علاج اور مرض کی تشخیص اسی وقت ممکن ہے جبکہ لوگ بیمار ہوں لیکن وہ ان کے مرض کو پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح ایک نانبائی لوگوں کی بھوک کا ارادہ رکھتا ہے، محض اپنے کسب اور حصولِ معاش کے لیے۔ لیکن ان کی بھوک کو پسند نہیں کرے گا۔ وہ اسے

---

[1] چوں مرا سوئے اجل عشق و ہواست — نہی لاتلقوا بایدیکم چرا است
زانکہ نہی از دانۂ شیریں بود — تلخ را خود نہی حاجت کے شود
دانہ کش تلخ باشد مغز و پوست — تلخی و مکروہیش خود نہی اوست

پسند کرتا ہے محض اپنی روٹی فروخت کرنے کے لیے اور اسی طرح امرا اور بڑے بڑے لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے بادشاہ کا کوئی نہ کوئی مخالف اور دشمن ضرور ہو، تاکہ وہ اپنی بہادری اور بادشاہ سے اپنی محبت کا اظہار کر سکیں اور بادشاہ بھی انھیں اس لیے جمع نہیں کرتا کہ اسے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن وہ بادشاہ کے مخالف کو پسند نہیں کرتے۔ وہ اسے محض اس لیے پسند کرتے ہیں کہ اس سے جنگ کریں اور اسی طرح انسان اپنے دل میں خواہشاتِ شر کا ارادہ رکھتا ہے کیونکہ وہ یہ بات پسند کرتا ہے کہ وہ شاکر، مطیع، متقی ہو اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کے دل میں شکر، اطاعت اور تقویٰ کو ترک کرنے کی خواہشات موجود ہوں اور ہر چیز کے متعلق ارادہ دراصل اس چیز کے لوازمات کے متعلق ارادہ ہے لیکن انسان ان لوازمات کو پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ مجاہدہ کرنے والا ہے کہ ایسی اشیا (خواہشاتِ بد) کا اس کے نفس سے ازالہ ہو۔ پس معلوم ہوا کہ اس کا شر کے متعلق ارادہ رکھنا کسی ایک وجہ سے ہے، اور شر کے متعلق ارادہ نہ رکھنا بھی کسی دوسری وجہ سے ہے اور مخالف کہتا ہے کہ اگر وہ شر کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس کی کوئی ایک خاص وجہ ہے۔ جس سے اس کا کسی چیز کے متعلق ارادہ رکھنا ہی محال ہو جاتا ہے اور جب انسان اس چیز کے لوازم اور اس منکر نفس کے امر و نہی کے لوازم کا ارادہ رکھے گا جو شر سے رغبت رکھنے والا اور خیر سے طبعاً متنفر ہے اور چونکہ دنیا کی تمام برائیاں اس نفس کے لوازم ہیں تو وہ ان برائیوں کا ارادہ نہیں رکھے گا اور نفس کا مرید نہیں ہوگا اور جب وہ نفس کا مرید نہ ہوگا تو وہ نفس کے لوازم امر و نہی کا ارادہ بھی نہ رکھے گا اور نہ انھیں پسند ہی کرے گا۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ شر دوسروں کی نسبت شر ہوتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ جب وہ ہر خیر کا ارادہ رکھنے والا ہو اور خیرات سے برائیاں دور ہو جاتی ہیں تو وہ دفعِ شر کا ارادہ رکھنے والا ہوا۔ اور ایمان کفر کے بعد ممکن ہوتا ہے۔ اس لیے ایمان کفر کے لوازم میں سے ہوا۔ مختصر یہ کہ شر کا ارادہ

ایک قبیح چیز ہے جبکہ وہ عین شر کے لیے ہو لیکن اس کا ارادہ غیر شر کے لیے ہو تو وہ قبیح چیز نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ولکم فی القصاص حیٰوة. (سورۃ بقر) قتل کے بدلے میں قتل کرنے سے تمہاری زندگی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قصاص بری چیز ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی بنیاد کو گرانے کے مترادف ہے لیکن یہ ایک جزوی شر ہے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو قتل سے بچانا خیر کلی ہے اور شر جزوی کا ارادہ ترک کر کے شر کلی پر رضامند ہوتا تو قبیح ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ماں بچے کو جھڑکنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ کیونکہ وہ شر جزوی ہی کو دیکھ رہی ہوتی ہے اور باپ اسے جھڑکنے کا ارادہ رکھتا ہے کیونکہ جزو آکلہ (شر) کو قطع کرنے کی خاطر باپ کی نظر شر کلی پر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا بخشنے والا، سخت سزا دینے والا ہے۔ پس کیا وہ ارادہ رکھتا ہے یا نہیں کہ اس پر یہ تمام گناہ صادق آئیں تو اس صورت میں ابتلا ضروری ہوا اور وہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا نہ ہوگا مگر گناہوں کے وجود کے بعد اور کسی چیز کے متعلق ارادہ گویا اس چیز کے لوازم کے متعلق ارادہ ہوتا ہے اور اس طرح معافی، صلح اور اصلاح کے حکم کی صورت میں یہ امر جبھی مفید ہوگا کہ خصومت کا وجود ہو۔ اس کی مثال وہی ہے جو صدر الاسلام نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کسب اور تحصیل مال کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ کہا ہے:

وانفقوا فی سبیل الله. (سورۃ بقر) اللہ کے راستہ میں خرچ کرو۔

اور مال کا خرچ کرنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ مال موجود ہو۔ گویا کہ اس نے تحصیل مال کا حکم صادر فرمادیا اور جو شخص کسی دوسرے آدمی سے کہے "اٹھ نماز پڑھ" اس نے گویا اسے وضو کرنے، پانی حاصل کرنے غرضیکہ اس کے تمام لوازمات کے متعلق حکم دیا۔

شکر ایک تریاق ہے

شکر بجالانا گویا نعمتوں کو شکار کرلینا اور انہیں اپنے قبضے میں کرلینا ہے۔ جب شکر کی آواز سنائی دیتی ہے تو مزید نعمت کی تیاری ہونے لگتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو محبوب جانتا ہے تو وہ اسے ابتلا میں ڈال دیتا ہے۔ اگر وہ بندہ صبر کرے تو اسے برگزیدہ بنالیتا ہے اور اگر وہ شکر کرے تو اسے چن لیتا ہے۔ بعض لوگ اللہ کا شکر اس کے قہر کی وجہ سے کرتے ہیں اور بعض اس کے لطف اور مہربانی کی بنا پر اس کا شکریہ بجالاتے ہیں۔ یہ دونوں گروہ ہی اچھے ہیں کیونکہ شکر ایک تریاق ہے جو قہر کو لطف سے بدل دیتا ہے۔ کامل عاقل وہی ہوتا ہے جو جفا پر بھی حضور و خفا میں شکر بجالائے۔ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ برگزیدہ کرلیتا ہے۔ اگر اس کی مراد حصولِ دوزخ ہو تو شکوہ کے ساتھ اس کا مقصود جلدی حاصل ہوگا کیونکہ ظاہری شکوہ سے باطنی شکوہ کی تنقیص ہوتی ہے۔ نبیؐ نے فرمایا میں ضحوک و قتول ہوں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ گنہگار کے سامنے میرا ہنسنا اس کا قتل ہے اور ہنسنے سے مراد شکوہ کی بجائے شکر کرنا ہے۔ حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک یہودی رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے ایک کا ہمسایہ تھا۔ یہودی اوپر کی منزل میں رہتا تھا اور صحابی مکان کے نچلے حصہ میں تھا۔ یہودی اوپر سے ناپاک پانی اور بچوں کا پیشاب اور پاخانہ اور کپڑوں کی دھلائی کا پانی نیچے پھینکتا تھا۔ صحابی خود اس یہودی کا شکریہ ادا کرتا اور اپنے اہل و عیال کو بھی شکریہ ادا کرنے کا حکم دیتا۔ اس حالت میں آٹھ برس گزر گئے۔ یہاں تک کہ صحابی وفات پاگیا اور یہودی اس کی تعزیت کے لیے اس کے گھر گیا۔ اب اس نے بالاخانہ کی موری میں سے وہ نجاستیں خارج ہوتی دیکھیں، تو اسے معلوم ہوا کہ گذشتہ زمانہ میں کیا ہوتا رہا تھا۔ وہ سخت شرمندہ ہوا اور صحابی کی بیوی سے کہا بہت افسوس ہے تم نے مجھے

اطلاع کیوں نہ دی۔ بلکہ تم ہمیشہ میرا شکریہ ادا کرتے رہے۔ اس نے جواب دیا وہ ہمیں حکم دیا کرتا تھا کہ ہم شکریہ ادا کریں اور ہمیں ہدایت کرتا تھا کہ ہم ترک شکریہ نہ کریں۔ اس پر یہودی ایمان لے آیا۔

ترجمہ شعر : نیکوں کا ذکر نیکی پر ابھارتا ہے جس طرح مطرب کا گانا شراب پینے پر ابھارتا ہے۔

شکر پستانِ نعمت کو چوسنا ہے۔ پستان اگرچہ بھرے ہوئے ہوں، جب تک تو چوسے نہیں دودھ نہیں آتا۔

ناشکری

پوچھا کہ ناشکری کا کیا سبب ہے ؟ اور مانع شکر کیا چیز ہے ؟ شیخ نے فرمایا۔ مانع شکر طمعِ خام ہے کہ جو کچھ اسے ملتا ہے وہ اس سے زیادہ کی طمع کر چکا ہوتا ہے۔ اسے وہ طمع خام اس پر قائم رکھتی ہے۔ وہ جو اس کے دل میں تھا جب اسے اس سے کم ملتا ہے تو مانع شکر بن جاتا ہے۔ پس وہ اپنے عیب سے غافل رہتا ہے اور وہ جس نقدی کی پیش کش کرتا ہے اس کے عیب اور کھوٹے پن سے بے خبر ہوتا ہے۔ طمعِ خام کرنا کچا پھل، کچی روٹی اور کچا گوشت کھانا ہے۔ وہ ضرور بیماری اور ناشکری کو پیدا کرتا ہے۔ جب سمجھ لیا کہ مضر چیز کھالی گئی ہے تو قے کرنا واجب ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اسے ناشکری میں مبتلا کر دیا تاکہ وہ قے کردے اور اس غلطی سے اپنے آپ کو فارغ کرے۔ تاکہ وہ ایک بیماری سو بیماریاں نہ بن جائے اور ہم نے نعمتوں اور مصیبتوں سے ان کی آزمائش کی۔ تاکہ وہ ہماری طرف رجوع کریں۔ یعنی ہم نے انہیں ایسی جگہ سے رزق دیا جہاں سے انہیں

گمان تک نہ تھا اور وہ جگہ غیب ہے اور ان کی نظر ان اسباب کو دیکھنے سے نفرت کرتی تھی۔ جو اللہ تعالیٰ سے شرک کی مانند تھے۔ ابو یزید نے کہا اے پروردگار! میں نے تیرے ساتھ شرک نہیں کیا۔ اللہ نے جواب میں فرمایا۔ اے ابو یزید! کیا لیلتہ اللبن (دودھ والی رات) میں ایسا نہیں ہوا؟ یعنی اس رات جب دودھ کی تکلیف ہوئی۔ حالانکہ ضرر یا نفع پہنچانے والا میں ہی ہوں۔ پس اس نے سبب پر نگاہ ڈالی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے مشرک شمار کیا اور فرمایا دودھ سے پہلے اور دودھ کے بعد میں ہی مضرت پہنچانے والا ہوں اگرچہ میں دودھ کو گناہ اور مضرت کو استاد کی تادیب و سزا کی مانند قرار دیتا ہوں۔ پس جب استاد نے کہا میوہ نہ کھاؤ۔ مگر شاگرد نے کھالیا تو استاد نے اس کے پاؤں کے تلوے پر مارا۔ اب یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ میں نے میوہ کھایا تو میرے پاؤں میں تکلیف ہوئی۔ اسی اصول کے مطابق جس شخص نے اپنی زبان کو شرک سے محفوظ رکھا اللہ تعالیٰ اس بات کا کفیل ہوگیا کہ وہ اس کی روح کو شرک کی ناپاکیوں سے پاک کردے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک "حمد" اور "شکر" میں بہت فرق ہے۔ کیونکہ شکر نعمتوں کا ہوتا ہے۔ یہ کبھی نہیں کہتے کہ میں اس کی خوبصورتی پر شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کی بہادری پر شکریہ ادا کرتا ہوں اور حمد اس سے عام ہے۔

شیخ کی ناراضگی

ایک شخص امامت کر رہا تھا۔ اس نے پڑھا:

الاعراب اشد کفراً و نفاقاً۔ (سورہ توبہ ع ۱۲:) — عرب کے دیہاتی لوگ کفر اور نفاق میں بڑے ہی سخت ہیں۔

شاید رؤسائے عرب میں سے ایک رئیس موجود تھا۔ اس نے اسے ایک بھرپور

تھپڑ مارا۔ دوسری رکعت میں اس نے پڑھا:

ومن الاعراب من یؤمن باللہ والیوم الآخر. (سورہ توبہ: ع ۱۲) — عرب کے دیہاتیوں میں سے ایسے ہیں جو خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

اس عرب نے کہا:

الصفعُ اصلحك. — تھپڑ نے تجھے درست کر دیا۔

ہم ہر وقت غیب سے تھپڑ کھاتے ہیں اور جو کچھ پیش آتا ہے اس کو تھپڑ ہی سے دور کر دیا جاتا ہے۔ پھر دوسری چیز پیش آتی ہے اور پھر یہی ہوتا ہے۔

قیل ما طاقة لنا هو الخسف والقذف وقیل قطع الوصال مالا طاقة لنا به کا مطلب زمین میں دھنسا اور پتھراؤ کا ہونا بیان کیا جاتا ہے اور یہ بھی ایک قول ہے کہ جوڑ جوڑ کاٹ ڈالنا وصال کا سلسلہ ٹوٹ جانے سے زیادہ آسان ہے۔

جیسے کوئی شخص کھانا کھاتا ہے تو وہ اس کے معدے میں جا کر ترشہ بن جاتا ہے۔ وہ اسے قے کر دیتا ہے۔ اگر وہ کھانا گڑبڑ نہ کرتا اور قے نہ ہوتی تو اسے آدمی کا جزو بدن بنانا مقصود ہوتا۔ اب مرید بھی خوشامد اور خدمت کرتا ہے تاکہ شیخ کے دل میں اس کے لیے گنجائش پیدا ہو۔ خدا کی پناہ! مرید سے کوئی حرکت سرزد ہو جاتی ہے جو شیخ کو پسند نہیں آتی اور وہ اسے دل سے اتار دیتا ہے۔ یہ اس کھانے کی طرح ہے جسے کسی نے کھایا اور قے کر دیا۔ اس کھانے کو آدمی کا جزو بدن بنانا مقصود تھا۔ مگر گڑبڑ کی وجہ سے قے کر دی اور اسے باہر پھینک دیا۔ وہ مرید بھی مرورِ زمانہ سے شیخ بننا چاہتا تھا۔ اس کی ناپسندیدہ حرکت کی بنا پر اسے شیخ نے اپنے دل سے نکال پھینکا۔

ترجمہ شعر: تیرے عشق نے دنیا بھر میں تیری منادی کر دی۔ یہاں تک کہ اس نے دلوں کو شور و شر میں مبتلا کر دیا ہے۔

ترجمہ شعر : اس کے بعد اس نے سب کو جلایا اور راکھ کر دیا۔ پھر انھیں لایا اور بے نیازی کی ہوا کے سپرد کر دیا۔

بے نیازی کی اس ہوا میں ان کے دلوں کی خاکستر کے ذرے رقص کرتے ہیں اور نعرے مارتے ہیں اور اگر وہ ایسے نہیں ہیں تو یہ خبر کون لاتا ہے اور اس خبر کو کون ہر وقت تازہ کرتا ہے اور اگر دل اس جلنے میں اور برباد ہونے میں اپنی زندگی نہیں دیکھتے تو وہ ان دلوں کے جلنے کی طرف اتنی رغبت کیسے کرتے ہیں جو دنیا کی خواہشات میں جل کر خاکستر ہو گئے ہیں۔ کیا تو ان کی کوئی آواز سنتا ہے اور ان کی رونق دیکھتا ہے ؟

ترجمہ شعر : مجھے یقین ہے اور اسراف میری فطرت میں نہیں کہ جو میری روزی ہے وہ مجھے پہنچ کر رہے گی۔

ترجمہ شعر : میں اس کے لیے کوشش کرتا ہوں اور اس کی جستجو مجھے مشقت میں ڈالتی ہے۔ اگر میں بیٹھ جاؤں تو وہ بلا مشقت میرے پاس آئے گی۔

دُنیا حاصل کرنے کا طریقہ

میں نے روزی کا قاعدہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور یہ میری عادت نہیں کہ میں بیہودہ چیز کے لیے دوڑ دھوپ کروں اور بلا ضرورت تکلیف اٹھاؤں۔ سچ تو یہ ہے کہ کھانے پینے، پہننے اور خواہشات کی آگ وغیرہ میں میرا جو بھی حصہ ہے، وہ اگر میں بیٹھ بھی جاؤں تو آکر رہے گا اور اس روزی کی تلاش میں اگر میں دوڑتا پھروں تو یہ دوڑ دھوپ مجھے تکلیف، تھکن اور ذلت میں ڈالے گی اور اگر میں صبر کروں اور اپنی جگہ پر بیٹھا رہوں تو میرے تکلیف اٹھائے بغیر اور خوار ہوئے بغیر وہ مجھے مل جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس روزی کو بھی

میری طلب ہے اور وہ مجھے کھینچتی ہے۔ جب وہ مجھے نہیں کھینچ سکتی تو خود میرے پاس آجاتی ہے۔ اسی طرح جب میں اسے نہیں کھینچ سکتا تو اس کے پیچھے جاتا ہوں۔ حاصل کلام یہ کہ دین کے کام میں مشغول ہو تا کہ دنیا تیرے پیچھے بھاگے۔ اس بیٹھنے کا مطلب کار دین کے لیے بیٹھنا ہے خواہ بھاگتا ہی ہے۔ مگر وہ دین کی خاطر بھاگتا ہے تو وہ بیٹھا ہوا ہی ہے اور اگر وہ بیٹھا ہوا ہے مگر دنیا کی خاطر بیٹھا ہوا ہے تو وہ بھاگ ہی رہا ہے۔ نبی علیہ السلام نے کہا:

من جعل الھموم ھماً واحداً کفاہ اللہ سائر ھمومہ۔

جس شخص نے اپنے رنجوں کو چھوڑ کر صرف ایک رنج و فکر کو قائم رکھا، حق تعالیٰ اس کی دوسری فکروں کو از خود دور کر دے گا۔

جس کسی کو دس غم ہوں وہ دین کا غم کھانے لگے، اس کی کوشش کے بغیر خداوند تعالیٰ ان میں سے نو کو ٹھیک کر دے گا۔ اسی طرح انبیاء شہرت اور روزی کے پیچھے نہیں بھاگتے رہے۔ وہ رضائے حق کے طالب تھے۔ انہیں روٹی بھی مل گئی اور ان کا نام بھی ہو گیا۔ جو شخص خدا کی رضا طلب کرتا ہے وہ اس جہان میں اور دوسرے جہان میں بھی پیغمبروں کے ساتھ ہو گا۔

اولٰئک مع النبیین والصدّیقین والشھداء والصالحین۔

یہ لوگ رفیق رہیں گے انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کے۔

ان کی جگہ کتنی قابلِ رشک ہے کہ وہ خدا کے ساتھ بیٹھتے ہیں کیونکہ

اَنَ جلیس من ذکرنی۔

جو مجھے یاد کرتا ہے میں اس کا ہم نشیں ہو جاتا ہوں۔

اگر خدا اس کا ہم نشیں نہ ہوتا تو اس کے دل میں خدا کا شوق نہ ہوتا۔ خوشبو ہرگز پھول کے بغیر نہیں ہوتی اور مشک کی خوشبو مشک کے بغیر نہیں ہوتی۔ اس بات کی

کوئی انتہا نہیں ہے۔ انتہا ہو تو سمجھ لو، دوسری باتوں کی طرح سے یہ بھی کوئی بات نہیں ہے۔

ترجمہ مصرع: رات بیت گئی مگر ہماری بات خاتمہ تک نہ پہنچی۔

اس دنیا کی رات اور تاریکی گزر جاتی ہے۔ مگر اس بات کا نور زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے انبیاءؑ کی شبِ عمر گزر جاتی ہے۔ مگر ان باتوں کا نور ختم نہیں ہوتا اور منقطع نہیں ہوتا اور نہ ہوگا۔ مجنوں سے لوگوں نے کہا کہ اگر اسے لیلےٰ سے محبت ہے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ دونوں بچے تھے اور ایک ہی مکتب میں پڑھتے تھے۔ مجنوں نے جواب دیا یہ لوگ بیوقوف ہیں۔

ایّ ملیحۃ لاتشتھی. وہ کونسی ملیحہ ہے جس کی خواہش نہیں کی جاتی۔

کیا کوئی مرد ایسا ہوتا ہے جو خوبصورت عورت کی طرف مائل نہ ہو اور اسی طرح عورت۔ بلکہ عشق وہ ہے کہ اس سے غذا اور مزا ملے۔ اسی طرح وہ اس سے ماں اور باپ اور بھائی کا دیدار اور بیٹے کی خوشی اور شہوت کی خوشی اور قسم قسم کی لذت پاتا ہے۔ زید اور عمر کے طریق پر عاشقوں میں سے مجنوں اس کی مثال ہے۔

ترجمہ شعر: خواہ تو نُقل اور کباب کھائے اور شرابِ ناب پئے، یہ سمجھ کر کہ تو خواب میں پانی پیتا ہے۔

ترجمہ شعر: جب تو خواب سے بیدار ہوگا تو پیاسا ہی ہوگا۔ تو خواب میں پانی پئے گا تو وہ تجھے کچھ فائدہ نہیں دیتا۔

الدّنیا کَحُلم النائم. دنیا سوئے آدمی کا خواب ہے۔

دنیا اور اس کی نعمتیں ایسی ہیں جیسے کوئی خواب میں کوئی چیز کھاتا ہے۔ پس دنیا

حاصل کرنے کی خواہش کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص خواب میں کچھ مانگے اور اسے دے دیں۔ انجام کار جب وہ بیدار ہوتا ہے تو خواب میں اس نے جو کچھ کھایا تھا، اس کا اسے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ پس اس نے خواب میں چیز مانگی ہوگی اور وہ اسے دے دی گئی ہوگی۔

فکان النوالُ قدر الکلام۔ یہ کامیابی بقدر گفتگو کے ہے۔

ظاہر کو نہ دیکھو باطن کو دیکھو

کیا ہم آدمی کی حالت یک بیک سمجھ لیتے ہیں اور اس کا مزاج اور طبیعت اور گرمی اور سردی ذرہ بھر ہم سے مخفی نہیں رہتے۔ کچھ معلوم نہ ہوا کہ اس میں جو باقی رہ جاتا ہے وہ کیا ہے۔ فرمایا اگر اس کا سمجھنا صرف بات ہی پر منحصر ہوتا تو کوئی شخص قسم قسم کی کوشش اور مجاہدہ کا محتاج نہ ہوتا اور کوئی شخص اپنے آپ کو تکلیف میں نہ ڈالتا اور اپنے آپ کو فدا نہ کرتا۔ مثلاً کوئی شخص سمندر پر آئے تو اسے کھاری پانی، مگرمچھ اور مچھلیوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ پوچھتا ہے موتی کہاں ہے؟ شاید یہاں موتی نہیں ہے۔ محض سمندر کو دیکھنے سے موتی کیسے حاصل ہو؟ اب اگر کوئی شخص دریا کا طاس ہزار مرتبہ بھی ناپ ڈالے تو موتی اسے نہیں ملے گا۔ اس کے لیے غوطہ خور ہونا چاہیے۔ تاکہ موتی نکال سکے اور پھر ہر غوطہ خور بھی یہ کام نہیں کر سکتا۔ صرف وہ غوطہ خور موتی نکالتا ہے جو نیک بخت اور چالاک ہو۔ یہ علوم اور ہنر دریا کے طاس میں پانی ناپنے کے مرادف ہیں۔ موتی حاصل کرنے کا طریقہ جدا ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جو تمام ہنروں سے آراستہ ہوتے ہیں اور صاحبِ جمال ہوتے ہیں۔ مگر ان میں وہ معنی نہیں ہوتا اور کئی لوگ جن کا ظاہر خراب ہوتا ہے۔ حسنِ صورت، فصاحت اور بلاغت ان میں نہیں ہوتی۔ مگر وہ معنی جسے بقا حاصل ہے ان میں ہوتا ہے اور یہ وہ جوہر ہے جس سے آدمی تمام مخلوق پر شرف رکھتا ہے اور مکرم

ٹھہرتا ہے اور تمام مخلوقات پر فوقیت رکھتا ہے۔ چیتے، مگرمچھ، شیر اور دوسری مخلوق میں ہنر ہوتے ہیں اور خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ لیکن وہ معنی جو باقی رہنے والا ہے، ان میں نہیں ہے۔ اگر آدمی ان معنوں میں راہ پر چلے تو وہ فضیلت حاصل کر لیتا ہے۔ مگر اس سے اسے اس فضیلت کا کچھ حصہ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ سب ہنر اور آرائش ایسے ہیں جیسے موتی کو آئینے کی پشت پر رکھ دیا جائے۔ آئینے کو اس کی ضرورت نہیں، اسے صفائی چاہیے۔ جس شخص کا چہرہ بدصورت ہو وہ لالچ سے آئینے کی پشت کی طرف دیکھتا ہے کیونکہ آئینہ غماز ہے اس کی زشت روئی کا اور جو شخص خوبصورت ہے وہ سو جان سے آئینہ طلب کرتا ہے کیونکہ آئینہ اس کے حسن کا مظہر ہے۔

یوسف مصری کا ایک دوست سفر سے واپس آیا۔ پوچھا میرے لیے کیا تحفہ لائے ہو؟ جواب دیا کونسی چیز ہے جو تیرے پاس نہیں ہے اور تو اس کا محتاج ہے؟ البتہ اس لیے کہ تجھ سے بڑھ کر کوئی حسین نہیں ہے میں تیرے لیے ایک آئینہ لایا ہوں تاکہ تو ہر لحظہ اس میں اپنا چہرہ دیکھتا رہے۔ کونسی چیز ہے جو خداوند تعالیٰ کے پاس نہیں اور جس کی اسے احتیاج ہے۔ خدا کے سامنے روشن دل لے جانا چاہیے تاکہ اس میں وہ اپنا چہرہ دیکھے۔

ان اللہ[1] لاینظر الی صورکم ولا الی اعمالکم وانما ینظر الی قلوبکم۔

اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے اعمال کو نہیں دیکھتا۔ وہ تمہارے دلوں اور تمہاری نیتوں کو دیکھتا ہے۔

ترجمہ شعر: یہ ایسا شہر ہے جو تجھے بلا ارادہ مل گیا لیکن اچھے لوگ ہی اس سے پرہیز کرتے ہیں۔

---

[1] ما بروں را ننگریم و قال را ما دروں را بنگریم و حال را
حق ہمی گوید نظر ما بردلست نیست برصورت کہ آں آب و گل است
وآنکہ گفتہ خدا کہ ننگریم من بظاہر من بباطن ناظرم

ایک شہر ہے کہ جس میں تو جو چاہے مل جاتا ہے۔ خوبصورت چہروں والے معشوق، لذتیں، وہ چیزیں طبیعت کو جس کی اشتہا ہوتی ہے، آرائش کے سامان لیکن اس میں تو ایک عقلمند آدمی نہیں پائے گا۔ کاش کہ معاملہ اس کے برعکس ہوتا۔ وہ شہر آدمی کا وجود ہے۔ اگر اس میں سو ہزار ہنر ہوں اور یہ بات نہ ہو تو اس شہر کا برباد ہو جانا ہی بہتر ہے اور اگر وہ بات ہے مگر ظاہری آرائش نہیں ہے۔ اس صورت میں چاہیے کہ شہر آباد رہے۔ آدمی جس حالت میں بھی ہو اس کا دل خدا میں مشغول ہوتا ہے اور اس کے وہ ظاہری اشغال اس کے باطن میں مشغول ہونے کے مانع نہیں ہیں۔ یہ ایسا ہے کہ ایک حاملہ عورت خواہ کسی حالت میں ہو۔ وہ صلح میں، جنگ میں، کھانے میں یا سونے میں مصروف ہو اس کے پیٹ میں بچہ بڑھتا رہتا ہے اور قوت و حواس حاصل کرتا جاتا ہے۔ لیکن ماں کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ آدمی بھی اس سرّ کا حامل ہے اور

حملها الانسان انهٗ کان ظلومًا جهُولاً۔ (سورۂ احزاب : ع ۹)

انسان نے (وہ بوجھ جس کے اٹھانے سے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے انکار کر دیا) اسے اٹھا لیا۔ بیشک وہ اپنے حق میں ظالم اور جاہل تھا۔

بے شک خداوند تعالیٰ اسے ظلم اور جہالت میں نہیں چھوڑتا۔ آدمی کی شکل و صورت پر گمان کرتے ہوئے رفاقت، موافقت اور ہزار آشنائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ سرّ جس کا انسان حامل ہے کچھ تعجب نہیں کہ اس سے کئی دوست اور آشنا پیدا ہوں تاکہ ان کی موت کے بعد اس سے کچھ کا کچھ ہو جائے۔ سرّ کو چاہیے کہ وہ آباد ہو اس لیے کہ سرّ درخت کی جڑ کی طرح ہے اگرچہ جڑ چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کا اثر شاخسار پر نمایاں ہوتا ہے۔ اگر شاخ ٹوٹ جائے تو جڑ چونکہ مستحکم ہے۔ وہ دوبارہ اگ آتی ہے۔ ہاں جڑ میں خلل

آجائے تو نہ شاخ باقی رہتی ہے اور نہ پتے۔

خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

السلام علیك ایها النبی. اے نبی تجھ پر سلام۔

یعنی کہ تجھ پر اور ہر کسی پر جو تیری جنس سے ہے، سلامتی ہو اور اگر خداوند تعالیٰ کی غرض یہ نہ ہوتی تو مصطفیٰ مخالفت نہ کرتے اور نہ فرماتے کہ

علینا وعلی عباد الله الصالحین. ہم پر اور اللہ کے صالح بندوں پر سلام۔

اس لیے کہ اگر سلام مخصوص ہوتا تو اس پر صالح بندوں کا اضافہ نہ کرتے۔ یعنی جو سلام تو نے مجھ پر بھیجا وہ مجھ پر اور میری جنس پر، جو صالح بندے ہیں، ہوا اسی طرح۔ مصطفیٰ نے وضو کرتے ہوئے فرمایا اس وضو کے بغیر نماز صحیح نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ کسی کی نماز صحیح نہیں۔ کیونکہ صحت نماز کے لیے حضور کا وضو شرط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس قسم کا وضو نہیں کرتا اس کی نماز صحیح نہیں ہوتی۔ اسی طرح کہہ دیتے ہیں کہ یہ تختہ گلنار ہے۔ اس کے کیا معنی؟ یعنی کہ گلنار صرف یہی ہے؟ نہیں۔ بلکہ یہ کہ یہ تختہ گلنار کی قسم میں سے ہے۔

ایک دہقان شہر میں آیا اور ایک شہری کا مہمان ہوا۔ شہری اس کے لیے حلوا لایا۔ دہقان بھوکا تھا، خوب کھایا۔ بولا اے شہری! میں نے رات دن گاجر کھانا سیکھا تھا۔ اس گھڑی میں نے حلوے کا لقمہ کھایا تو گاجر کا مزا نظر سے گر گیا۔ وہاں مجھے حلوا نہیں ملا کرے گا اور جو کچھ مجھے میسر تھا، اس سے میرا دل سرد ہو گیا۔ کیا علاج کروں! دہقان نے جب ایک دفعہ حلوا چکھ لیا تو شہر میں ہی رہ پڑا۔ اس لیے کہ شہری نے اس کا دل موہ لیا تھا۔ ناچار اس نے دل کی پیروی کی۔

بعض لوگ ہیں کہ جب وہ سلام کرتے ہیں تو ان کے سلام سے دھوئیں کی بو

آتی ہے اور بعض ایسے ہیں کہ وہ سلام کرتے ہیں تو اس سے بوئے مشک آتی ہے۔ یہ جسے ملیں اس کے مشام ہونے چاہئیں۔ دوست کا امتحان کرنا چاہیے تاکہ بعد میں پشیمانی نہ ہو۔ خدا کی سنت یہ ہے:

ابتدأ بنفسك. اپنے نفس (کی اصلاح) سے ابتدا کر

نفس بھی اگر بندگی کا دعویٰ کرے تو اس کا امتحان لیے بغیر اس کا دعویٰ تسلیم نہ کر۔ وضو کرتے وقت ناک میں پانی ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد چکھتے ہیں۔ صرف دیکھنے پر ہی قناعت نہیں کرتے۔ یعنی ہوسکتا ہے کہ ظاہرا طور پر پانی ٹھیک ہو مگر اس کی لذت اور بو متغیر ہوگئی ہو۔ یہ امتحان ہے پانی کی صحت کا۔ اس امتحان کے بعد پانی منہ پر ڈالتے ہیں۔ تیرے دل میں جو نیک اور بد چھپا ہوا ہے۔ خداوند تعالےٰ اسے تیری صورت پر نمایاں کردیتا ہے۔ درخت کی جڑ چھپ کر جو کچھ کھاتی ہے اس کا اثر شاخوں اور پتوں پر نمایاں ہوجاتا ہے:

سیماهم فی وجوههم من اثر السجود. (سورہ فتح: ع ۴) ان کی پیشانیوں پر سجدہ کے نشان سے گٹے پڑے ہوئے ہیں۔

اور خداوند تعالیٰ کا قول ہے:

سنسمهٗ علی الخرطوم. (سورہ قلم: ع ۱) ہم اس کی ناک پر داغ لگائیں گے۔

اگر ہر کسی کو تیرے چہرہ ہی سے تیرے ضمیر کا پتہ نہیں لگ جاتا تو اپنے چہرے کے رنگ کو کیا کرے گا۔

ایک عجیب طلب

سب چیزوں کو جب تک تُو ڈھونڈے نہیں، تجھے نہیں ملتیں، سوائے اس

دوست کے کہ جب تک وہ تجھے ملتا نہیں تو اسے ڈھونڈتا نہیں ہے۔ آدمی کی طلب یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ اسے میسر نہ ہو وہ اسے مانگتا ہے۔ اور رات دن اس کی جستجو میں رہتا ہے۔ کسی کی طلب پوری ہو چکی ہو اور مقصود حاصل ہو گیا ہو۔ مگر پھر بھی وہ اس کا طالب ہی ہو۔ یہ عجیب بات ہے۔ ایسی طلب آدمی کے وہم میں نہیں سماتی اور بشر اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ اس کی ہر طلب ایک نئی چیز کے لیے ہوتی ہے جو اسے نہ ملی ہو اور یہ جو اس چیز کی طلب ہے جو مل گئی ہو، یہ خدا کی طلب ہے۔ اس لیے کہ خداوند تعالیٰ کو سب چیزیں میسر ہیں اور سب چیزیں اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں کہ :

کن فیکون. الواحد الماجد. واحد وہ ہے جسے سب چیزیں میسر ہوں۔

خداوند ہے، مگر اس کے باوجود وہ طالب ہے کہ :

هو الطّالب والغالب وہ طالب ہے اور غالب ہے۔

پس اس سے مقصود یہ ہے کہ اے آدمی! تو جس قدر اس کی طلب کرتا ہے، جو حادث ہے اور یہ آدمی کا وصف ہے، اتنا ہی تو مقصود سے دور رہتا ہے۔

اعتقاد اور دلیل

ایک آدمی نے کہا ہمارے پاس کوئی قاطع دلیل نہیں ہے کہ خدا کا دوست اور خدا سے واصل کون ہے۔ قول، فعل اور کرامات اور کوئی دوسری چیز اس پر دلیل قاطع نہیں۔ اس لیے کہ ہو سکتا ہے قول سکھایا ہوا ہو۔ اور راہبوں کے فعل اور کرامات کا بھی یہی حال ہے۔ یہ دل کی بات نجوم کے قواعد سے بتاتے ہیں۔ اور جادو کے طور پر انہوں نے بہت سے عجائبات کا اظہار کیا ہے۔ اور اس جنس کو شمار کیا ہے۔ فرمایا کیا تو کسی کا معتقد ہے یا

نہیں؟ کہا خدا کی قسم میں معتقد ہوں اور عاشق ہوں۔ فرمایا، اس پر تیرا اعتقاد کسی دلیل یا نشانی پر مبنی تھا یا اسے یونہی پکڑ لیا اور اپنی آنکھوں پر بٹھایا؟ کہا خدا نہ کرے، بغیر دلیل اور نشانی کے ہو۔ فرمایا تو کیوں کہتا ہے کہ اعتقاد پر کوئی دلیل نہیں ہے اور کوئی نشانی نہیں ہے۔ اور تو نے متناقض بات کہی۔

ولی کا اپنے متعلق خیال

ایک آدمی[1] نے کہا، ہر ولی اور ہر بزرگ کو یہ گمان ہوتا ہے کہ خدا سے جو قُرب مجھے حاصل ہے کسی اور کو حاصل نہیں، اور خدا کی وہ عنایت جو مجھ پر ہے، کسی دوسرے پر نہیں۔ فرمایا، یہ خبر کس نے دی؟ ولی نے یا غیر ولی نے؟ اگر یہ خبر ولی نے دی تو جیسا کہ وہ جانتا ہے، ہر ولی کا اپنے حق میں یہی اعتقاد ہوتا ہے۔ اس لیے یہ عنایت اس سے مخصوص نہ ہو گئی ہو گی۔ اور اگر یہ خبر کسی غیر ولی نے دی تو وہ فی الحقیقت ولی ہے اور خدا کا خاص مقرب ہے، کیونکہ خداوند تعالیٰ نے یہ راز تمام اولیاء سے چھپایا مگر اس سے مخفی نہ رکھا۔ اس آدمی نے ایک مثال بیان کی کہ ایک بادشاہ کی دس لونڈیاں تھیں۔ ان سب لونڈیوں نے کہا ہم چاہتی ہیں یہ معلوم کریں کہ بادشاہ کے نزدیک ہم میں سے محبوب ترین لونڈی کون ہے؟ بادشاہ نے فرمایا کہ کل یہ انگوٹھی جس کے گھر میں ہو گی، وہی محبوب ترین لونڈی ہو گی۔ دوسرے دن بادشاہ نے فرمایا، اس انگوٹھی جیسی دس انگوٹھیاں بنائی جائیں اور اس نے ہر لونڈی کو (چپکے سے) ایک انگوٹھی دے دی۔ فرمایا کہ سوال ابھی تک اپنی جگہ پر قائم ہے اور یہ جواب نہیں ہے۔ اور اس سے تعلق نہیں رُکتا۔ یہ خبر ان دس لونڈیوں میں سے ایک نے بتائی کہ بادشاہ نے دس انگوٹھیاں بنوا کر ہر لونڈی کو ایک انگوٹھی دے دی۔ یا

---

[1] شیخ صدر الدین۔

ان دس لونڈیوں کے علاوہ کسی نے؟ اگر ان دس لونڈیوں میں سے کسی ایک لونڈی نے بتائی تو اس نے سمجھ لیا کہ جب یہ انگوٹھی اس سے مخصوص نہیں ہے اور ہر لونڈی کے پاس ویسی انگوٹھی ہے تو بادشاہ کا خاص رجحان اس کی طرف نہیں۔ اور وہ محبوب ترین لونڈی نہیں۔ اگر یہ خبر ان دس لونڈیوں کے علاوہ کسی اور نے بتائی ہے تو وہ خود بادشاہ کی خاص اور محبوب ترین لونڈی ہے۔

وہی ہونا چاہیے جو معشوق چاہے

ایک آدمی نے کہا کہ عاشق کو ذلیل و خوار اور متحمل ہونا چاہیے، اور اس کے یہی اوصاف شمار ہوتے ہیں۔ فرمایا عاشق کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ خواہ اسے معشوق چاہے یا نہ چاہے۔ اگر وہ معشوق کی مراد کے خلاف ہے تو وہ عاشق نہیں ہے۔ وہ اپنی مراد کے پیچھے ہے۔ اور اگر وہ معشوق کی مراد چاہتا ہے اور معشوق نہ چاہے کہ وہ ذلیل و خوار ہو تو وہ کیونکر ذلیل و خوار ہو گا؟ پس معلوم ہوا کہ عاشق کی حالت معلوم نہیں ہوتی جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا معشوق اس کے لیے کیا چاہتا ہے۔ عیسیٰؑ نے فرمایا کہ :

عجبت من الحیوانِ کیف یاکل الحیوان	مجھے حیوان پر تعجب آتا ہے کہ وہ حیوان کو کیسے کھا لیتا ہے!

اہلِ ظاہر کہتے ہیں کہ آدمی حیوان کا گوشت کھاتا ہے اور یہ دونوں حیوان ہیں۔ یہ غلطی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ آدمی گوشت کھاتا ہے اور گوشت حیوان نہیں ہے، جمادات ہے۔ جب حیوان کو مار دیا گیا تو اس میں حیوانیت نہ رہی۔ البتہ اس سے غرض یہ ہے کہ شیخ مرید کو نگل جائے۔ یہ ایک بے مثال بات ہے۔ ایسے عجیب کام پر مجھے تعجب ہے۔

ایک دلیل کی تشریح

ایک آدمی نے سوال کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود سے کہا، میرا خدا مردے کو زندہ کرتا ہے اور زندہ کو مردہ بنا دیتا ہے۔ نمرود نے کہا، میں بھی کسی کو معزول کر دیتا ہوں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ میں نے اسے مار دیا۔ اور کسی کو میں منصب دے دیتا ہوں۔ یہ ایسا ہے کہ میں نے اسے زندہ کر دیا۔ اس وقت حضرت ابراہیمؑ نے اس دلیل سے گریز کیا اور دوسرا الزامی جواب دیا کہ میرا خدا آفتاب کو مشرق سے لاتا اور مغرب کو لے جاتا ہے، تُو اس کے برعکس کر کے دکھا۔ یہ بات ظاہریت کے لحاظ سے اس کے مطالف ہے۔ فرمایا حاشا کہ حضرت ابراہیمؑ نمرود کی دلیل سے زچ نہیں ہوئے۔ بلکہ یہ بات ایک دوسری مثال سے متعلق ہے۔ یعنی خداوند تعالیٰ اس بچے کو جو ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے، مشرقِ رحم سے باہر لاتا ہے اور مغربِ گور میں لے جاتا ہے۔ پس حضرت ابراہیمؑ کی دلیل ایک ہی بات ہے۔ خداوند تعالیٰ آدمی کو ہر لحظہ نئے سرے سے پیدا کرتا ہے اور اس کے باطن میں دوسری تازہ تازہ چیزیں بھیجتا ہے۔ پہلا دوسرے سے نہیں رہتا اور دوسرا تیسرے سے نہیں رہتا۔ ہاں وہ اپنے آپ سے بے خبر ہے اور اپنے آپ کو نہیں پہچانتا۔

سلطان محمود رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک بحری گھوڑا لائے۔ بہت خوبصورت اور نادر قسم کا تھا۔ عید کے دن محمود اس پر سوار ہوا۔ سب خلقت چھتوں پر بیٹھی یہ منظر دیکھ رہی تھی اور لطف اٹھا رہی تھی۔ ایک مست آدمی اپنے گھر کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ لوگ زبردستی اسے چھت پر لے آئے کہ تو بھی آ تاکہ بحری گھوڑے کو دیکھے۔ بولا میں اپنے آپ میں مشغول ہوں، میں بحری گھوڑے کا نظارہ نہیں چاہتا۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ مختصر یہ کہ وہ مجبور کیا گیا۔ جب وہ چھت پر آیا تو بہت سرمست تھا۔ سلطان محمود گھوڑے

پر سوار گزرا۔ مست آدمی نے سلطان کو گھوڑے پر دیکھا تو بولا میرے نزدیک اس گھوڑے کی کیا حقیقت ہے؟ اگر میری اس حالت میں مطرب مجھے کوئی ترانہ سنائے اور وہ گھوڑا میری ملکیت ہو تو میں اسے فوراً بخش دوں۔ جب بادشاہ کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو وہ خشمگیں ہوا۔ فرمایا اسے زندان میں محبوس کردیا جائے۔ اس پر ایک ہفتہ گذر گیا۔ اس آدمی نے سلطان کے پاس کسی آدمی کو بھیجا کہ آخر میرا کیا گناہ اور کیا جرم ہے؟ بادشاہ سلامت فرمائیں تاکہ غلام کو معلوم ہو۔ سلطان نے فرمایا اسے حاضر کیا جائے۔ کہا اے رندِ بے ادب! وہ بات تو نے کیسے کہی؟ اور تجھے کیسے یہ جرات ہوئی؟ کہا اے بادشاہ عالم! وہ بات میں نے نہیں کہی۔ اس لحظہ ایک مست آدمی چھت کے کنارے پر کھڑا تھا۔ اس نے وہ بات کہی اور چل دیا۔ اس گھڑی میں وہ آدمی نہیں ہوں۔ میں عقلمند اور ہوشیار آدمی ہوں۔ بادشاہ کو یہ بات بہت پسند آئی۔ اسے خلعت دی اور اپنی قید سے اس کی رہائی فرمائی۔ جس کسی نے تجھ سے تعلق پیدا کیا اور اس شراب سے مست ہوا وہ کہیں جائے اور کسی کے ساتھ بیٹھے اور کسی قوم سے صحبت رکھے، در حقیقت وہ ہمارا ہمنشیں ہے اور وہ اس جنس سے ملتا ہے۔ کیونکہ اغیار کی صحبتِ یار کے لطفِ صحبت کے آئینہ ہے اور غیر جنس سے ملنا اپنی جنس سے محبت اور اختلاط کا موجب ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے شکر کا نام امی رکھ چھوڑا تھا یعنی وہ شیرینی جو انہیں ماں کے پیٹ سے حاصل ہوئی۔ اب دوسرے پھل شکر سے نخوت کرتے ہیں کہ ہم اتنی تلخی سے گزر کر شیرینی کی منزل تک پہنچے ہیں۔ تو شیرینی کی لذت کیا جانے کیونکہ تو نے تلخی کی زحمت نہیں اٹھائی۔

یگانگیٔ محض کا عالم

اس شعر کی تفسیر کے لیے لوگوں نے سوال کیا۔

ولیکن ہوا چوں بغایت رسید
شود دوستی سربسر دشمنی

(جب آرزو انتہا کو پہنچ جائے تو دوستی بالکل دشمنی بن جاتی ہے)

فرمایا کہ عالمِ دوستی کی نسبت عالم دشمنی تنگ ہے۔ اس لیے کہ عالم دشمنی سے لوگ بھاگتے ہیں تاکہ عالم دوستی میں پہنچ جائیں اور عالمِ دوستی بھی تنگ ہے۔ اس عالم کی نسبت جس سے دوستی اور دشمنی معرضِ ہستی میں آتی ہیں۔ اس لیے کہ کفر انکار ہے اور منکر کے لیے ضروری ہے کہ اس کے لیے کوئی ہستی ہو جس کا وہ انکار کرے۔ اسی طرح اقرار کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہو جس کا وہ اقرار کرے۔ پس معلوم ہوا کہ یگانگی اور بیگانگی دوئی کا موجب ہیں اور وہ عالمِ کفر اور ایمان دوستی اور دشمنی سے ورا ہے اور جب دوستی دوئی کا باعث ہوئی اور وہ عالم موجود ہے جہاں دوئی نہیں، یگانگی محض ہے۔ جب وہاں پہنچے تو دوستی اور دشمنی سے باہر آگئے کیونکہ وہاں ان دو کے لیے گنجائش نہیں۔ پس جب وہاں پہنچے تو دوئی سے جدا ہو گئے۔ پس وہ پہلا عالم جو دوئی تھا، وہ عشق اور دوستی ہے۔ وہ اس عالم کے مقابلہ میں جس کو ابھی بیان کیا گیا ہے فروتر ہے۔ لہٰذا وہ اسے نہیں چاہتا اور اسے دشمن سمجھتا ہے جیسے منصور کی دوستی جب حق سے انتہا کو پہنچ گئی تو وہ خود اپنا دشمن بن گیا اور اپنے آپ کو نیست بنا ڈالا۔ کہا انا الحق۔ میں خدا ہوں، یعنی میں فنا ہو گیا، حق رہ گیا اور بس۔ اور یہ انتہائی عاجزی اور انتہائی بندگی ہے۔ یعنی وہ ہے اور بس۔ دعویٰ اور تکبر یہ ہے کہ تو کہے تو خدا ہے اور میں بندہ ہوں۔ اس طرح گویا تو نے اپنی ہستی کو بھی قائم رکھا، اس سے دوئی لازم آئی۔ یہ جو تو کہتا ہے ھو الحق۔ وہ خدا ہے۔ یہ بھی دوئی ہے اس لیے کہ جب تک انا (میں) نہ ہو ھو (وہ) ممکن نہیں ہوتا۔ پس حق نے کہا انا الحق۔ میں خدا ہوں۔ چونکہ اس کے سوا کوئی موجود نہ تھا اور منصور فنا ہو چکا تھا۔ وہ سخن خدا کا تھا۔

عالمِ مصورات اور عالمِ محسوسات کی نسبت عالمِ خیال فراخ تر ہے۔ اس لیے کہ سب مصورات خیال سے جنم لیتے ہیں اور اس عالم کی نسبت جس سے خیال معرضِ ہستی میں آتا ہے۔ عالمِ خیال بھی تنگ ہے۔ ازروئے سخن اسی قدر سمجھ میں آتا ہے ورنہ ناممکن ہے کہ لفظ اور عبارت سے حقیقتِ معنی معلوم ہو۔

سخن کی افادی حیثیت

سوال کیا کہ عبارت اور الفاظ کا کیا فائدہ ہے؟ فرمایا سخن کا یہ فائدہ ہے کہ یہ تجھ میں طلب اور ہیجان پیدا کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ سخن سے مطلوب حاصل ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اتنے مجاہدہ اور اتنی فنا کی حاجت نہ ہوتی۔ سخن ایسا ہے جیسے تُو دور سے کوئی چیز ہلتی ہوئی دیکھتا ہے تو اس کے پیچھے بھاگتا ہے تاکہ اسے تو دیکھے، نہ یہ کہ تو اس کے تحرک کے واسطہ سے اسے دیکھتا ہے۔ باطن میں آدمی کا ناطقہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس معنی کی طلب کے لیے وہ تجھ میں ہیجان پیدا کرنے والا ہے، اور اگرچہ حقیقت میں تو اسے نہیں دیکھتا۔

ایک آدمی نے کہا میں نے اس قدر تحصیل علوم اور ضبطِ معانی کیا لیکن یہ کچھ معلوم نہ ہوا کہ انسان میں وہ معنی کہاں ہے جو باقی رہے گا۔ مجھے اس معنی کا راستہ نہیں ملا۔ فرمایا کہ اگر تنہا سخن سے وہ معلوم ہو جائے تو انسان اپنی فنا کے وجود کا محتاج نہ رہے اور اتنی تکلیفیں اٹھانے کی اسے حاجت نہ ہو۔ تجھے اتنی کوشش کرنی چاہیے کہ تو باقی نہ رہے تاکہ تو اس چیز کو سمجھ سکے جو باقی رہے گی۔ ایک شخص کہتا ہے، میں نے سنا ہے کہ کوئی کعبہ ہے لیکن میں جتنا دیکھتا ہوں کعبہ نظر نہیں آتا۔ میں چھت پر جاتا ہوں وہاں سے کعبہ کو دیکھتا ہوں۔ جب وہ چھت پر جاتا ہے تو گردن لمبی کر کے کعبہ کو دیکھتا ہے تو کعبہ نظر نہیں آتا۔

وہ کعبہ کا منکر ہوجاتا ہے۔ کعبہ کی دید تنہا اس سے حاصل نہیں ہوتی۔ کعبہ اپنی جگہ پر رہ کر نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ سردی کے موسم میں پوستین کو جان کی طرح عزیز سمجھ کر طلب کیا جاتا ہے لیکن جب گرمی کا موسم آجائے تو اسے اتار کر پھینک دیا جاتا ہے اور طبیعت اس سے متنفر ہوجاتی ہے۔ اب پوستین طلب کرنا گرمی کی خاطر تھا۔ اس لیے کہ سرما میں تو گرمی کا عاشق تھا۔ اس لیے تو نے گرمی کو روکنے والی کوئی چیز نہ پائی اور پوستین کے ذریعہ کا محتاج ہوا لیکن سردی کے روکنے والے ذریعہ کی ضرورت نہ رہی تو تو نے پوستین اتار پھینکی۔

اذا السمآءُ انشقت. (الشقاق : ع ۱) جب آسمان پھٹ جائے۔

اذا زلزلت الارضُ زلزالها. (زلزال : ع ۱) جب زمین بھونچال سے کانپنے لگے۔

اشارہ تجھ سے ہے یعنی تو نے اجتماع کی لذت دیکھی۔ اب کوئی دن آتا ہے کہ تو ان اجزاء کا افتراق دیکھے گا اور اس عالم کی فراخی کا مشاہدہ کرے گا اور اس تنگنائے سے تیری خلاصی ہوگی۔ مثلاً ایک شخص کو چار میخوں سے مقید کردیا گیا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس حالت میں وہ اچھا ہے اور آزادی کی لذت کو بھول گیا۔ جب اسے چار میخوں سے رہائی دی جائے تو اسے سمجھ آتی ہے کہ وہ کس عذاب میں مبتلا تھا۔ اسی طرح بچوں کی پرورش اور آسائش گہوارہ میں ہوتی ہے۔ اس وقت ان کے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں۔ اگر کسی بالغ کو گہوارہ میں مقید کردیں تو یہ اس کے لیے عذاب اور اسیری ہوگی۔ بعض لوگوں کو اس میں مزا آتا ہے کہ پھول کھلیں اور سر کو غنچوں سے باہر نکالیں اور بعض لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ سب اجزائے کُل متفرق ہوجائیں اور اپنے اصل سے پیوند ہوجائیں۔ اب بعض لوگ چاہتے ہیں کہ کوئی دوستی، عشق، محبت، کفر باقی نہ رہے تاکہ وہ اپنے اصل سے پیوند ہوجائیں۔ اس لیے کہ یہ سب دیواریں ہیں جو تنگی اور دوئی کی موجب ہیں۔ وہ عالم فراخی اور وحدتِ

مطلق کا موجب ہے۔ وہ سخن خود کچھ اتنا بڑا نہیں اور اس میں کوئی قوت نہیں۔ وہ کس طرح بڑا ہو؟ آخر سخن ہی تو ہے بلکہ وہ تو خود ضعف کا موجب ہے۔ وہ حق کو متاثر کرنے والا اور حق کو جوش میں لانے والا ہے۔ یہ اس کے درمیان روپوش ہے۔ دو تین حرف کی ترکیب کیا موجبِ حیات و ہیجان ہو گی؟ مثلاً تیرے سامنے کوئی شخص آیا۔ تو نے اس سے اچھا سلوک کیا اور اسے خوش آمدید کہا۔ اس سے وہ خوش ہوا اور یہ محبت کا باعث ہوا۔ ایک شخص کو تُو نے دو تین گالیاں دے دیں۔ وہ دو تین لفظ غصے اور رنج کا باعث بن گئے۔ اب دو تین لفظ کی ترکیب زیادتیٔ محبت، رضا، غصہ، خصومت کو بھڑکانے سے کیا تعلق رکھتی ہے؟ سوائے اس کے کہ خداوند تعالیٰ نے ان الفاظ کو پردہ بنا دیا ہے تاکہ کسی کی نظر اس کے جمال اور کمال پر نہ پڑے۔ ضعیف نظر کے لیے ضعیف پردے ہیں۔ وہ پردوں کے پیچھے سے حکم صادر کرتا ہے اور اسباب بناتا ہے۔ اور یہ روٹی دراصل زندگی کا سبب نہیں ہے۔ البتہ خداوند تعالیٰ نے اسے حیات و قوت کا سبب بنایا ہے۔ روٹی آخر جمادات ہے۔ کیونکہ اس میں حیاتِ انسانی نہیں۔ بھلا وہ زیادتیٔ قوت کا باعث کیا ہو گی! اگر اس میں زندگی ہوتی تو وہ اپنے آپ کو زندہ رکھتی۔

نطق ایک آفتاب ہے

اس شعر کے معنی پوچھے گئے۔

اے برادر تو ہماں اندیشۂ
ما بقی تو استخوان و ریشۂ

فرمایا تو اس معنی پر نظر کر کہ سب اندیشے اس مخصوص فکر کا اشارہ ہیں اور ہم نے اس کو وسعت کی خاطر تعبیر کیا ہے۔ ورنہ درحقیقت وہ اندیشہ نہیں ہے۔ لفظ

"اندیشہ" سے ہماری مراد یہ معنی تھا اور اگر کوئی شخص عوام کو سمجھانے کے لیے اس معنی کی تاویل کرنی چاہے تو کہہ دے :

الانسان حیوان ناطق. انسان حیوان ناطق ہے۔

اور نطق اندیشہ ہے۔ خواہ وہ چھپا ہوا ہو اور خواہ ظاہر ہو اور اس کے بغیر وہ حیوان ہوتا ہے۔ پس یہ صحیح ہے کہ انسان عبارت ہے اندیشہ سے، باقی ہڈی اور پٹھا ہے۔ کلام آفتاب کی طرح ہے۔ تمام انسان اس سے گرم اور زندہ ہیں اور آفتاب دائمی ہے اور موجود ہے اور حاضر ہے اور سب اس سے ہمیشہ گرم ہیں۔ البتہ آفتاب نظر نہیں آتا اور وہ نہیں جانتے کہ اس سے زندہ ہیں اور گرم ہیں۔ لیکن جب لفظ اور عبارت کے ذریعہ سے شکریہ ادا کیا جائے، شکایت کی جائے، یا خیر اور شر کا اظہار کیا جائے تو آفتاب نظر آجاتا ہے۔ جس طرح آفتاب فلکی ہے کہ ہمیشہ روشن ہے لیکن نظر نہیں آتا جب تک اس کی شعاع دیوار کو روشن نہیں کردیتی۔ اسی طرح جب تک حرف اور آواز کا ذریعہ نہ ہو، آفتابِ سخن کی شعاع پیدا نہیں ہوتی۔ اگرچہ وہ دائماً موجود ہے۔ اس لیے کہ آفتاب لطیف ہے۔

هو اللطيف. وہ لطیف ہے۔

کثافت چاہیے تاکہ اس کثافت کے ذریعہ سے وہ نظر آئے اور ظاہر ہو۔ ایک شخص نے کہا۔ خدا نے اسے کوئی معنی نہیں دکھائے اور خیرہ اور افسردہ رہا۔ جیسا کہتے ہیں خدا نے ایسا کیا اور ایسے فرمایا اور یوں منع کیا، گرم ہوا اور دیکھا۔ پس لطافتِ حق اگرچہ موجود تھی اور اس پر تاباں ہوئی مگر نظر نہ آئی۔ جب تک اس کے امر، نہی، خلق، قدرت سے اس کی شرح نہ کریں، اسے دیکھا نہیں جاسکتا۔ بعض لوگ ہیں جن کے پاس ضعف کی وجہ سے شہد کی طاقت نہیں، تاکہ اس کے ذریعہ کھانا مثلاً زردہ، حلوہ وغیرہ کھا سکیں، تاکہ قوت ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ شہد کو بلا واسطہ کھا سکیں۔ پس ہم نے سمجھ لیا کہ نطق

ایک آفتاب ہے جو لطیف ہے اور ہمیشہ روشن ہے۔ اس کی روشنی کبھی منقطع نہیں ہوتی۔ البتہ تو کثیف ذریعہ کا محتاج ہے، تاکہ آفتاب کی شعاع کو دیکھ سکے اور اس کا مزا اٹھا سکے۔ جب تو اس مقام پر پہنچ جائے کہ لطافت کو کثافت کے بغیر دیکھ لے اور تو اس کا عادی ہوجائے اور اس کے دیکھنے میں دلیر ہوجائے اور تو قوت پکڑلے، تو اس وقت تو اس دریا کے عین درمیان میں ہوگا اور عجیب رنگ اور عجیب تماشے دیکھے گا۔ اور تجھے تعجب ہوگا کہ وہ نطق تجھ میں ہمیشہ کے لیے ہے، خواہ تو بولے اور خواہ نہ بولے اور اگرچہ تیرے اندیشہ میں بھی نطق نہ ہو۔ اس گھڑی ہم کہتے ہیں کہ نطق ہمیشہ کے لیے ہے۔ اسی طرح کہتے ہیں: "الانسان حیوان ناطق"۔

یہ حیوانیت تجھ میں دائمی ہے۔ جب تک زندہ حیوانیت تجھ میں ہے، اسی طرح لازم آتا ہے کہ نطق بھی تیرے ساتھ دائمی ہو۔ اسی طرح چبانا ظہور انسانیت کا موجب ہے۔ انسانیت کی شرط نہیں۔ پھر اسی طرح بات کرنا اور شور مچانا نطق کا موجب ہے۔ نطق کی شرط نہیں۔

وہ حضوری اور غیبت سے متصف نہیں

آدمی تین حالتیں رکھتا ہے۔ اس کی پہلی حالت یہ ہے کہ وہ خدا کے گرد نہیں گھومتا اور سب کی بندگی اور خدمت کرتا ہے۔ زن، مرد، مال، لڑکے، پتھر، مٹی کو پوجتا ہے۔ خدا کی عبادت نہیں کرتا۔ پھر جب اسے معرفت اور آگاہی حاصل ہوتی ہے تو وہ خدا کے سوا کسی کی خدمت نہیں کرتا۔ پھر جب وہ اس حالت سے آگے بڑھتا ہے تو خاموش ہوجاتا ہے۔ وہ نہ کہتا ہے میں خدا کی خدمت نہیں کرتا اور نہ کہتا ہے میں خدا کی خدمت

کرتا ہوں۔ وہ ان دونوں مرتبوں سے باہر جا چکا ہوتا ہے۔ باہر کی دنیا کو اس قسم کے لوگوں کی خبر تک نہیں ہوتی۔ تیرا خدا نہ حاضر ہے اور نہ غائب۔ وہ ان دونوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ یعنی حضور اور غائب کو وہی پیدا کرتا ہے۔ پس وہ ان دونوں کے علاوہ ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ حاضر ہے تو چاہیے کہ غائب نہ ہو۔ مگر وہ غائب ہے اور حاضر بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضوری کے پاس غیبت ہے۔ پس وہ حضوری اور غیبت سے متصف نہیں۔ ورنہ لازم آتا ہے کہ ضد سے ضد پیدا ہو۔ اس لیے کہ غیبت کی حالت میں لازم آتا کہ اس نے حضوری کو پیدا کیا ہو اور حضوری ضد ہے غیبت کی۔ اور اسی طرح غیبت کے معاملہ میں۔ پس ضروری نہیں کہ ضد سے ضد پیدا ہو اور ضروری نہیں کہ خدا اپنی مثل پیدا کرے۔ اس لیے کہ کہتے ہیں :

لانحو لهٗ. جس کا کوئی مدِ مقابل نہیں ہے۔

اس لیے کہ اگر یہ ممکن ہوتا کہ مثل، مثل کو پیدا کرے تو بغیر مرجح کے ترجیح لازم آتی، اور یہ بھی لازم آتا کہ :

الشیء نفسه. ایک شے خود اپنے آپ کو وجود میں لاتی ہے۔

اور یہ دونوں ناممکن ہیں۔ جب تو اس جگہ پہنچ جائے تو کھڑا ہو جا اور دخل نہ دے۔ عقل کو بھی اس مقام پر مجال تصرف نہیں ہوتی۔ جب دریا کے کنارے پہنچتی ہے تو کھڑی ہو جاتی ہے۔ تمام باتیں، تمام علوم، تمام ہنر اور تمام حرفت میں اسی بات کی توجہ سے لطف اور چاشنی پیدا ہوتی ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو کسی کام، کسی حرفت میں مزا باقی نہ رہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ لوگ اس حقیقت کو جانتے نہیں اور نہ اس کا جاننا شرط ہے۔ یہ اسی طرح ہے کہ کوئی مرد ایسی عورت کو چاہے جو مالدار ہو اور جس کے پاس بھیڑیں ہوں اور گھوڑوں کی ڈاریں ہوں اور یہ مرد ان گھوڑوں اور بھیڑوں کی دیکھ بھال کرے۔

ہو لور باغ کو پانی دیتا ہو۔ اگرچہ وہ ان خدمتوں میں مصروف ہے۔ لیکن ان مصروفیتوں کا مزا اس عورت کے وجود میں ملتا ہے۔ اگر درمیان سے عورت اٹھ جائے تو کوئی مزا باقی نہ رہے لور شوق ٹھنڈا پڑ جائے لور مصروفیت میں جان باقی نہ رہے۔ اسی طرح دنیا کی تمام حرفتیں لور علوم، زندگی، خوشی، رونق عارف کے پر تو ذوق سے ہیں کیونکہ اگر اس کا ذوق نہ ہو لور اس کا وجود ان تمام مصروفیتوں میں ذوق لور لذت نہ پائے تو سب کچھ مردہ ہو جائے۔

انسان افعال کا خالق نہیں

فرمایا پہلے جو ہم نے شعر کہا تو ایک بڑی خواہش تھی جو اس کے کہنے کا موجب تھی۔ اس وقت اس میں اثر تھا۔ اس گھڑی خواہش ست ہو چکی ہے لور روبہ زوال ہے۔ اس وقت بھی اس میں اثر ہے۔ خداوند تعالیٰ کی سنت ایسی ہے کہ وہ ہر چیز کی ابتدا کے وقت اس کی تربیت فرماتا ہے لور اس سے بہت بڑا اثر لور بڑی حکمت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے زوال کے وقت بھی یہ تربیت قائم ہوتی ہے۔

رب المشرق والمغرب۔ مشرق لور مغرب کا رب۔

یعنی

یربی الزواعی الشارقة والغاربة۔ رب المشرق والمغرب کے معنی یہ ہیں کہ وہ طلوع لور غروب ہونے والے اسباب کی تربیت کرتا ہے۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ افعال کا خالق بندہ ہے لور ہر فعل جو اس سے صادر ہوتا ہے، بندہ اس کا خالق ہے۔ مناسب نہیں کہ ایسا ہو۔ اس لیے کہ وہ فعل جو اس سے صادر ہوتا ہے یا اس آلہ کے ذریعہ سے جو وہ رکھتا ہے، مثلاً عقل، روح، قوت، جسم یا ذریعہ کے بغیر

ہی مناسب نہیں کہ وہ افعال کا خالق ہو۔ اس لیے کہ وہ ان کی جمعیت پر قادر نہیں ہے۔ پس اس آلہ کے ذریعہ سے وہ خالقِ افعال نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ آلہ اس کا محکوم نہیں اور نامناسب نہیں کہ اس آلہ کے بغیر وہ خالقِ فعل ہو۔ اس لیے کہ ناممکن ہے اس آلہ کے بغیر اس سے فعل سرزد ہو۔ پس علی الاطلاق ہم نے سمجھ لیا کہ خالقِ افعال خدا ہے بندہ نہیں۔ ہر فعل خیر ہو یا شر جو بندہ سے صادر ہوتا ہے، وہ اسے کسی نیت یا دل کے ارادہ سے کرتا ہے لیکن اس کام کی حکمت صرف اسی قدر نہیں ہوتی جو اس کے تصور میں آتی ہے۔ اس قدر معنی، حکمت اور فائدہ جو اس کے اس کام سے ظاہر ہے، اسی قدر تھا کہ اس سے وہ فعل وجود میں آگیا۔ لیکن کلی فائدہ کو خدا ہی جانتا ہے کہ اس سے کیا پھل ملیں گے۔ مثلاً نماز پڑھتا ہے اس نیت سے کہ تجھے ثواب ہو آخرت میں اور نیک نامی اور امان ملے دنیا میں لیکن اس نماز کا فائدہ اسی قدر نہیں ہوگا۔ سو ہزار فائدے ہوں گے جو تیرے وہم میں بھی نہ آئیں۔ ان فائدوں کو خدا جانتا ہے کیونکہ وہ بندے کو اس کام پر لگا رکھتا ہے۔ اب خدا کی قدرت میں انسان کمان کی طرح ہے اور خداوند تعالیٰ اسے کاموں میں استعمال کرتا ہے اور فاعل دراصل خدا ہے نہ کہ کمان۔ کمان آلہ ہے اور ذریعہ ہے۔ لیکن قوام دنیا کے اعتبار سے وہ خدا سے بے خبر اور غافل ہے۔ آفرین ہے اس عظیم کمان کو جو آگاہ ہو کہ میں کس کے ہاتھ میں ہوں۔ میں دنیا کو کیا کہوں۔ کیونکہ اس کا تو قوام اور ستون ہی غفلت ہے۔ اور کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جب کسی کو دنیا سے بیدار کرتے ہیں تو وہ بیزار اور سرد ہو جاتا ہے اور گداز ہو جاتا ہے اور تلف ہو جاتا ہے۔ آدمی نے چھوٹی عمر سے جو نشوونما پائی ہے وہ غفلت ہی کے ذریعے پائی ہے ورنہ وہ ہرگز نہ پھلتا پھولتا اور بڑا ہوتا۔ پس جب وہ غفلت کے ذریعہ سے بڑا ہوا اور پھر خداوند تعالیٰ کی خاطر جبراً اور اختیاراً اس نے مجاہدے کیے اور تکلیفیں برداشت کیں، تاکہ ان غفلتوں کو وہ اس سے دھو ڈالے اور اسے پاک کردے۔ اس کے بعد

وہ اس عالم سے آشنا ہو سکتا ہے۔ آدمی کا وجود مزبلہ کی مثال ہے جو کہ گوبر کا ٹیلہ ہوتا ہے۔ اگر وہ اس گوبر کے ٹیلے کو عزیز رکھتا ہے تو اس وجہ سے کہ اس میں بادشاہ کی انگوٹھی ہے۔ اور آدمی کا وجود گندم کا جوال ہے۔ بادشاہ آواز دیتا ہے کہ تو اس گندم کو کہاں لیے جاتا ہے؟ کہ میرا پیمانہ اس میں ہے۔ وہ پیمانہ سے غافل ہے اور گندم میں غرق ہے۔ اگر پیمانے سے واقف ہوتا تو گندم سے کب التفات کرتا۔ اب ہر اندیشہ جو تجھے عالم علوی کی طرف کھینچتا ہے اور عالم سفلی کی طرف سے سرد اور سُست کرتا ہے، اس پیمانہ کا عکس اور پرتو ہے جو وہ باہر ڈالتا ہے۔ آدمی اس عالم کی طرف میلان کرتا ہے اور جب اس کے برعکس عالم سفلی کی طرف مائل ہوتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ پیمانہ پردہ میں چھپ چکا ہے۔

دوسرے کی تعریف کرنا اپنی تعریف ہے

کہا قاضی عزیز الدین سلام بھیجتا ہے اور ہمیشہ آپ کی مدح و تعریف کرتا ہے۔

فرمایا:

ترجمہ شعر: جو شخص ہمیں نیکی سے یاد کرتا ہے، دنیا میں اس کی یاد نیکی کے ساتھ رہے!

اگر کوئی شخص کسی کے حق میں نیک بات کہتا ہے تو خیر اور نیکی اسی پر لوٹ کر آتی ہے اور در حقیقت وہ مدح اور تعریف اپنے لیے ہی کرتا ہے۔ اس کی نظیر یوں ہے کہ کوئی شخص اپنے گھر میں پھول اور سبزہ بوئے۔ ہر بار جب وہ نظر اٹھائے گا گل و ریحان دیکھے گا۔ وہ ہمیشہ بہشت میں ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے لوگوں کو نیکی سے یاد کرنے کی عادت ہو جائے۔ جب کوئی شخص کسی کی بھلائی میں مصروف ہوا تو وہ اس کا محبوب بن گیا

اور جب اسے اس کی یاد آئی تو اس نے محبوب کو یاد کیا اور محبوب کو یاد میں لانا گل و گلستان ہے اور روح و راحت ہے۔ اور جب کسی نے دوسرے کی برائی کی تو وہ اس کی نظر میں مبغوض ہوا۔ جب وہ اس کو یاد کرتا ہے اور اس کا خیال سامنے لاتا ہے تو ایسا ہے گویا سانپ یا بچھو یا خار و خاک اس کی نظر کے سامنے آگئے۔ اب جبکہ تو رات دن گل و گلستان اور ارض ارم دیکھ سکتا ہے تو خارستان اور مارستان میں کیوں سرگرداں ہے؟ سب سے دوستی رکھ تاکہ ہمیشہ گل و گلستان میں رہے۔ جب تو سب سے دشمنی رکھتا ہے تو دشمنوں کا خیال نظر میں رہتا ہے۔ یہ ایسا ہے کہ تو رات دن خارستان اور مارستان میں سرگرداں رہتا ہے۔ پس اولیا جو سب سے دوستی رکھتے ہیں اور سب میں اچھائی دیکھتے ہیں، وہ کسی غیر کے لیے نہیں کرتے۔ وہ یہ کام خود اپنے لیے کرتے ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کوئی مکروہ اور مبغوض خیال ان کی نظر میں آئے۔ جب اس دنیا میں دوسرے لوگوں کا ذکر اور خیال آنا ناگزیر ہے تو وہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کی یاد اور ان کے ذکر میں محبوب اور مطلوب بات ہی آئے تاکہ کراہت مبغوض ان کے راستہ کو مشوش نہ کردے۔ پس تو خلقت کے لیے جو کچھ کرتا ہے اور خلقت کا ذکر کرتا ہے، اس کا خیر اور شر تیری ہی طرف لوٹتا ہے۔ اسی وجہ سے خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

من عمل صالحاً فلنفسه. (جاثیہ: ع ۲)	جس نے نیک عمل کیا اس نے اپنے لیے کیا، اور جس نے بدی کی اس نے بھی اپنے ہی حق میں کی۔
فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یراہ. (زلزال)	جس نے رائی کے دانہ کے برابر بھی نیکی کی ہے وہ اسے دیکھ لے گا۔ جس نے رائی کے دانہ کے برابر بدی کی ہے وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔

فرشتوں کی پیش بینی

سوال کیا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے :

اِنّی جاعل فی الارضِ خلیفۃ. میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔

فرشتوں نے کہا :

اَتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفك الدّمآء ونحن نسبّحُ بحمدكَ ونقدّسُ لك. کیا تو اس میں اسے بنانے والا ہے جو اس میں فساد کرے گا اور خون بہائے گا اور ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔

ابھی آدم نہیں آیا تھا۔ فرشتوں نے اس کے متعلق فساد کرنے اور خون بہانے کا حکم پہلے ہی کیسے لگا دیا؟

فرمایا کہ انہوں نے دو وجہ سے کہا، ایک وجہ منقول تھی اور ایک معقول۔ لیکن وہ جو منقول ہے وہ یہ ہے کہ فرشتوں نے لوح محفوظ سے پڑھ لیا کہ ایک قوم جو پیدا ہو گی اس کی صفات ایسی ہوں گی۔ پس اس سے انہوں نے خبر دی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ فرشتوں نے عقل کے طریق سے استدلال کیا کہ وہ قوم زمین سے ہو گی۔

ضروری ہے کہ وہ حیوان ہو گی اور حیوان سے ضرور یہی ظہور میں آئے گا۔ ہر چند کہ ان میں یہ معنویت ہو گی اور وہ ناطق ہوں گے۔ ان میں حیوانیت ہو گی تو وہ ناچار فسق اور خونریزی کریں گے۔ کیونکہ آدمیت کے یہ لوازمات ہیں۔ ایک دوسری قوم اس کے دوسرے معنی مراد لیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ فرشتے عقلِ محض ہیں اور وہ صرف خیر ہیں اور انہیں کسی کام میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ جیسا کہ تو خواب میں کوئی کام کرے تو اس میں تو مختار نہیں ہو گا۔ لاجرم تجھ پر اعتراض نہیں ہے۔ خواب میں خواہ تو کفر کی اور خواہ

توحید کی بات کرے اور خواہ زنا کرے۔ فرشتے بیداری میں اس کے مانند ہیں اور انسان اس کے برعکس ہے۔ انسانوں کو آرزو ہے اور ہوس ہے۔ وہ سب چیزیں اپنے لیے چاہتے ہیں۔ وہ خون کا قصد کرتے ہیں تاکہ سب کچھ انہیں ملے اور یہ حیوان کی صفت ہے۔ پس ان کا یہ حال کہ ملائکہ ہیں۔ انسانوں کے حال کی ضد ہے۔ پس ہوسکتا ہے کہ اس طریق پر ان سے خبر دی ہو کہ انہوں نے یوں کہا ہے اور اگرچہ وہاں کوئی گفتگو اور کوئی زبان نہ تھی۔ اس کی تقدیر ایسی ہے، اگر یہ دو متضاد حالتیں سخن میں آتی ہیں اور وہ اپنے حال کی خبر دیتے ہیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے شاعر کہتا ہے کہ پانی کے حوض نے کہا میں پُر ہوگیا۔ اب پانی کا حوض باتیں نہیں کرتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر حوض کے زبان ہوتی تو اس حال میں وہ یوں کہتا۔

ہر ایک فرشتہ کے باطن میں ایک تختی ہے۔ اس تختی پر سے وہ اپنی قوت کے متعلق دنیا کے حالات اور جو کچھ ہونے والا ہو پہلے ہی پڑھ لیتا ہے اور جب وہ وقت وجود میں آتا ہے جس کے متعلق اس نے پڑھ لیا اور معلوم کرلیا تھا تو خداوند تعالیٰ پر اس کے اعتقاد اور اس کے عشق و مستی میں اضافہ ہوجاتا ہے اور اسے خداوند تعالیٰ کی عظمت اور غیب دانی پر تعجب ہوتا ہے۔ عشق اور اعتقاد اور تعجب کی وہ زیادتی بغیر لفظ اور عبارت تسبیح کے ہوتی ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ ایک معمار اپنے شاگرد کو خبر دیتا ہے کہ یہ جو مکان بن رہا ہے، اس کے لیے اتنی لکڑی، اتنی اینٹیں، اتنے پتھر اور اتنی سوکھی کٹی ہوئی گھاس درکار ہوگی۔ جب مکان مکمل ہوجاتا ہے اور بے کم وبیش اتنی ہی چیزیں صرف ہوئی ہوتی ہیں تو شاگرد کا اعتقاد بڑھ جاتا ہے۔ یہ بھی اسی طرح ہے۔

فراق اور وصل میں فرق نہیں

ایک شخص نے شیخ سے پوچھا کہ مصطفیٰ ﷺ نے اس عظمت کے ہوتے ہوئے کہ:

لو لاک لما خلقت الافلاک. اے پیغمبر! اگر تجھے پیدا نہ کرتا تو میں آسمانوں کو بھی پیدا نہ کرتا۔

کہا ہے۔

یالیت ربِّ محمدٍ لم یخلق محمدًا. کاش ربِ محمد نے محمدؐ کو پیدا نہ کیا ہوتا۔

یہ کیسے ہوا؟

شیخ نے فرمایا: بات مثال سے واضح ہوتی ہے۔ میں اس کی مثال بیان کرتا ہوں تاکہ تجھے معلوم ہو جائے۔ فرمایا کہ ایک گاؤں میں ایک مرد کسی عورت پر عاشق ہو گیا۔ دونوں کا مکان اور خیمہ قریب قریب تھا۔ انہوں نے خود دادِ عیش دی۔ خوب موٹے تازے ہوئے اور پھلے پھولے۔ ان کی زندگی ایک دوسرے سے وابستہ تھی، جس طرح مچھلی صرف پانی ہی میں زندہ رہتی ہے۔ کئی سال یہ اسی طرح اکٹھے رہے۔ خداوند تعالیٰ نے ناگہاں انہیں امیر بنا دیا۔ بہت سی بھیڑیں، گائیں، گھوڑے، مال و زر، جاہ و حشم اور غلام عطا کیے۔ انتہائی جاہ و حشم اور تنعم سے انہوں نے شہر کا قصد کیا۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک بہت بڑا شاہی مکان خریدا۔ اور خیل و حشم سے اپنے اپنے مکان میں نزول فرما ہوئے۔ یہ شہر کے ایک کنارے پر تھا اور وہ دوسرے کنارے پر تھی۔ جب حالت یہاں تک پہنچی تو وہ عیش اور وصل قائم نہ رہ سکا۔ ان کا دل اندر ہی اندر جلتا، چھپ چھپ کر وہ گریہ وزاری کرتے۔ ایک دوسرے سے گفتگو کرنے کا امکان نہ رہا۔ سوزِ عشق انتہا کو پہنچ گیا اور آتش نے ان کو بکلی جلا ڈالا۔ جب سوز بالکل انتہا کو پہنچ گیا تو ان کے نالے کو قبولیت حاصل ہوئی۔ گھوڑے اور بھیڑیں کم ہونی شروع ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ انہیں اسی حالت پر لے آیا۔ لمبی مدت کے بعد وہ پھر اسی گاؤں میں اکٹھے ہوئے اور عیش اور وصل و کنار میں مشغول ہو گئے۔ فراق کی تلخی کو انہوں نے یاد کیا تو آواز آئی کہ

یالیت ربّ محمد لم یخلق محمدا. کاش ربِ محمد نے محمدؐ کو پیدا نہ کیا ہوتا۔

جب محمد ﷺ کی جان عالمِ قدس میں تنہا تھی تو وہ وصلِ حق سے بار آور تھی۔ وہ اس دریائے رحمت میں مچھلی کی طرح غوطے کھاتی تھی۔ ہر چند کہ اس دنیا میں آپ کو پیغمبری کا مقام، خلقت کی راہنمائی، عظمت، بادشاہی، شہرت اور صحابہ نصیب ہوئے۔ جب آپ پہلے عیش کی طرف دوبارہ لوٹے تو کہا کہ اے کاش میں پیغمبر نہ ہوتا اور اس دنیا میں نہ آتا کیونکہ اس وصالِ مطلق کے مقابلہ میں یہ سب ایک بوجھ اور عذاب اور مصیبت ہے۔ استحقاق اور عظمتِ باری تعالیٰ کے مقابلہ میں یہ علم اور مجاہدہ اور بندگی ایسی رہی ہے جیسے ایک آدمی نے تیری اطاعت کی، خدمت کی اور چلا گیا۔ اگر تو خدمتِ حق میں ساری زمین کو سر پر رکھ لے تو ایسا ہے کہ تو نے ایک مرتبہ سجدہ کیا۔ کیونکہ خدا کا استحقاق اور اس کا لطف مسابقت رکھتا ہے تیرے وجود اور تیری خدمت پر۔ تجھے وہ کہاں سے باہر لایا اور موجود کیا؟ اور تجھے بندگی اور خدمت کے لیے مستعد کیا تاکہ تو اس کی بندگی کی لاف مار سکے۔ یہ بندگیاں اور علوم ایسے ہیں گویا تو نے لکڑی اور نمدہ سے شکلیں بنائیں اور اس کے بعد تو نے وہ اس کے حضور میں پیش کر دیں کہ یہ شکلیں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ میں نے بنا ڈالیں۔ لیکن ان میں جان ڈالنا تیرا کام ہے۔ اگر تو انہیں جان ارزانی فرمائے تو میرا علم زندہ کر دے گا۔ اور اگر تو ان میں جان نہ ڈالے تو یہ بھی تیرا ہی فرمان ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا خدا وہ ہے:

یُحیِ و یمیتُ. وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے۔

نمرود نے کہا:

انَا اُحیِ و اُمیت. میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔

جب خداوند تعالیٰ نے اسے ملک دیا تو اس نے بھی اپنے آپ کو قادر سمجھا۔ اپنے آپ کو خدا کے حوالے نہ کیا اور کہنے لگا۔ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ اس ملک سے میری مراد عقل ہے۔ جب خداوند آدمی کو علم، زیرکی اور حذاقت عشتا ہے، تو وہ خود ہی کاموں میں اضافہ کر دیتا ہے کہ میں اس عمل اور اس کام سے کارناموں کو زندہ کرتا ہوں اور ذوق حاصل کرتا ہوں۔ کہا، نہیں!

وھو یحیی ویمیت. وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے۔

ایک آیت کی تفسیر

بڑے مولانا سے ایک آدمی نے سوال کیا کہ حضرت ابراہیمؑ نے نمرود سے کہا، میرا خدا وہ ہے جو مشرق سے سورج کو طلوع کرتا ہے اور مغرب میں اسے غروب کرتا ہے۔

فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق. خداوند تعالیٰ آفتاب کو مشرق سے طلوع کرتا ہے۔
(بقرۃ: ع ۳۵)

اگر تو خدا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کے برعکس کر دکھا۔ اس سے لازم آتا ہے کہ نمرود نے ابراہیمؑ پر الزام لگایا کہ اس نے پہلی بات چھوڑ دی اور ناگفتہ جواب دوسری دلیل میں شروع کر دیا۔ فرمایا کہ دوسرے لوگ سخت کانٹوں والی بدمزہ گھاس کھاتے ہیں، تو بھی وہی گھاس کھاتا ہے۔ دونوں مثالوں میں بات ایک ہی ہے۔ تو نے بھی اسے غلط ہی سمجھا ہے۔ اس کے معنی بہت ہیں۔ ایک معنی یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے تجھ عدم سے تجھے ماں کے پیٹ میں شکل دی، اور تیرا مشرق ماں کا پیٹ تھا۔ وہاں سے تو نے طلوع کیا۔ اور

قبر کے مغرب میں تو غروب ہوا۔ یہ سب پہلی ہی بات ہے، دوسری عبارت میں کہ

یحی و یمیت. وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔

اب اگر تو قادر ہے تو قبر کے مغرب سے باہر آ اور رحم کے مشرق کی طرف جا۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ عارف کو بندگی، مجاہدہ اور روشن علوم کے ذریعے روشنی، مستی، فرحت اور راحت ملتی ہے۔ اور اس بندگی اور طاعت کو ترک کر دینے سے وہ خوشی غروب ہو جاتی ہے۔ پس یہ دو حالتیں، بندگی اور ترکِ بندگی اس کے مشرق اور مغرب ہوئے۔ پس اگر تو زندہ کر دینے پر قادر ہے تو اس روشنی اور راحت کو جو بندگی سے طلوع ہوتی ہے تو اس حالتِ غروب میں کہ فسق و فساد اور معصیت ہے، ظاہر کر۔ یہ بندے کا کام نہیں، بندہ اسے ہرگز نہیں کر سکتا۔ یہ خدا کا کام ہے، وہ اگر چاہے تو آفتاب کو مغرب سے طلوع کر دے۔ اور اگر چاہے تو مشرق سے۔ کیونکہ :

ھو الذی یحی و یمیت. وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے۔

کافر اور مومن دونوں ہی خدا کی تسبیح کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے خبر دے رکھی ہے کہ جو شخص سیدھے راستہ پر چلتا ہے، سچائی سے کام لیتا ہے۔ انبیاء اور اولیاء کے طریق پر شریعت کی متابعت کرتا ہے، اسے ایسی خوشیاں، روشنیاں اور زندگیاں ملتی ہیں اور جب وہ اس کے برعکس کرتا ہے تو ایسی تاریکیاں، خوف، کنوئیں اور مصیبتیں پیش آتی ہیں۔ دونوں اس کے مطابق ہی عمل کرتے ہیں۔ وہ جو خداوند تعالیٰ نے وعدہ کیا ہوا ہے :

لایزید ولاینقص. وہ نہ زیادہ کرتا ہے اور نہ کم۔

سچ ثابت ہوتا رہتا ہے اور اس کی سچائی ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ پس دونوں ہی خدا کی تسبیح کرنے والے ہوئے۔ یہ ایک زبان سے اور وہ ایک زبان سے

شتاں بین. اس تسبیح کرنے والے

اور اس تسبیح کرنے والے میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔ وہ تسبیح خواں اور یہ تسبیح خواں۔ مثلاً ایک چور نے چوری کی اور اسے سولی پر چڑھادیا گیا۔ وہ بھی مسلمانوں کا واعظ ہے کہ جو چوری کرے، اس کی یہ حالت ہوتی ہے۔ اور ایک شخص کو بادشاہ نے اس کی درستی اور ایمانداری کی وجہ سے خلعت عطا کیا۔ وہ بھی مسلمانوں کا واعظ ہے۔ یہ دونوں ہی واعظ ہیں لیکن چور اس زبان سے اور امین اس زبان سے۔ لیکن ان دو واعظوں کے درمیان جو فرق ہے، تُو اسے دیکھ!

دُنیوی محبّت میں اعتدال چاہیے

فرمایا کہ تیرا دل خوش ہے، اور یہ کیسے ہے؟ اس لیے کہ تیرا عزیز دل دام کی طرح ہے۔ دام کے لیے ضروری ہے کہ وہ درست ہو تاکہ شکار کو پکڑے۔ اگر طبیعت ناخوش ہو تو دام پھٹا ہوا ہے، وہ کام کا نہیں۔ پس چاہیے کہ کسی سے دوستی میں افراط نہ ہو اور نہ دشمنی میں افراط ہو۔ کیونکہ ان دونوں سے دام پھٹ جاتا ہے۔ میانہ روی اختیار کرنی چاہیے۔ یہ دوستی جس کی افراط نہیں ہونی چاہیے۔ ماسوا سے دوستی ہے۔ لیکن خداوند تعالیٰ کے بارے میں کوئی افراط صورت پذیر نہیں ہوتی۔ اس جہت میں محبت جتنی زیادہ ہو اچھی ہے۔ اس لیے کہ ماسوا سے محبت جب افراط اختیار کرتی ہے تو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خلقت گردش کرنے والے آسمان کے تابع ہے۔ اور گھومنے والا آسمان پھرتا رہتا ہے۔ اور خلقت کے حالات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ پس جب کسی سے دوستی میں افراط ہوتی ہے تو وہ ہمیشہ اس کے لیے نیکی اور بڑائی چاہتا ہے اور یہ دشوار ہے۔ پس طبیعت مشوش ہو جاتی ہے اور جب دشمنی افراط میں ہوتی ہے تو ہمیشہ اس کی بدبختی اور نکبت چاہتا ہے، اور گھومنے والا

آسمان گردش کرتا ہے اور اس کے حالات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کسی وقت یہ حالات مسعود ہوتے ہیں اور کسی وقت منحوس۔ یہ کہ وہ ہمیشہ منحوس رہیں ایسا نہیں ہوتا۔ پس طبیعت مشوش ہو جاتی ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ سے محبت تمام دنیا میں اور تمام خلقت میں آتش پرستوں، یہودیوں، عیسائیوں اور جملہ موجودات سے چھپی ہوئی ہے۔ کوئی اپنے موجد کو اس طرح دوست نہیں رکھتا۔ اس میں دوستی چھپی ہوئی ہے۔ موانع اسے حجاب میں رکھتے ہیں۔ جب موانع اٹھ جاتے ہیں تو محبت ظاہر ہو جاتی ہے۔ موجودات کا تو کیا کہنا۔ عدم بھی اس توقع پر جوش میں رہتا ہے کہ اسے عدم سے موجود کیا جائے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ چار آدمی ایک بادشاہ کے حضور میں صف باندھے کھڑے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے اور انتظار میں ہے کہ بادشاہ منصب کو اس سے مخصوص کر دے۔ اور ان میں سے ہر آدمی دوسرے سے شرمندہ ہے کیونکہ اس کی توقع دوسرے کے منافی ہے۔ پس عدم صف بستہ خدا کے حضور میں کھڑے ہیں کہ ہمیں ہست کیجئے اور خدا سے اپنے ایجاد کا سبق پڑھتے ہیں۔ پس وہ ایک دوسرے سے شرمندہ ہیں۔ اب جبکہ عدم کی یہ حالت ہے تو موجودات کی کیا کیفیت ہو گی۔

وان من شیءٍ الا یسبّح بحمدہٖ۔ ہر شے خدا کی تسبیح اور حمد کرتی ہے۔

اس میں تعجب نہیں۔ تعجب اس میں ہے کہ

وان من لاشیءٍ یسبّح بحمدہٖ۔ ہر لاشئے اس کی تسبیح اور حمد کرتی ہے۔

کفر کا وجود بھی ضروری ہے

ترجمہ شعر: کفر اور دین دونوں ہی تیرے راستہ میں دوڑ رہے ہیں اور کہتے جاتے ہیں۔

خدا واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔

اس گھر کی بنا غفلت سے ہے اور اجسام اور عالم کا سب قوام غفلت سے ہے۔ یہ جسم جو پھلتا پھولتا ہے، یہ بھی غفلت ہی سے ہے۔ اور غفلت کفر ہے اور کفر کے وجود کے بغیر دین ممکن ہے۔ اس لیے کہ دین ترکِ کفر ہے۔ پس چاہیے کہ ایک کفر ہو جسے ترک کیا جا سکے۔ پس ہر دو ایک ہی چیز ہیں کیونکہ یہ اس کے بغیر نہیں اور وہ اس کے بغیر نہیں۔ یہ ایک دوسرے کا لازمی جزو ہیں۔ اور ان کا ایک ہی خالق ہے کیونکہ اگر ان کا خالق ایک نہ ہوتا تو یہ علیحدہ علیحدہ جزو ہوتے۔ اس لیے کہ تُو جو چیز پیدا کرتا ہے، وہ علیحدہ علیحدہ جزو ہوتے ہیں۔ پس جب خالق ایک ہے تو وہ وحدہٗ لاشریک ہوا۔

یہ آفتاب حقیقی آفتاب کی فرع ہے

کہنے لگے کہ سیّد برہان الدین بات خوب کرتا ہے۔ لیکن باتوں میں سنائی کے شعر بہت لے آتا ہے۔ فرمایا ایسا ہوتا ہے کہ کہہ دیتے ہیں، آفتاب اچھا ہے لیکن وہ روشنی دیتا ہے۔ یہ اس میں عیب ہے۔ سنائی کے اشعار کا استعمال ان باتوں کو واضح کرنے کے لیے ہے۔ چیزوں کو آفتاب ہی دکھاتا ہے۔ اور آفتاب کے نور ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ آفتاب کے نور کا مقصد یہ ہے کہ چیزیں دکھائے۔ آخر یہ آفتاب ایسی چیزیں دکھاتا ہے، جو کام میں نہیں آتیں۔ ایک آفتاب ہے جو ایسی چیزیں دکھاتا ہے جو کام میں آتی ہیں، حقیقی آفتاب یہ ہے۔ اور وہ آفتاب اس کا مجاز اور فرع ہے۔ آخر تم بھی بقدرِ عقل جزوی اس آفتاب کی طرف رغبت رکھتے ہو اور اس سے نورِ علم طلب کرتے ہو۔ تمہیں غیر محسوس چیزیں نظر آئی ہیں۔ اور تمہاری عقل بڑھتی ہے اور تم ہر استاد اور ہر دوست سے کچھ نہ کچھ سمجھنے

اور حاصل کرنے کی توقع رکھتے ہو۔ پس ہم نے سمجھ لیا، ظاہرا آفتاب کے علاوہ ایک دوسرا آفتاب ہے، جس سے حقائق اور معانی کا انکشاف ہوتا ہے اور یہ علم جزوی جس کی طرف تو گریز کرتا ہے اور جس سے تو خوش ہوتا ہے، اس بڑے علم کی فرع اور عکس ہے۔ یہ پرتو اس بڑے علم اور اصلی آفتاب کے متعلق تجھے پڑھاتا ہے کہ :

اولئك ينادون من مكان بعيد. (فصلت ع ۴): یہ لوگ قرآن کو سن کر اس کی طرف سے ایسے بے پروا ہیں کہ گویا انہیں کہیں بہت دور پکارا جارہا ہے۔

تو اس علم کو اپنی طرف کھینچتا ہے، وہ کہتا ہے کہ میں اس جگہ نہیں سماتا تو اس جگہ دیر سے پہنچتا ہے۔ میرا یہاں سمانا ناممکن ہے۔ اور اس جگہ تیرا آنا مشکل ہے۔ ناممکن کی تکوین ناممکن ہے، لیکن مشکل کی تکوین ناممکن نہیں ہے۔ پس اگرچہ مشکل ہے تو کوشش کرتا کہ تو بڑے علم سے پیوست ہو جائے اور یہ توقع نہ رکھ کہ وہ یہاں سما جائے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے اور اسی طرح اغنیاء خداوند تعالیٰ کی محبتِ غنا سے پیسہ پیسہ اور حبہ حبہ جمع کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ پرتوِ غنا سے انہیں غنا کی صفت حاصل ہو جاتی ہے۔ غنا کا پرتو کہتا ہے۔ میں تمہیں پکارتا ہوں، اس بڑے غنا سے تم مجھے ادھر کیوں کھینچتے ہو۔ میں اس جگہ نہیں سماتا۔ تم اس غنا کی طرف آؤ۔ حاصل کلام یہ کہ اصل چیز عاقبت ہے، عاقبت اچھی ہو۔ اچھی عاقبت کی یہ مثال ہے کہ وہ درخت جس کی جڑ اس روحانی باغ میں مضبوط ہو اور اس کی شاخیں، ٹہنیاں اور پھل کسی دوسری جگہ لٹکتے ہوں۔ اور اس کے پھل گر رہے ہوں۔ آخر ان پھلوں کو اس باغ میں لے آتے ہیں۔ کیونکہ جڑ اس باغ میں ہے۔ اور اگر اس کے برعکس ہو تو اگرچہ تسبیح و تہلیل کریں۔ جب اس کی جڑ اس دنیا میں ہے، اس کے پھل بھی اسی دنیا میں لے آتے ہیں۔ اور اگر دونوں ہی اس باغ میں ہوں، نور علےٰ نور!

شیخ سے دوستی

اکمل الدین[1] نے کہا: میں مولانا کا عاشق ہوں اور ان کے دیدار کی آرزو رکھتا ہوں۔ مجھے اپنی آخرت یاد نہیں آتی۔ ان اندیشوں اور مقاصد کے بغیر میں مولانا کو دوست رکھتا ہوں۔ ان کے جمال سے مجھے آرام حاصل ہوتا ہے اور ان کی عین صورت اور ان کے خیال سے مجھے لذت حاصل ہوتی ہے۔

فرمایا: اگرچہ آخرت اور خدا کا خیال دل میں نہیں آتا۔ لیکن دوستی میں وہ سب مضمر ہے۔ اور ہے۔

ایک معشوقہ رقاصہ نے خلیفہ کے سامنے چار تارہ بجایا۔ خلیفہ نے کہا:

في يديك صنعتك قالت في رجلي يا خليفة رسول الله.	اے عورت تیرے ہاتھ میں تیرا ہنر ہے۔ عورت نے کہا، میرے پاؤں میں، اے رسول کے خلیفہ!

ہمارے ہاتھوں میں خوشی اس لیے ہے کہ اس میں پاؤں کی خوشی مضمر ہے۔ پس اگرچہ مزید تفصیل کے ساتھ آخرت کو یاد نہیں کرتا۔ لیکن شیخ کو دیکھنے اور فراق شیخ سے ڈرنے میں اسے جو لذت آتی ہے، یہ اس ساری تفصیل کی ضامن ہے۔ اور وہ سب اس میں مضمر ہے۔ جیسے کوئی بیٹے کو یا بھائی کو نوازتا ہے، اور دوست رکھتا ہے تو اگرچہ فرزندی، اخوت، امید وفا، رحم و شفقت اور محبت اور دوسرے نفع جن کی امید خویش و اقارب کو ایک دوسرے سے ہوتی ہے، اس کے خیال میں نہیں آتے۔ لیکن یہ سب تفصیل ان کے باہمی تعلق میں مضمر ہوتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے لکڑی میں ہوا مضمر ہے، لکڑی خواہ مٹی میں ہو یا پانی میں۔ کیونکہ اگر اس میں ہوا نہ ہو تو آگ کو اس سے کوئی

---

[1] اکمل الدین ایک طبیب تھے اور مولانا کے مرید تھے۔

کام نہ ہو۔ اس لیے کہ ہوا آگ کا چارہ ہے اور آگ کی زندگی ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ وہ نفخ سے زندہ ہوتی ہے۔

لکڑی خواہ پانی اور مٹی ہی میں ہو، ہوا اس میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ اگر اس میں ہوا چھپی نہ ہو تو لکڑی پانی کی سطح پر نہ آئے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے تو بات کرتا ہے۔ اس بات کے لوازم کئی ہیں۔ عقل اور دماغ اور لب و دہن اور کام و زبان اور جسم کے تمام اجزا جو اعضائے رئیسہ ہیں، اور افلاک کے ارکان و طبائع اور سو ہزار اسباب جن سے یہ دنیا قائم ہے، تاکہ تو عالم صفات تک پہنچے۔ اور پھر اس کے بعد اس ذات تک بایں ہمہ یہ معانی بات سے ظاہر نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ سب چیزیں سخن میں پوشیدہ ہیں۔

مستعار سرکشی

آدمی کو روزانہ پانچ چھ بار ناکامی اور تکلیف درپیش آتی ہے۔ اس پر اسے اختیار نہیں ہوتا۔ اور یہ تکلیفیں خود اس کی طرف سے قطعاً نہیں ہوتیں بلکہ کسی غیر کی طرف سے ہوتی ہیں، اور وہ اسی غیر کا مسخر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ غیر اس کا نگہبان ہوتا ہے۔ لہٰذا برا فعل رنج دیتا ہے۔ اگر نگہبان نہ ہو تو یہ مناسب تکلیف کون دے۔ ان تمام نامرادیوں کے باوجود اس کی طبیعت اس کا اقرار نہیں کرتی اور مطمئن نہیں ہوتی کہ میں کسی کے حکم کے ماتحت ہوں۔

خلق آدم علےٰ صورتہ۔ آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

اس میں الوہیت کی صفت، جو صفتِ عبودیت کی ضد ہے، مستعار رکھ دی ہے۔ اس میں کتنی ہی سرکوبی ہو، وہ مستعار سرکشی نہیں چھوڑتا، اور ان ناکامیوں کو فراموش کر

دیتا ہے۔ لیکن اس وقت تک اسے فائدہ نہیں ہوتا جب تک اس مستعار کو اس کی ملکیت نہ بنادیں۔ جب تک یہ نہ ہو، اسے چپت سے رہائی نہیں ملتی۔

ایک عقدۂ دل کی کشود

ایک عارف نے کہا، میں ایک گلخن میں گیا، تاکہ میرے دل کی کشود ہو، کیونکہ گلخن بعض اولیاء کی گریز گاہ رہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ گلخن کے مالک کا ایک شاگرد ہے۔ اس نے کمر باندھ رکھی ہے اور کام کر رہا ہے۔ مالک اسے کہتا، یہ کر اور وہ کر۔ شاگرد بڑی پھرتی سے کام کرتا۔ مالک کو اس کی چستی اور فرمانبرداری بہت پسند آئی۔ بولا، ہاں اسی طرح چست رہ۔ اگر تو ہمیشہ پھرتیلا رہا اور ادب سے کام لیتا رہا تو میں اپنا مقام تجھے سونپ دوں گا اور تجھے اپنی جگہ بٹھاؤں گا۔ مجھے ہنسی آگئی اور میرے دل کا عقدہ کھل گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس دنیا کے تمام رؤسا اپنے نوکروں کے متعلق اسی صفت سے متصف ہیں۔

خدا ہر شے پر قادر ہے

کہا وہ نجومی کہتا ہے، تمہارا دعویٰ ہے کہ جن افلاک اور کرۂ خاکی کو میں دیکھتا ہوں، ان سے باہر کوئی چیز موجود ہے۔ میرے سامنے ان کے باہر کوئی چیز نہیں ہے۔ اور اگر وہ ہے تو مجھے دکھاؤ کہاں ہے؟

فرمایا کہ سوال ابتدا ہی سے فاسد ہے۔ اس لیے کہ تو کہتا ہے دکھاؤ وہ کہاں ہے؟ اور اس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور اس کے بعد آ اور بتا کہ تیرا اعتراض کہاں ہے؟ اور کس جگہ میں ہے۔ وہ زبان میں نہیں ہے۔ سینہ میں نہیں ہے۔ ان سب کو ریشہ ریشہ، ٹکڑے

ٹکڑے اور ذرہ ذرہ کر دے۔ دیکھ کہ اس اعتراض اور فکر کو تُو ان سب میں کہیں پاتا ہے؟ پس ہم نے سمجھ لیا کہ تیرے فکر کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ جب تُو اپنے فکر کی جگہ کو نہ سمجھا تو فکر کو پیدا کرنے والے کی جگہ کو کیونکر سمجھ سکتا ہے؟ اتنے ہزار افکار اور حالات تجھ پر وارد ہوتے ہیں، وہ تیرے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ وہ تیرے مقدور میں نہیں ہیں۔ تیرے محکوم نہیں ہیں۔ اور اگر ان کے طلوع ہونے کے مقام کو تو جانے کہ وہ کہاں ہے تو انہیں زیادہ کر دے۔ ان تمام چیزوں کی گزرگاہ تُو ہے اور تجھے خبر نہیں ہے کہ کہاں سے آتی ہیں اور کہاں جاتی ہیں اور کیا کریں گی؟ جب تُو اپنی حالت کے متعلق مطلع ہونے سے عاجز ہے تو تُو کس طرح توقع رکھتا ہے کہ اپنے خالق کے متعلق مطلع ہو؟ بیسوا کہتی ہے کہ وہ آسمان میں نہیں ہے۔ اے کتیا! تُو کیسے جانتی ہے کہ نہیں ہے؟ ہاں تو نے آسمان کا چپہ چپہ چھان مارا ہے؟ اس کے بعد توجہ دیتی ہے کہ اس میں نہیں ہے؟ اپنی بیسوا کو جسے تو گھر میں رکھتا ہے، تو نہیں جانتا تو آسمان کو تو کیسے جانے گا؟ ارے تو نے آسمان اور ستاروں کا نام سن لیا ہے اور افلاک کی باتیں کرنے لگ گیا ہے۔ اگر تجھے آسمان کی اطلاع ہوتی یا تو آسمان کی طرف گیا ہوتا تو یہ ہرزہ سرائی نہ کرتا۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ خدا آسمان پر نہیں ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ آسمان پر نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان اس پر محیط نہیں ہے، بلکہ وہ آسمان پر محیط ہے۔ وہ بے چون و چگونہ ہے۔ آسمان سے اس کا تعلق اسی طرح بے چون و چگونہ ہے جیسے اس کا تعلق تجھ سے بے چون و چگونہ ہے۔ سب کچھ اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور ہر چیز اس کی مظہر ہے۔ اور اس کے تصرف میں ہے۔ پس وہ آسمان اور اکوان سے باہر نہیں۔ اور وہ لیکن ان کے اندر بھی نہیں۔ یعنی یہ اس پر محیط نہیں ہیں، اور وہ سب پر محیط ہے۔

معمار عمارت سے لطیف تر ہے

ایک شخص نے کہا: پیشتر اس کے کہ زمین و آسمان اور کرسی پیدا ہوئے، تعجب ہے کہ خدا کہاں تھا؟ ہم نے کہا کہ یہ سوال ابتداء ہی سے فاسد ہے، اس لیے کہ خدا وہ ہے جس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ تُو پوچھتا ہے کہ وہ اس سے بھی پہلے کہاں تھا؟ آخر تیری سب چیزیں جگہ کے بغیر ہیں۔ جو چیزیں تجھ میں ہیں، کیا تو ان کو جانتا ہے، جو تُو اس کی جگہ پوچھتا ہے جو بے جگہ ہے۔ تیرے حالات اور افکار کی جگہ کا تصور کیسے بندھتا ہے؟ آخر افکار کا خالق افکار سے لطیف تر ہے۔ مثلاً یہ معمار جس نے گھر بنایا اس گھر سے لطیف تر ہے، اس لیے کہ وہ سینکڑوں ایسے گھر بنا چکا ہے۔ وہ کئی دوسرے کام اور تدبیر کر چکا ہے۔ یہ سب کچھ یک بیک نہیں ہو جاتا، وہ ایک ایک کر کے بنا سکتا ہے۔ پس معمار عمارت سے لطیف تر اور عزیز تر ہے۔ لیکن وہ لطافت نظر نہیں آتی، سوائے عمارت کے ذریعہ کے۔ اور وہ عمل جو عالمِ حس میں آتا ہے، اس لیے ہے کہ اس کی لطافت اور جمال کو ظاہر کرے۔ یہ سانس (بخارات کی صورت میں) موسم سرما میں ظاہر ہوتا ہے اور موسم گرما میں ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ نہیں کہ گرما میں سانس منقطع ہو جاتا ہے اور سانس باقی نہیں رہتا۔ بلکہ گرما لطیف ہے اور سانس بھی لطیف ہے۔ اس لیے یہ ظاہر نہیں ہوتا۔ سرما میں معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اسی طرح تیرے سب اوصاف اور معانی لطیف ہیں، وہ نظر نہیں آتے۔ وہ فعل سے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً تجھ میں حلم موجود ہے، لیکن نظر نہیں آتا۔ جب تُو کسی خطاکار کو بخشتا ہے تو حلم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تیری قہاری نظر نہیں آتی۔ جب تُو کسی مجرم پر غصے ہوتا ہے اور اسے پیٹتا ہے تو تیرا قہر نظر آجاتا ہے۔ خداوند تعالیٰ انتہائی لطافت کی وجہ سے نظر نہیں آتا۔ اس نے زمین اور آسمان پیدا کر دیئے تا کہ اس کی قدرت

اور اس کی صنعت نظر آئے۔ اسی لیے اس نے فرمایا ہے:

افلم ینظروا الی السماءِ فوقھم کیف بنیناھا. کیا آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ ہم نے اسے کیسا بنایا ہے؟

میرا سخن میرے ہاتھ میں نہیں ہے، اسی وجہ سے مجھے افسوس ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں، دوستوں کو وعظ کروں، مگر سخن میرا مطیع نہیں ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ لیکن اس لحاظ سے کہ میرا سخن مجھ سے بلند تر ہے اور میں اس کا محکوم ہوں، بہت خوش ہوتا ہوں۔ اس لیے کہ وہ بات جو خداوند تعالیٰ کہتا ہے، جہاں بھی جاتی ہے زندہ کرتی ہے اور بڑا اثر کرتی ہے۔

وما رمیت اذا رمیت ولکن اللہ رمٰی. (سورہ انفال: ع ۲) جب تُو نے تیر چلایا تو تُو نے نہیں بلکہ اللہ نے تیر چلایا۔

جو تیر خدا کی کمان سے نکلتا ہے، اسے کوئی ڈھال اور کوئی زرہ بکتر نہیں روک سکتی۔ اس لحاظ سے میں خوش ہوں۔ اگر انسان میں صرف علم ہی علم ہوتا اور جہالت نہ ہوتی تو آدمی جل جاتا اور باقی نہ رہتا۔ پس جہالت مطلوب ٹھہری اس لحاظ سے کہ وجود کی بقا اس سے ہے، اور علم اس لحاظ سے مطلوب ہے کہ وہ معرفتِ الٰہی کا وسیلہ ہے۔ پس یہ دونوں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ اور سب ضدیں ایسی ہی ہیں۔ رات اگرچہ دن کی ضد ہے۔ لیکن اس کی مددگار ہے۔ اور یہ دونوں ایک ہی کام کرتے ہیں۔ اگر ہمیشہ رات ہوتی تو کوئی کام نہ ہو سکتا اور کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اور اگر ہمیشہ دن ہوتا تو آنکھ اور سر اور دماغ خیرہ رہتے اور دیوانہ ہوتے، اور معطل رہتے۔ پس رات کو آرام کرتے ہیں اور سوتے ہیں۔ اور دماغ، فکر، ہاتھ، کان، آنکھ سب کے سب قوت حاصل کرتے ہیں۔ اور دن کے وقت ان قوتوں کو خرچ کرتے ہیں۔ لیکن تمام اضداد ہمیں اضداد معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اس حکیم

کے نزدیک وہ سب ایک ہی کام کرتی ہیں، اور وہ اضداد نہیں ہیں۔ دنیا میں کوئی بد آدمی کہاں ہے، جس میں نیکی نہ ہو۔ اور کون سا آدمی نیک ہے جس میں بدی بالکل نہیں ہے؟ ایک مثال لیجیے، ایک آدمی نے کسی کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ خوبصورت عورت سامنے آ گئی۔ وہ اس سے زنا میں مصروف ہو گیا۔ اس زنا کی وجہ سے اس سے وہ خون نہ ہو سکا۔ اب زنا حیثیت زنا کے بُرا ہے۔ لیکن اس وجہ سے کہ اس نے ایک قتل کی واردات کو روک دیا، نیک ہے۔ پس بدی اور نیکی ایک چیز ہیں۔ ان کے اجزا علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں۔ آتش پرستوں سے ہماری بحث اسی بناء پر ہے۔ وہ کہتے ہیں، خدا دو ہیں، ایک نیکی کا خالق اور دوسرا خالقِ شر۔ اب تو مجھے خیرِ بے شر دکھا تاکہ میں قائل ہو جاؤں کہ شر کا ایک خدا ہے اور ایک خیر کا خدا ہے۔ اور یہ ناممکن ہے، اس لیے کہ خیر شر سے جدا نہیں ہے۔ جب خیر اور شر دو نہیں ہیں تو دو خالق ناممکن ہوئے۔ ہم تم پر لازم قرار نہیں دیتے کہ تم ضرور یقین کر لو کہ ایسا ہی ہے۔ ہم کہتے ہیں، اس سے تم میں ظن پیدا ہوتا ہے کہ مبادا ایسا ہی ہو جیسا کہ وہ کہتے ہیں۔ یہ تسلیم شدہ ہے، مگر یقینی نہیں کہ ایسا ہو۔ تمہیں کیسے یقین آ گیا کہ ایسے نہیں ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ اے کافر!

الایظن اولئك انهم مبعثون لیوم عظیم۔ (سورۂ تطفیف: ع ۱)	کیا انھیں خیال نہیں آتا کہ قیامت کے بڑے سخت دن یہ لوگ اٹھائے جائیں گے۔

ظنیت بھی ظاہر نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ وعدے جو ہم نے کیے مبادا کہ سچے ہوں۔ اور کافروں سے مواخذہ اس بنا پر ہو گا کہ کیا تیرے خیال میں نہ آیا؟ تو نے کیوں احتیاط نہ کی اور ہمارا طالب نہ ہوا؟

فضیلت محض خدا کی عنایت ہے

مافضل ابوبکرٍ بکثرۃ صلوۃ وصوم وصدقۃ بل وقیر بما فی قلبہ.
ابوبکرؓ کی فضیلت نماز، روزہ، صدقہ کی بنا پر نہیں بلکہ اس شے کی بنا پر ہے، جو ان کے دل میں ہے۔

فرماتے ہیں کہ دوسروں پر حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ نماز بہت پڑھتے تھے اور روزے بہت رکھتے تھے، بلکہ اس وجہ سے کہ ان پر عنایت ہے اور یہ ان کی محبت ہے۔ قیامت کے دن جب نمازوں کو لائیں گے تو انہیں ترازو میں رکھیں گے اور اسی طرح روزوں اور صدقات کو۔ لیکن جب محبت کو لائیں گے تو وہ ترازو میں نہیں سمائے گی۔ پس اصل چیز محبت ہے۔ اب جب تُو اپنے آپ میں محبت دیکھے تو اسے بڑھا تاکہ وہ زیادہ ہو۔ جب تو اپنے آپ میں سرمایہ دیکھے، اور وہ طلب ہے، تو اس سرمایہ یعنی طلب کو بڑھا کیونکہ :

فی الحرکاتِ برکات.
حرکتوں میں برکت ہے۔

اور اگر تو اسے نہ بڑھائے گا تو سرمایہ تجھ سے جاتا رہے گا۔ تو زمین سے کم نہیں ہے۔ زمین کو حرکات سے اور کدال سے الٹ پلٹ کر متغیر کر دیتے ہیں اور وہ شکر دیتی ہے۔ اور جب اسے ترک کر دیتے ہیں، تو وہ سخت ہو جاتی ہے۔ پس جب تو اپنے آپ میں طلب دیکھے تو آ اور جا، اور یہ نہ کہہ کہ اس جانے میں کیا فائدہ ہے؟ تو جا، فائدہ خود ظاہر ہو جائے گا۔ کسی مرد کا دوکان کی طرف جانا بغیر حاجت کے نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ روزی دیتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ گھر میں بیٹھ جائے تو یہ استغنا کا دعویٰ ہے۔ روزی نہیں آئے گی۔ عجیب بات ہے کہ ماں اس بچے کو دودھ دیتی ہے جو روئے۔ اگر بچہ یہ خیال کرے کہ میرے اس رونے کا کیا فائدہ ہے، اور رونا دودھ دینے کا موجب ہے تو دودھ سے رہ جائے۔ ہم دیکھتے

ہیں کہ اس سبب سے اسے دودھ پہنچتا ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ اس رکوع اور سجود میں کیا فائدہ ہے؟ اور میں یہ کیوں کروں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب تو کسی امیر یا کسی رئیس کے سامنے اسی طرح حاضر ہوتا ہے، رکوع میں جاتا ہے اور تعظیم سے دو زانو ہو کر بیٹھتا ہے تو آخر وہ امیر تجھ پر رحم کرتا ہے اور تجھے روٹی کا ٹکڑا دیتا ہے۔ وہ چیز جو امیر میں رحم پیدا کرتی ہے، امیر کا گوشت پوست نہیں ہے۔ مرنے کے بعد وہ گوشت اور پوست اپنی جگہ ہے۔ اور خواب اور بے ہوشی میں بھی۔ لیکن اس کے سامنے اس گوشت اور پوست کی حاضری بے فائدہ ہے۔ پس ہم نے سمجھ لیا کہ امیر میں جو رحم ہے، وہ نظر نہیں آتا اور دکھائی نہیں دیتا۔ پس جب ممکن ہے کہ گوشت پوست میں کسی چیز کی ہم خدمت کریں جو نظر نہیں آتی تو گوشت اور پوست سے باہر بھی ممکن ہے۔ اور اگر وہ چیز جو گوشت اور پوست میں چھپی ہوئی ہے، نہ ہوتی تو ابو جہل اور مصطفےٰ ایک ہوتے، اور ان میں فرق نہ ہوتا۔ ظاہر کے اعتبار سے بہرے اور سننے والے کان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ بھی جسم کا حصہ ہے اور وہ بھی۔ البتہ جو شنوا نہیں ہے، اس میں پنہاں ہے، وہ نظر نہیں آتا۔ پس اصل چیز وہ عنایت ہے۔ تو جو ایک امیر آدمی ہے، تیرے دو غلام ہیں۔ ایک نے تیری بہت خدمت کی، اور تیری خاطر بہت سفر کیا۔ اور دوسرا خدمت کرنے میں کاہل ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس خدمت کرنے والے کی نسبت تو کاہل غلام سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اگرچہ تو خدمت کرنے والے غلام کو ضائع نہیں کرتا، لیکن ایسا ہو جاتا ہے۔ عنایت پر حکم نہیں چلایا جا سکتا۔ یہ دائیں آنکھ اور بائیں آنکھ دونوں بظاہر ایک ہیں۔ عجیب بات ہے۔ دائیں آنکھ کونسی خدمت کرتی ہے، جو بائیں آنکھ نہیں کرتی۔ اور دایاں ہاتھ کیا کام کرتا ہے جو بایاں نہیں کرتا۔ اور اسی طرح دایاں پاؤں۔ لیکن عنایت دائیں آنکھ پر ہوئی۔ اور اسی طرح جمعہ نے باقی دنوں پر فضیلت پائی کیونکہ :

عند الله ارزقاً غیرا رزاق کتبت لہٗ فی للوح فلیطلبها فی یوم الجمعۃ.	خدا کے یہاں رزقِ مقسوم کے علاوہ اور بھی رزق ہے، اسے جمعہ کے روز طلب کرنا چاہیے۔

اب اس جمعہ نے کونسی خدمت کی جو دوسرے دنوں نے نہ کی؟ اصل بات یہ ہے کہ عنایت اس پر ہوئی اور یہ بزرگی اس سے مخصوص ہو گئی۔ اب اگر ایک اندھا کہے کہ مجھے اندھا پیدا کیا گیا ہے، میں معذور ہوں، تو اس کے یہ کہہ دینے سے کہ میں اندھا ہوں اور معذور ہوں، فائدہ نہیں ہوتا۔ اور اس سے تکلیف دور نہیں ہوتی۔ یہ کافر جو کفر دکھ کی حالت میں ہیں۔ آخر کفر کی تکلیف میں ہیں اور پھر جب ہم نظر کرتے ہیں تو وہ تکلیف بھی عین عنایت ہے۔ جب وہ راحت میں کردگار کو بھول جاتے ہیں تو تکلیف میں اسے یاد کرتے ہیں۔ پس دوزخ معبد ہے اور کافروں کی مسجد ہے۔ اس لیے کہ وہاں خدا کو یاد کرتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے قید خانہ میں، مصیبت میں اور دانتوں کے درد میں۔ اور جب تکلیف آئے تو غفلت کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔ خداوند تعالیٰ کی حضوریٔ کے قائل ہو جاتے ہیں اور آہ وزاری کرتے ہیں کہ یارب! یارحمٰن! یاحق! یااللہ! صحت ہو جاتی ہے۔ پھر غفلت کا پردہ سامنے آجاتا ہے۔ کہتا ہے مجھے خدا نہیں ملتا۔ میں اسے نہیں دیکھتا۔ کیا ڈھونڈوں! یہ کیا بات ہوئی کہ تکلیف کے وقت تُو نے اسے دیکھ لیا اور وہ تجھے مل گیا۔ اس گھڑی تو اسے نہیں دیکھتا۔ پس جب تو تکلیف میں اسے دیکھتا ہے، تجھ پر تکلیف مستولی کر دیتے ہیں تاکہ تو خدا کا ذکر کرتا رہے۔ پس راحت میں دوزخ ہوا کہ اس میں خدا سے غفلت رہی۔ اور خدا کو یاد نہ کیا۔ دوزخ میں رات دن ذکرِ خدا کرتا ہے۔ جب دنیا، آسمان، زمین، چاند، سورج، سیارے، نیک اور بد انسانوں کو اس لیے پیدا کیا گیا کہ اسے یاد کریں۔ اس کی بندگی بجا لائیں اور تسبیح کریں۔ اب جب کافر راحت میں یہ نہیں کرتے اور ان کی

پیدائش کا مقصد یہ ہے تو وہ جہنم میں جاتے ہیں تاکہ وہ ذکر کریں۔ لیکن مومنوں کو تکلیف کی حاجت نہیں ہے۔ یہ راحت میں اس تکلیف سے غافل نہیں ہیں اور اس تکلیف کو ہمیشہ موجود دیکھتے ہیں۔ جس طرح ایک عقلمند لڑکے کا پاؤں ایک مرتبہ ہی کاٹھ میں ڈال دیں تو وہ کافی ہوتا ہے اور وہ کاٹھ کو نہیں بھولتا۔ لیکن احمق لڑکا کاٹھ کو بھول جاتا ہے۔ اسے ہر لحظہ کاٹھ چاہیے۔ اسی طرح ایک زیرک گھوڑے کو ایک ہی دفعہ مہمیز لگانا کافی ہے، اسے دوسری مرتبہ اس کی حاجت نہیں ہوتی۔ وہ سوار کو کئی کوس لے جاتا ہے، اور اس مہمیز کی نوک کو نہیں بھولتا۔ لیکن بے وقوف گھوڑے کو ہر لحظہ مہمیز چبھونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ انسان کو اٹھانے کے لائق نہیں ہوتا، اس پر گوبر لادتے ہیں۔

شنیدہ مانندِ دیدہ

کان کا کسی بات کو متواتر سننا دیکھنے کا کام دیتا ہے، اور رؤیت کا حکم رکھتا ہے۔ جیسے تو اپنے ماں باپ سے پیدا ہوا۔ تجھے کہتے ہیں کہ تُو ان سے پیدا ہوا۔ تُو نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا کہ ان سے پیدا ہوا۔ لیکن یہ بات بہت زیادہ کہنے سے تیرے نزدیک حقیقت بن گئی۔ اب اگر کہیں کہ تو ان سے پیدا نہیں ہوا تو تُو نہیں سنتا۔ اور اسی طرح خلقت سے تُو نے تواتر کے ساتھ بہت سُنا کہ بغداد اور مکہ دو شہر موجود ہیں۔ اگر کہیں وہ نہیں ہیں، اور قسم کھائیں تو بھی تُو یقین نہیں کرے گا۔ پس ہم نے سمجھ لیا کہ جب کان متواتر کوئی بات سنتے ہیں تو وہ دیکھنے کا حکم رکھتے ہیں۔ اس طرح از روئے ظاہر متواتر گفتگو کو دید کا مرتبہ دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کی ایک ہی گفتگو متواتر کا حکم رکھے کیونکہ دراصل وہ ایک نہیں سو ہزار ہے۔ پس اس کی ایک گفتگو سو ہزار گفتگو ہوئی۔ اور تجھے اس پر کیا تعجب

آتا ہے؟ یہ بادشاہ ظاہرا طور پر سو ہزار حکم رکھتا ہے۔ اگرچہ وہ ایک ہی ہے۔ اگر سو ہزار آدمی کہیں تو بھی یقین میں اضافہ نہیں ہو گا۔ اگر وہ خود کہے تو اضافہ ہو سکتا ہے۔ پس جب ظاہر میں یہ ہے تو عالم ارواح میں اس سے بہتر ہے۔ خواہ تو ساری دُنیا میں پھرا، جب تو اس کی خاطر نہیں پھرا تو تجھے دنیا کے گرد دوسری مرتبہ پھرنا چاہیے کہ :

قل سیروا فی الارض ثم انظروا کیف کان عاقبة المکذبین۔ (سورہ انعام :ع ۲)	اے پیغمبر! ان سے کہو کہ زمین پر چلو پھرو، پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔

وہ سیر میری خاطر نہ تھی، بلکہ لہسن اور پیاز کی خاطر تھی۔ جب تو اس کی خاطر نہیں گھوما تو اپنی کسی غرض کے لیے گھوما۔ وہ غرض تیرا حجاب بن گئی۔ اس نے تجھے نہ چھوڑا کہ تو مجھے دیکھتا۔ جس طرح بازار میں تو کسی کو کوشش کر کے بلاتا ہے تو کسی دوسرے کو تو نہیں دیکھتا۔ اور اگر دیکھتا بھی ہے تو خلق کو اپنے خیال ہی میں دیکھتا ہے۔ یا کسی کتاب میں تجھے ایک مسئلہ کے حل کی تلاش ہوتی ہے۔ چونکہ تیرے کان، آنکھیں اور ہوش اس ایک مسئلہ سے بھرے ہوتے ہیں۔ تو اس سے ورق الٹاتا جاتا ہے اور کسی چیز کو نہیں دیکھتا۔ پس جب تیری نیت اور مقصد اس کے علاوہ رہا تو جہاں بھی پھرا ہو گا، اس مقصد سے پر رہا ہو گا۔ اسے نہیں دیکھا ہو گا۔

فقیہ کی تعریف

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک شخص تھا۔ وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا بیٹا اسے دودھ دیتا۔ اور بچوں کی طرح اس کی پرورش کرتا۔ حضرت عمرؓ نے اس کی بیٹی سے فرمایا کہ اس زمانہ میں باپ پر جو تو حق رکھتی ہے، وہ حق کوئی بیٹا نہیں رکھتا۔ اس نے

جواب دیا۔ آپ سچ فرماتے ہیں، لیکن مجھ میں اور میرے باپ میں فرق ہے۔ میں اس کی خدمت میں کوتاہی نہیں کرتی۔ لیکن باپ جب میری خدمت کرتا تھا تو وہ کانپتا تھا کہ مجھے کوئی دکھ نہ ہو۔ اب میں باپ کی خدمت کرتی ہوں تو رات دن دعا مانگتی ہوں، اور خدا سے اس کی موت چاہتی ہوں تاکہ اس کی زحمت مجھ سے منقطع ہو۔ میں باپ کی خدمت تو کرتی ہوں مگر وہ اس کا مجھ پر کانپنا کہاں سے لاؤں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

هٰذِهِ افقهُ من عمر. یہ عورت عمرؓ سے بڑھ کر فقیہ ہے۔

یعنی کہ میں نے ظاہر پر حکم کیا۔ اور تو نے اس کا مغز کہہ دیا۔ فقیہ وہ ہوتا ہے جو کسی چیز کے مغز سے مطلع ہو۔ اس کی حقیقت کو جانتا ہو۔ افسوس عمرؓ پر کہ وہ حقیقت اور راز سے واقف نہ ہوا۔

بے شک صحابہ کی سیرت ایسی تھی کہ وہ اپنے آپ کو شکست دیتے اور دوسروں کی مدح کرتے۔

لرزنے والوں کی خدمت کرو

بہت سے لوگ ہیں جنہیں حضوری کی طاقت نہیں ہوتی۔ غیبت میں ان کا حال اچھا رہتا ہے۔ جیسے دن کی تمام روشنی آفتاب سے ہے۔ اگر کوئی آدمی سارا دن قُرصِ آفتاب ہی پر نظر رکھے تو اس سے کوئی کام نہ ہو، اور اس کی آنکھ خیرہ ہو جائے۔ اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ کسی کام میں لگا رہے اور یہ نظر سے قرصِ آفتاب کی غیبت ہے۔ اور اسی طرح بیمار کے سامنے اچھے کھانوں کا ذکر اس کے حصولِ قوت واشتہا کے لیے ہیجان آور ہے۔ البتہ ان کھانوں کی موجودگی سے اس کا نقصان ہے۔ پس معلوم ہوا کہ خدا کی

طلب میں لرزہ اور عشق چاہیے۔ جس کسی کو لرزہ نہ ہو اس پر لرزنے والوں کی خدمت کرنا واجب ہے۔ کوئی پھل درخت کے تنے پر نہیں لگتا، اس لیے کہ تنا لرزتا نہیں۔ شاخوں کے سرے لرزاں ہیں، اس لیے انہیں پھل لگتے ہیں۔ تنا شاخوں کے سروں کو تقویت دیتا ہے۔ اور پھل کی وجہ سے وہ کلہاڑے کے زخم سے خود بھی محفوظ رہتا ہے۔ اور جب درخت کے تنے کا لرزہ کلہاڑے کی وجہ سے ہوگا تو اس کا نہ لرزنا اور سکون پذیر رہنا ہی بہتر ہے، تاکہ وہ لرزنے والوں کی خدمت کرتا رہے۔

کمال پر زیادتی نقصان ہے

اس لیے کہ "معین الدین" ہے، "عین الدین" نہیں ہے۔ یہ میم کی زیادتی کی وجہ سے ہے:

الزیادة علی الکمالِ نقصان. کمال پر زیادتی نقصان ہے۔

میم کی وہ زیادتی نقصان ہے۔ جس طرح چھ[۱] انگلیاں ہیں۔ اگرچہ یہ زیادہ ہیں، مگر نقصان ہوتا ہے۔ احد کمال ہے اور احمد ابھی مقامِ کمال پر نہیں ہے۔ جب میم اٹھ جائے تو وہ بکلی کمال ہو جاتا ہے، یعنی خدا سب پر محیط ہے۔ اس پر تو جو بھی زیادتی کرے گا نقصان ہوگا۔ یہ ایک کا عدد تمام اعداد کے ساتھ ہے اور اس کے بغیر کوئی عدد ممکن نہیں ہے۔

سید برہان الدین نے ایک بڑے فائدہ کی بات فرمائی۔ ان کی بات کے درمیان ہی میں ایک بے وقوف نے کہا کہ ہمیں ایسی بات چاہیے جو بے مثال ہو۔ فرمایا تو بے مثال

۱؎ بیش ازیں نصرت نشاید بود کو را داوانند — چوں ز نصرت بگذری ز آنسو در خذلاں بود
عنصری از تمامے داں کہ پنج انگشت باشد دست را — باز چوں شش گردد آں افزونی از نقصان بود
(عنصری)

ہے، آ تاکہ تو بے مثال بات سنے۔ آخر تو خود بھی تو ایک مثال ہے۔ تو یہ نہیں ہے۔ یہ تیرا جسم تیرا سایہ ہے۔ جب کوئی مر جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں گزر گیا۔ اگر وہ یہ تھا تو کہاں گیا؟ پس معلوم ہوا کہ تیرا ظاہر تیرے باطن کی مثال ہے، تاکہ تیرے ظاہر سے باطن پر استدلال کریں۔ ہر چیز جو نظر آتی ہے، کثافت ہے۔ جیسے سانس گرما میں محسوس نہیں ہوتا، البتہ جب سرما ہو کثافت سے سانس نظر آتا ہے۔ نبی علیہ السلام پر واجب ہے کہ وہ قوتِ حق کا اظہار کرے اور دعوت سے تنبیہ کرے۔ البتہ اس پر واجب نہیں کہ وہ کسی کو استعداد کے مقام تک پہنچائے۔ اس لیے کہ یہ خدا کا کام ہے۔ اور خدا کی دو صفتیں ہیں: قہر اور لطف۔ انبیاء ان دونوں کے مظہر ہیں۔ جو قائل ہو جاتے ہیں، اپنے آپ کو انبیاء میں دیکھتے ہیں اور اپنی آواز اس سے سنتے ہیں۔ اور اپنی بو اس سے پاتے ہیں۔ کوئی شخص اپنے آپ کا منکر نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے انبیاء امت سے کہتے ہیں کہ ہم تم ہیں اور تم ہم ہو۔ ہم میں بیگانگی نہیں ہے۔ جب کوئی کہتا ہے کہ یہ میرا ہاتھ ہے تو اس سے کوئی گواہ نہیں مانگتے، اس لیے کہ وہ جڑا ہوا جزو ہے۔ لیکن اگر وہ کہے کہ فلاں میرا بیٹا ہے، تو اس سے گواہ مانگتے ہیں، اس لیے کہ وہ جزوِ منفصل ہے۔

اصل چیز محبوب کی رضا ہے

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ محبت خدمت کا موجب ہے۔ اور یہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ محبوب کا میلانِ طبع خدمت کا مقتضی ہے۔ اور اگر محبوب چاہے کہ محبّ خدمت میں مشغول ہو تو محبّ پر خدمت بھی لازم ہے۔ اور اگر محبوب نہ چاہے تو اس کے لیے ترکِ خدمت لازم ہے۔ ترکِ خدمت محبت کے منافی نہیں ہے۔ آخر اگر وہ خدمت نہیں کرتا

تو اس میں وہ محبت خدمت کرتی ہے۔ بلکہ اصل چیز محبت ہے۔ اور خدمت محبت کی فرع ہے۔ اگر آستین حرکت کرتی ہے تو وہ حرکت ہاتھ کی وجہ سے ہے۔ بے شک یہ ضروری نہیں کہ اگر ہاتھ حرکت کرے تو آستین بھی حرکت میں آئے۔ مثلاً ایک آدمی بہت بڑا جبہ پہنتا ہے۔ اتنا بڑا کہ وہ اس میں چھپ جاتا ہے۔ وہ جبہ اس وقت تک نہیں ہلتا جب تک وہ آدمی حرکت نہ کرے۔ ممکن نہیں کہ اس جبہ کو حرکت ہو اور اس شخص کو حرکت نہ ہو۔ بعض لوگوں نے خود جبہ کو آدمی سمجھ لیا، اور آستین کو ہاتھ خیال کر لیا ہے۔ موزہ اور شلوار کے پائنچہ پر پاؤں کا گمان کر لیا ہے۔ یہ ہاتھ اور پاؤں دوسرے ہاتھ پاؤں کی آستین اور موزہ ہیں۔ کہا کرتے ہیں، فلاں آدمی فلاں شخص کا زیردست ہے اور فلاں کا ہاتھ اتنے آدمیوں تک پہنچتا ہے۔ اور فلاں کی بات موثر ہے۔ اس سے یہ ہاتھ اور پاؤں مراد نہیں ہوتے۔

ماں باپ ایک ذریعہ ہیں

وہ امیر آیا۔ اس نے ہمیں جمع کیا اور خود چلا گیا۔ جیسے زنبور نے شہد سے موم اکٹھی کی اور خود اڑ گئی۔ اس لیے کہ اس کا وجود شرط تھا۔ اس کی بقا شرط نہیں ہے۔ ہماری مائیں اور ہمارے باپ زنبور کی مثل ہیں کہ طالب کو مطلوب سے ملا دیتے ہیں اور عاشق اور معشوق کو اکٹھے کر دیتے ہیں اور خود اچانک پرواز کر جاتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ انہیں موم اور شہد جمع کرنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ یہ خود اڑ جاتے ہیں اور موم اور شہد باقی رہ جاتے ہیں۔ اور باغبان رہ جاتا ہے۔ یہ خود باغ سے باہر نہیں جاتے۔ یہ ایسا باغ نہیں ہے، جس سے باہر جایا جا سکے۔ ہاں باغ کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ میں چلے جاتے ہیں۔ ہمارا جسم ایک

مثمور کی طرح ہے۔ اس میں خدا کے عشق کا موم اور شہد زنبور یعنی مائیں اور باپ اگرچہ ذریعہ ہیں، لیکن وہ تربیت بھی باغبان ہی سے پاتے ہیں۔ اور مثمور کو باغبان بناتا ہے۔ ان زنبوروں کو خدا تعالیٰ نے دوسری صورت دی ہے۔ اس وقت جب کہ یہ کام کرتے ہیں، ان کا لباس دوسرا ہوتا ہے۔ اس کام کے مطابق جب اس عالم میں جاتے ہیں، تو لباس تبدیل کر لیتے ہیں۔ اس لیے کہ وہاں انہیں دوسرا کام کرنا ہوتا ہے۔ لیکن دراصل وہ شخص وہی ہے جو پہلے تھا۔ جیسا مثلاً کوئی شخص جنگ پر جائے تو وہ جنگی لباس پہن لیتا ہے۔ ہتھیار باندھتا ہے۔ اور خود سر پر رکھتا ہے، اس لیے کہ جنگ کا وقت ہے۔ لیکن جب وہ محفل میں آتا ہے تو اس کو باہر ہی چھوڑ آتا ہے۔ کیونکہ اب وہ دوسرے کام میں مشغول ہو گا۔ لیکن شخص وہی ہوتا ہے۔ چونکہ تو نے اسے اس لباس میں دیکھا ہو گا، جب تو اسے یاد کرے گا تو وہ اسی شکل اور اسی لباس میں تیرے تصور میں آئے گا۔ خواہ اس نے سینکڑوں لباس تبدیل کر لیے ہوں۔

خوف میں ایک حکمت ہے

ایک شخص کی انگوٹھی ایک جگہ گم ہو گئی۔ اگرچہ انگوٹھی کو وہاں سے چور لے گئے، وہ شخص اسی جگہ کے گرد گھومتا رہا کہ میں نے یہاں انگوٹھی گم کی ہے۔ اسی طرح صاحبِ تعزیت قبر کے گرد گھومتا ہے۔ وہ بے خبر ہو کر مٹی کے ڈھیر کا طواف کرتا اور اسے چومتا ہے، یعنی کہ وہ انگوٹھی میں نے یہیں گم کی ہے۔ اسے یہاں کیسے چھوڑ دوں! خداوند تعالیٰ نے اتنی کاریگری کی اور اظہارِ قدرت فرمایا تاکہ اس نے ایک دن دو روحوں کو ایک کالبد میں حکمت الٰہی کے لیے ایک جگہ کر دیا۔ آدمی اگر جسم کے ساتھ لحد میں ایک

لمحہ بھی بیٹھے تو خوف یہ ہے کہ وہ دیوانہ ہو جائے۔ پس وہ کس طرح صورت کے دام اور قالب کی خندق سے کودے۔ وہاں کیسے رہے ؟ خداوند تعالیٰ نے انہیں دلوں کی تخویف اور تخویف کی تجدید کے لیے ایک نشان بنایا ہے، تاکہ قبر کی وحشت اور خاکِ تیرہ سے انسان کے دل میں خوف پیدا ہو۔ جیسے راستہ میں جب قافلہ کو کسی جگہ لوٹ لیتے ہیں تو لٹنے والے نشان کے لیے دو تین پتھر اوپر تلے وہاں رکھ دیتے ہیں کہ یہ خطرہ کا مقام ہے۔ یہ قبریں بھی اسی طرح خطرہ کی جگہ کے لیے نشاناتِ محسوس ہیں۔ وہ خوف ان میں اثر کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ عمل میں آئے۔ مثلاً اگر کہیں کہ فلاں آدمی تجھ سے ڈرتا ہے تو بغیر اس کے کہ اس سے کوئی فعل صادر ہو، تجھے اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس کے برعکس کہہ دیں کہ فلاں آدمی تجھ سے بالکل نہیں ڈرتا اور اس کے دل میں تیری ہیبت نہیں۔ تو تنہا یہی بات تیرے دل میں اس کے متعلق غصہ پیدا کر دیتی ہے۔

یہ بھاگنا خوف کا اثر ہے۔ تمام عالم بھاگتا ہے۔ البتہ ہر کسی کا بھاگنا اس کے حال کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان کے لیے اور قسم کا، نباتات کے لیے اور قسم کا، اور روح کے لیے اور قسم کا۔ روح کا دوڑنا بغیر قدم اور نقصان کے ہے۔ کچے انگور کو دیکھو کہ اس نے کتنی تگ و دو کی جب کہیں جا کر وہ پختہ انگور کے مقام تک پہنچا، اور اس میں مٹھاس پیدا ہوئی۔ فی الحال اس کی پہلی منزل تھی۔ وہاں تک پہنچ گیا۔ البتہ وہ دوڑتا نظر نہیں آتا۔ اور محسوس نہیں ہوتا۔ ہاں جب وہ اس مقام تک پہنچ جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ بہت دوڑا ہے، جب جا کر وہاں پہنچتا ہے۔ جیسے کوئی شخص پانی میں اترا اور کسی نے اس کا اترنا نہ دیکھا۔ جب اس نے اچانک پانی سے سر باہر نکالا تو معلوم ہوا کہ وہ پانی میں اترا تھا کہ وہ یہاں پہنچ گیا۔

صحبت کا اثر

دوستوں کے دل کو دکھ ہے جو کسی دوائی سے دور نہیں ہوتا۔ نہ سونے سے نہ چلنے پھرنے سے اور نہ کھانے سے۔ اس کا علاج صرف دیدار[ل] دوست ہے:

لقاء الخلیل شفاء العلیل. — دوست کا دیدار بیماری سے شفا ہے۔

یہ اس حد تک درست ہے کہ اگر کوئی منافق مومنوں میں آبیٹھے تو ان کی تاثیر صحبت سے اسی لحظہ مومن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ کا قول ہے:

واذا لقوا الذین آمنوا قالوا آمنا. (سورہ بقر: ع ۲) — یہ منافقین جب مومنین سے ملتے ہیں تو کہنے لگتے ہیں، "ہم مومن ہیں"۔

جب منافق پر یہ عمل ہوتا ہے تو غور کر کہ جب مومن کے پاس بیٹھتا ہے تو مومن کو کیا کیا فائدہ ہوتا ہے۔ بساط کیا ہے؟ وہ پشم ہی سے بنی ہے۔ پشم ایک عقلمند کے قرب سے ایسی منقش بساط بن گئی۔ اور یہ مکان دراصل کیا ہے؟ یہ محض خاک ہے۔ خاک عقلمند کے قرب سے ایسا اچھا مکان بن گئی۔ عقلمند کی صحبت نے جمادات پر ایسا اثر کیا۔ تو ایک مومن کی صحبت مومن پر کیا کیا کرے گی! نفس جزوی اور عقل مختصر کی صحبت سے جمادات اس مرتبہ کو پہنچ گئی اور یہ سب عقل جزوی کا سایہ ہے۔ سایہ سے جسم قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اب یہیں سے قیاس کر، کتنی عقل اور دانش چاہیے کہ اس سے یہ آسمان، چاند، سورج اور زمین کے سات طبقے پیدا ہوں۔ اور زمین اور آسمان کے درمیان جو کچھ ہے، یہ سب موجوداتِ عقلِ کل کا سایہ ہے۔ عقلِ جزوی کا سایہ اس کے سایۂ جسم سے مناسبت رکھتا ہے اور عقل کلی کا سایہ جو موجودات ہے، اس سے مناسبت رکھتا ہے۔ خداوند تعالیٰ کے اولیاء نے ان آسمانوں کے علاوہ دوسرے آسمانوں کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ کیونکہ یہ آسمان

ل تو سر بالین من برخیز اے نادان طبیب — درد مند عشق را دارو بجز دیدار نیست

ان کی نظر میں نہیں جچتے اور ان کے سامنے یہ حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ انہیں پاؤں تلے روند کر گزر جاتے ہیں۔

ترجمہ شعر: جان کی ولایت[1] میں ایسے آسمان ہیں، جو دنیا والے آسمان کے کارفرما ہیں۔

بے خبری ایک اضافی بات ہے

اور کیا ہی تعجب ہوتا ہے کہ انسانوں میں سے ایک انسان یہ خصوصیت حاصل کر لیتا ہے کہ اس کے پاؤں ساتویں آسمان پر پڑتے ہیں۔ کیا ہم سب کے سب خاک کی صنف سے نہیں ہیں؟ خداوند تعالیٰ نے ہم میں ایک ایسی قوت رکھ دی ہے، جس کی بدولت ہم اپنی نوع سے ممتاز ہو گئے ہیں۔ اور ہم اس کے متصرف ہو گئے ہیں۔ اور وہ ہماری متصرف ہو گئی ہے۔ تاکہ ہم جس طرح چاہیں، اس میں تصرف کر لیں۔ کبھی ہم اسے اوپر لے جاتے ہیں، اور کبھی نیچے رکھتے ہیں۔ کبھی ہم اس سے گھر بناتے ہیں۔ کبھی کاسہ اور کبھی کوزہ بنا لیتے ہیں۔ کبھی اسے ہم لمبا کرتے ہیں۔ کبھی ہم اسے چھوٹا کرتے ہیں۔ اگرچہ پہلے ہم وہی خاک تھے۔ اور خاک کی نوع سے تھے، لیکن خداوند تعالیٰ نے ہمیں اس قوت سے ممتاز کر دیا۔ اسی طرح ہم سب ایک جنس ہیں۔ ہم میں سے اگر بعض کو ممتاز کر دیا تو اس میں تعجب کیا۔ کیونکہ ان سے ہماری وہی نسبت ہے، جو جمادات کی ہے۔ وہ ہم پر تصرف رکھتے ہیں اور ہم ان کے تصرف سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اور وہ ہم سے باخبر ہوتے ہیں۔ یہ جو ہم بے خبر کہتے ہیں۔ ہم بے خبری محض نہیں چاہتے، بلکہ ایک چیز کے متعلق

---

[1] پارۂ خاک ترا چوں زندہ ساخت — خاکہا را جملگی باید شناخت
مردہ زایں سو بدوز آنسو زندہ ماند — خامشی ایں جانب آں طرف گویندہ اند
(مثنوی مولانا روم)

خبر، دوسری چیز کے متعلق بے خبری ہے۔ خاک بھی اس جمادیت سے باخبر ہے، جو خدا نے اسے دی ہے۔ کیونکہ اگر وہ بے خبر ہوتی تو پانی کو کیوں قبول کرتی؟ اور ہر دانہ کی دایہ گری اور پرورش کیسے کرتی؟ کوئی شخص جب کسی کام میں جدوجہد کر رہا ہو اور ہر وقت اسی خدمت پر ہو، اس کام میں اس کی بیداری اس کے علاوہ دوسرے ہر کام سے اس کی بے خبری ہوتی ہے۔ ہم اس غفلت سے غفلت کلی نہیں چاہتے۔ چاہتے تھے کہ بلی کو پکڑیں۔ اسے پکڑ سکنا کسی طرح ممکن نہ ہوا۔ ایک دن وہ بلی کسی مرغ کے شکار میں مصروف تھی۔ مرغ کے شکار میں وہ باقی دنیا سے غافل ہو گئی اور انہوں نے اسے پکڑ لیا۔ پس دنیا کے کام میں کلی طور پر مصروف نہیں ہونا چاہیے۔ دنیا کے کاموں کو سہل خیال کرنا چاہیے اور ان کا قیدی نہیں ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ ایسا نہ ہو کہ یہ رنجیدہ ہو جائے اور وہ ناراض ہو جائے۔ چاہیے کہ گنج خراب نہ ہو۔ اگر یہ ناراض ہو جائے تو وہ انہیں لوٹا دیتا ہے، لیکن اگر وہ ناراض ہو جائے تو خدا بچائے، اسے کون لوٹائے گا؟ مثلاً اگر تیرے پاس ہر قسم کا سامان ہو اور تو غرق ہونے لگے تو غرقاب ہوتے وقت تو کس چیز پر ہاتھ مارے گا؟ اگرچہ تو سب موتی ہی قبضہ میں کرنا چاہے گا۔ لیکن یقینی بات یہی ہے کہ تو سب سے قیمتی خزانہ ہاتھ میں رکھے گا، تاکہ ایک ہی موتی اور لعل کے ایک ہی ٹکڑے سے ہزار آرائش کی جا سکے۔

ایک درخت کو شیریں پھل لگتا ہے۔ اگرچہ وہ پھل اس درخت کا حصہ ہوتا ہے۔ لیکن خداوند تعالیٰ اس جزو کو کُل سے برگزیدہ بنا کر ممتاز کر دیتا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے پھل میں حلاوت ڈال دی جو باقی درخت کو نصیب نہ ہوئی۔ اس حلاوت کی وجہ سے اس جزو نے اس کُل پر فوقیت پائی۔ اور درخت کا مغز اور مقصود ٹھہرا۔ خداوند تعالیٰ کا قول ہے کہ:

بل عَجبوا اَن جاءھُم منذر مِنھم۔ (سورۂ ق: ع ۱) ان منکروں کو اس میں حیرانی ہے کہ انہیں میں سے ایک شخص ڈرانے والا ان کے پاس آیا۔

ہدایت کا سرچشمہ مصطفیٰ ہی ہیں

ایک شخص نے کہا کہ میری ایسی حالت ہے کہ اس میں محمد ﷺ اور مقرب فرشتے کے لیے بھی گنجائش نہیں۔ شیخ نے فرمایا کہ اس عجیب آدمی کی حالت یہ ہے کہ اس میں محمد ﷺ نہیں سماتے۔ محمد ﷺ کی ایسی حالت نہیں ہے کہ تیرے جیسا ناپاک خچر اس میں سما جاتا ہے۔

ایک مسخرے نے چاہا کہ بادشاہ کی طبیعت خوش کرے۔ ہر کسی نے اسے کوئی چیز دینے کا وعدہ کیا۔ کیونکہ بادشاہ بہت ہی برافروختہ تھا۔ بادشاہ غصے کی حالت میں ندی کے کنارے سیر کر رہا تھا۔ مسخرہ دوسری طرف سے بادشاہ کے پہلو میں ہو کر سیر کرنے لگا۔ (مسخرہ نے بادشاہ کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کی بہت کوشش کی) بادشاہ نے کسی طرح بھی مسخرہ کی طرف نہ دیکھا۔ مسخرہ عاجز آ گیا۔ بولا، اے بادشاہ اس پانی میں تجھے کیا نظر آتا ہے جو تو بار بار ادھر دیکھتا ہے؟ بادشاہ نے جواب دیا مجھے تو ایک دیوث نظر آ رہا ہے۔ بولا، غلام بھی اندھا نہیں ہے۔ غلام کو بھی ایک دیوث نظر آ رہا ہے۔ اب جب تجھ پر ایسا وقت آتا ہے کہ تجھ میں محمد ﷺ نہیں سماتا تو یہ عجیب بات ہے۔ لیکن محمد ﷺ کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک خچر نہ سما جائے۔ آخر تو نے جو یہ حالت پائی ہے یہ اسی کی برکت اور تاثیر سے ہے۔ اس لیے کہ خداوند تعالیٰ عطا پہلے محمد ﷺ ہی پر کرتا ہے۔ پھر اس سے اوروں کو بخشش ہوتی ہے۔ جب یہی سنت ہے، تو خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ :

السّلام علیکَ ایّها النبیُّ ورحمةُ اللهِ وبَرکاتهٗ
اے پیغمبر! تجھ پر خدا کی سلامتی اور رحمت اور برکتیں نازل ہوں۔

ہر وہ چیز جو نثار ہونے کے قابل ہے، میں نے تجھ پر نچھاور کر دی۔ اس نے

کہا:

وعلی عبادِ اللهِ الصّالحین.　　　　اور خدا کے نیک بندوں پر۔

خدا کا راستہ ڈرانے والا اور بند تھا، اور یخ بستہ تھا۔ پہلے محمد ﷺ جان پر کھیلے۔ انہوں نے گھوڑا اس راہ پر ڈالا، اس میں در آئے اور راستہ کے بند میں شگاف ڈالا۔ اب جو کوئی اس راستہ پر چلتا ہے، انہی کی ہدایت اور مہربانی سے گامزن ہوتا ہے۔ یہ راستہ پہلے انہوں نے ظاہر کیا اور اس میں جگہ جگہ نشان لگائے اور لکڑیاں گاڑیں کہ تم اِدھر نہ جاؤ اور اُدھر نہ جاؤ۔ اور اگر اس طرف جاؤ تو ثمود اور عاد قوم کی طرح ہلاک ہو جاؤ گے اور اگر اس طرف چلو گے تو مومنوں کی طرح مخلصی پاؤ گے۔ تمام قرآن میں یہی بیان ہے کہ:

فیہِ آیات بینات. (سورۂ آلِ عمران: ع ۱۰)　　اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔

یعنی ان راستوں پر ہم نے نشان لگا دیئے ہیں۔ اور اگر کوئی یہ ارادہ کرے کہ ان لکڑیوں میں سے کسی ایک لکڑی کو توڑ ڈالے تو سب اس کی مخالفت کریں کہ تو ہمارا راستہ کیوں ویران کرتا ہے؟ اور ہماری ہلاکت کے لیے کیوں کوشاں ہے؟ شاید تو کوئی ڈاکو ہے۔ اب سمجھ لے کہ پیش رو محمد ﷺ ہیں، جب تک کوئی پہلے محمد ﷺ تک نہ پہنچے ہم تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ تو کسی جگہ جانا چاہے تو پہلے عقل رہنمائی کرتی ہے۔ اس کے بعد اپنے مراتب سے اعضاء حرکت میں آتے ہیں۔ اگرچہ اعضاء کو آنکھ کی خبر نہیں، اور آنکھ کو عقل کا پتہ نہیں۔

اسباب کی حقیقت مستعار ہے

آدمی اگرچہ غافل ہے، دوسرے اس سے غافل نہیں ہیں۔ جتنا تو دنیا کے کام

میں زیادہ جدوجہد کرتا ہے، اتنا ہی حقیقتِ کار سے غافل ہو جاتا ہے۔ خداوند تعالیٰ کی رضا طلب کرنی چاہیے نہ کہ خلق کی رضا۔ کیونکہ دنیا کی رضا، محبت اور شفقت مستعار ہے اور خدا نے عاریتاً دے رکھی ہے۔ اگر وہ نہ چاہے تو جمعیت اور ذوق نہیں دیتا۔ نعمت، نان اور تنعمات کے اسباب، تکلیف اور مشقت بن کر رہ جاتے ہیں۔ پس تمام اسباب، قلم کی طرح قدرتِ حق کے ہاتھ میں ہیں۔ حرکت دینے والا اور لکھنے والا دراصل خداوند تعالیٰ ہے۔ جب تک وہ نہ چاہے قلم کو جنبش نہیں ہوتی۔ اب تو قلم پر نظر کرتا ہے، تو کہتا ہے کہ اس قلم کے لیے ایک ہاتھ چاہیے۔ تو قلم کو دیکھتا ہے۔ ہاتھ تجھے نظر نہیں آتا۔ قلم کو دیکھتا ہے، تو ہاتھ یاد آجاتا ہے۔ وہ کیا ہے، جسے تو دیکھتا اور جو کچھ تو کہتا ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ ہاتھ کو دیکھتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ جب تو ہاتھ ہے تو قلم بھی چاہیے۔ بلکہ خوبیٔ دست کے مطالعہ کی وجہ سے انہیں مطالعۂ قلم کی پروا نہیں ہوتی، اور کہتے ہیں کہ ایسا ہاتھ بغیر قلم کے نہیں ہوتا۔ جب تجھے مطالعۂ قلم میں ایسی حلاوت ملتی ہے کہ تجھے ہاتھ کی پروا نہیں رہتی تو انہیں اس ہاتھ کے مطالعہ میں جو حلاوت ملتی ہے، اس کے ہوتے ہوئے انہیں قلم کی حاجت کیسے ہو؟ جب تجھے جو کی روٹی میں حلاوت ملتی ہے، تو گندم کی روٹی کیسے یاد آئے؟ تو انہیں گندم کی روٹی ہوتے ہوئے جو کی روٹی کیسے یاد آئے؟ جب اس نے تجھے زمین پر ایک ذوق بخش دیا تو تو آسمان کی خواہش نہیں رکھتا۔ حالانکہ اصل محل ذوق آسمان ہی ہے۔ اور زمین خود آسمان سے زندگی پاتی ہے۔ بھلا اہلِ آسمان زمین کو کیا یاد کریں! اب خوشیوں اور لذتوں کو ان کے اسباب سے نہ دیکھ۔ کیونکہ اسباب کو وہ حقیقت مستعار ملی ہے۔ کیونکہ:

هو الضار والنافع.	وہی ضرر پہنچانے والا ہے اور وہی نفع دینے والا ہے۔

جب ضرر اور نفع اسی کی طرف سے ہے تو اسباب پر کیوں چپکتا ہے؟

خیر الکلام ما قلّ ودلّ. بہترین کلام وہ ہے جو قلیل ہو اور مدلل ہو۔

بہترین بات وہ ہے جو مفید ہو نہ کہ جو زیادہ ہو۔

قل ھو اللہ احد. کہہ اللہ ایک ہے۔

بظاہر ایک چھوٹی سورت ہے، لیکن افادیت کے اعتبار سے سورۂ بقر پر فوقیت رکھتی ہے۔ اگرچہ سورۂ بقرہ طویل ہے۔ حضرت نوحؑ نے ہزار برس دعوتِ حق دی۔ اس پر چالیس افراد نے اس کی پیروی کی۔ ظاہر ہے کہ مصطفےٰ علیہ السلام کو کتنا عرصہ دعوتِ حق کے لیے ملا، اس میں کتنے ممالک ان پر ایمان لے آئے۔ ان میں سے کتنے اولیاء و اوتاد ظاہر ہوئے۔ پس معتبر نہ زیادتی ہے نہ کمی۔ اصل مطلب افادیت سے ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کی مختصر سی بات لمبی بات سے زیادہ مفید ہو۔ یہ ایسا ہی ہے کہ تنور کی آگ جب انتہائی طور پر زیادہ تیز ہو تو اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ اور اس کے نزدیک نہیں جاسکتے۔ لیکن کمزور چراغ سے تو ہزاروں فائدے اٹھاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مقصود فائدہ ہے۔ بعض کے لیے یہی مفید ہے کہ وہ بات سنیں، وہ صرف دیکھیں۔ ان کا دیکھنا ہی بہت ہے اور ان کے لیے نفع مند ہے۔ اگر وہ بات سن لیں تو انہیں کافی نقصان پہنچتا ہے۔

ہندوستان سے ایک بزرگ نے بہت لمبے سفر پر کمر باندھی۔ جب وہ تبریز میں داخل ہوا تو شیخ کے کنج مکان تک جا پہنچا۔ کنج مکان کے اندر سے آواز آئی کہ واپس لوٹ جا۔ تیرے حق میں اتنا ہی نفع ہے کہ تو اس دروازے تک پہنچ گیا۔ اگر تُو شیخ کو دیکھ لے تو تجھے نقصان ہو گا۔ تھوڑی مگر مفید بات ایسی ہی ہے جیسے ایک چراغِ روشن نے ایک ناروشن چراغ کو بوسہ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ اس کے حق میں اتنا ہی بہت ہے، اور وہ مقصود کو پہنچ گیا۔ نبی آخر وہ شکل نہیں ہے، شکل نبی کا گھوڑا ہے۔ نبی دراصل وہ عشق اور محبت ہے اور وہ

ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ جس طرح حضرت صالحؑ کا ناقہ، اس کی شکل ناقہ ہے۔ نبی وہ عشق اور محبت ہے، اور وہ جاودانی ہے۔

ایک شخص نے کہا، منارہ پر صرف خدا ہی کی ثناء کیوں نہیں کی جاتی؟ محمد ﷺ کو بھی یاد کرتے ہیں۔

اس سے کہنے لگے کہ آخر محمد ﷺ کی تعریف خدا کی تعریف ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص کہتا ہے، خدا بادشاہ کو لمبی عمر دے۔ اور اس شخص کو کہ جس نے مجھے بادشاہ تک پہنچنے کا راستہ بتایا، یا جس نے مجھے بادشاہ کا نام اور اس کے اوصاف بتائے۔ اب اس کی تعریف درحقیقت بادشاہ کی تعریف ہوئی۔

نبی یہ کہتا ہے کہ مجھے کوئی چیز دو، میں محتاج ہوں۔ اپنا جبہ مجھے دے یا مال یا اپنا کپڑا مجھے دے۔ بھلا وہ جبہ اور مال کو کیا کرے گا؟ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ تیرا لباس ہلکا کر دے تاکہ آفتاب کی گرمی تجھ تک پہنچے۔ کیونکہ:

اقرضوا اللہ قرضاً حسناً۔ (سورۂ حدید) خدا کو قرضِ حسنہ دو۔

وہ صرف مال اور جبہ ہی نہیں چاہتا۔ مال کے علاوہ بھی اس نے تجھے بہت چیزیں دے رکھی ہیں۔ علم اور فکر، اور عقل اور نظر۔ مطلب یہ کہ گھڑی بھر نظر، فکر، سوچ اور عقل کو میرے لیے صرف کر۔ آخر تو نے مال انہی آلات سے حاصل کیا ہے جو میں نے تجھے دیئے ہیں۔ وہ پرندوں سے بھی اور جال سے بھی صدقہ چاہتا ہے۔ اگر تو آفتاب کے سامنے برہنہ ہو سکے تو بہتر ہے کیونکہ وہ آفتاب تجھے سیاہ نہیں کرتا بلکہ سفید کرتا ہے۔ کپڑوں کو تو ایک بار ہلکا کر دے تاکہ تو آفتاب کا ذوق دیکھے۔ ایک مدت تک تو ترشی کا عادی رہا۔ اب ایک مرتبہ شیرینی کو آزما دیکھ۔

خیال خیال میں فرق

ہر وہ علم جو دنیا میں اکتساب سے حاصل ہوتا ہے علم لدان ہے اور وہ علم جو مرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے علم ادیان ہے۔ انا الحق کے علم کا جاننا علم لدان ہے اور انا الحق ہو جانا علم ادیان ہے۔ چراغ کے نور اور آگ کو دیکھنا علم لدان ہے۔ آگ میں جلنا یا چراغ کے نور میں علمِ ادیان ہے۔ جو کچھ بھی اس دید سے ہے علمِ ادیان ہے۔ جو کچھ عقل ہے وہ علم لدان ہے۔ "دید" اور "دیدن" حقیقت ہے۔ باقی تمام علوم خیال ہیں۔ مثلاً انجینئر نے غور و فکر کیا اور مدرسہ کی عمارت خیال میں لایا۔ ہر چند کہ وہ غور و فکر درست اور ٹھیک ہے، لیکن خیال ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ یہ خیال حقیقت بن جاتا ہے اور مدرسے کو تعمیر کرا دیتا ہے۔ پھر خیال خیال میں بھی فرق ہے۔ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ کا خیال صحابہ کے خیال سے بلند ہے، اور خیال خیال میں بہت فرق ہے۔ ایک ماہر انجینئر مکان کی بنیاد رکھنے کا خیال کرتا ہے۔ ایک ایسا شخص بھی مکان کی بنیاد رکھنے کا خیال کرتا ہے جو انجینئر نہیں۔ ان دو خیالوں میں بڑا فرق ہے، اس لیے کہ انجینئر کا خیال حقیقت سے نزدیک تر ہے۔ اسی طرح عالمِ حقائق اور دید کی جہت میں فرق ہے۔ دید دید میں فرق ہے۔ پس جو کچھ وہ کہتے ہیں، سات سو پردے ہیں ظلمت کے اور سات سو پردے ہیں نور کے۔ جو کچھ عالمِ خیال ہے، وہ ظلمت کا پردہ ہے اور جو کچھ عالمِ حقائق ہے، وہ نور کے پردے ہیں لیکن ظلمت کے پردوں میں جو خیال ہیں، فرق نہیں کیا جاسکتا اور ان کی انتہائی لطافت کی وجہ سے انہیں دیکھا نہیں جاسکتا۔ حقائق میں اتنا عجیب اور گہرا فرق ہے۔ پھر بھی یہ فرق سمجھ میں نہیں آسکتا۔

عذاب ایمان پیدا کرتا ہے

اہلِ دوزخ دنیا کی نسبت دوزخ میں زیادہ اچھے رہتے ہیں۔ اس لیے کہ دوزخ میں وہ خداوند تعالیٰ سے باخبر رہتے ہیں اور دنیا میں اس سے بے خبر۔ اور خداوند تعالیٰ کے متعلق باخبر ہونے سے شیریں تر کوئی بات نہیں۔ پس وہ جو دنیا کی آرزو کرتے ہیں تو اس لیے کہ کوئی عمل کریں، تاکہ مظہر لطفِ خداوند تعالیٰ سے باخبر ہوں، اس لیے نہیں کہ دنیا دوزخ سے زیادہ اچھی ہے۔ ان منافقوں کو دوزخ کے اسفل ترین حصہ میں اس لیے ڈالتے ہیں کہ ان میں ایمان آئے۔ ان کا کفر مضبوط تھا۔ انہوں نے عمل نہ کیا، انہیں زیادہ سخت عذاب دیا جاتا ہے تاکہ انہیں خدا کی خبر ملے۔ کافر میں ایمان نہیں ہوتا۔ اس کا کفر کمزور ہوتا ہے۔ اس لیے وہ تھوڑے عذاب سے ہی خدا کے متعلق باخبر ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک چادر پر گرد پڑی ہو اور ایک قالین پر گرد پڑی ہو۔ چادر کو ایک ہی آدمی جھاڑ دے تو گرد اتر جاتی ہے۔ لیکن قالین کے لیے چار آدمی چاہئیں جو اسے زور سے جھٹکیں، جب جا کر اس کی گرد دور ہوتی ہے۔

اور وہ جو دوزخی لوگ کہتے ہیں :

افیضوا علینا من الماء اومما رزقکم اللہ۔	اللہ نے تمہیں جو رزق یا پانی دیا ہے، اس کا کچھ حصہ ہمیں بھی دو۔

خدا نہ کرے کہ وہ کھانے اور مشروبات چاہیں۔ یعنی کہ جو چیز نہیں ملی ہے اور جس سے تم ہمیشہ متمتع ہوتے ہو وہ ہمیں بھی تفویض کیجیے۔

رضا کاشفِ اسرار ہے

قرآن ایک دلہن کی طرح ہے۔ جب تو اس کی چادر کا گوشہ سرکا دے تو وہ اپنا

چہرہ تجھے دکھادیتا ہے۔ جب تو اس سے تکرار کرتا ہے اور تجھے خوشی اور شرح صدر نہیں ہوتی تو یہ ایسا ہے کہ اس نے تیرے چادر کا گوشہ سرکانے کو رد کر دیا اور تجھ سے بہانہ کیا اور اس نے تیرے سامنے اپنے آپ کو زشت رو ظاہر کیا۔ یعنی کہ میں وہ معشوق نہیں ہوں۔ وہ قادر ہے۔ جس شکل میں چاہتا ہے اپنے آپ کو دکھاتا ہے لیکن اگر تو اس کی چادر کا گوشہ نہ سرکائے، اس کی رضا طلب کرے اس کی کھیتی کو پانی دے۔ دور رہ کر اس کی خدمتیں کرے جس میں اس کی رضا ہو، اس کے لیے کوشاں رہے، تو باوجود اس کے کہ تو نے اس کی چادر کا گوشہ نہیں سرکایا، وہ تجھے اپنا چہرہ دکھادیتا ہے۔ اہل حق کی طلب کہ :

فادخلی فی عِبٰدی. وادخلی جنّتی. (سورۂ فجر)	میرے بندوں میں داخل ہو، پھر میری جنت میں داخل ہو جا۔

اللہ تعالیٰ ہر کسی سے بات نہیں کرتا۔ یہ ایسے ہی ہے کہ دنیا کے بادشاہ ہر جولاہے موچی سے بات نہیں کرتے۔ انہوں نے وزیر اور نائب مقرر کر رکھے ہیں، ان کے توسط سے بادشاہ تک راستہ ملتا ہے۔ خداوند تعالیٰ بھی ایک بندے کو چن لیتا ہے تاکہ جس کسی کو خدا کی طلب ہو، وہ اس کے پاس آئے۔ اور تمام انبیاء اسی لیے آئے ہیں کیونکہ ان کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔

وجدان

سراج الدین نے کہا کہ میں نے ایک مسئلہ بیان کیا تو میرے اندر درد ہوا۔ فرمایا وہ ایک موکل ہے جو نہیں چھوڑتا کہ تو وہ مسئلہ بیان کرے۔ اگرچہ تو اس موکل کو محسوس نہیں کرتا اور دیکھتا نہیں۔ لیکن جب تو شوق، حرکت اور رنج کو دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ

کوئی موکل ہے۔ مثلاً تو پانی میں چلتا ہے، نرم و نازک پھول اور ریحان تیرے راستہ میں آتے ہیں۔ جب تو دوسری طرف جاتا ہے تو تجھے کانٹے چبھتے ہیں۔ معلوم ہو گیا کہ اس طرف خارستان ہے اور رنج اور تکلیف ہے اور اس طرف گلستان اور راحت ہے۔ اگرچہ ان دو میں سے تو دیکھتا کسی کو بھی نہیں۔ اسے وجدان کہتے ہیں۔ یہ احساس کی نسبت زیادہ نمایاں ہے۔ بھوک، پیاس، غصہ، خوشی، سب احساسات نہیں ہیں۔ لیکن احساسات سے زیادہ نمایاں ہیں، اس لیے کہ اگر تو آنکھیں بند کر لے تو محسوس ہونے والی چیزوں کو نہیں دیکھتا۔ لیکن بھوک خود خود کسی حیلے سے دور نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح گرم غذاؤں میں گرمی اور محسوس نہ ہونے والے کھانوں میں سردی، شیرینی اور تلخی وغیرہ ہیں لیکن احساس سے زیادہ نمایاں ہے۔

آخر تو اس جسم پر کیا نظر کرتا ہے۔ اس جسم سے تیرا کیا تعلق ہے؟ تو اس کے بغیر قائم ہے، اور ہمیشہ اس کے بغیر ہے۔ اگر رات ہے تو جسم کی تو پروا نہیں رکھتا۔ اور اگر دن ہے تو کاموں میں مصروف ہے، اور یہ مصروفیت جسم سے ہرگز نہیں۔ اب اگر تو ایک گھڑی کے لیے بھی اس جسم کے ساتھ نہیں ہے تو اس کے لیے لرزتا کیوں ہے؟ دوسری جگہوں پر تو کہاں اور جسم کہاں؟

انت فی وادٍ وانا فی وادٍ. تو ایک وادی میں ہے اور میں دوسری وادی میں ہوں۔

یہ جسم ایک بہت بڑا مغالطہ ہے۔ گمان کرتا ہے کہ جسم مرا تو انسان بھی مر گیا۔ خبردار! جسم سے تیرا کیا تعلق؟ یہ ایک بہت بڑی چشمہ بندی ہے۔ فرعون کے جادوگر جب تھوڑے سے واقف ہوئے تو جسم کو فدا کر دیا۔ اور انہوں نے دیکھا کہ وہ جسم کے بغیر بھی بدستور قائم ہیں۔ اور یہ کہ جسم ان سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ اسی طرح جب

حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور انبیاء اور اولیاء اس حقیقت سے واقف ہوئے، تو جسم اور اس کی ہست وبود سے فارغ ہو گئے۔

حجاج نے (ایک مرتبہ) بھنگ پی ہوئی تھی اور دروازے پر سر دھرے چلا رہا تھا کہ دروازہ کو نہ ہلانا کہیں میرا سر نہ گر پڑے۔ اسے گمان تھا کہ اس کا سر جسم سے جدا ہے۔ اور یہ کہ وہ دروازہ کی وجہ سے قائم ہے۔ ہمارا اور خالق کا یہ حال ہے کہ سمجھتے ہیں بدن سے تعلق رکھتے ہیں اور بدن کی وجہ سے قائم ہیں۔

جسم سے سایہ کی نسبت

خلق آدم علی صورتہ۔ آدم کو خدا نے اپنی صورت پر بنایا ہے۔

بہت عورتیں ہوتی ہیں جو پردہ میں رہتی ہیں، لیکن وہ اپنا چہرہ کھول دیتی ہیں تاکہ کوئی مطلوب اپنے آپ کو آزمائے، جس طرح تو استرے کو آزماتا ہے۔ اور عاشق معشوق سے کہتا ہے، میں نہ سویا ہوں، نہ میں نے کچھ کھایا ہے اور میں تیرے بغیر ایسے ہو گیا اور ویسے ہو گیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تجھے ظاہر کرنے والے کی طلب ہے۔ تجھے ظاہر کرنے والا میں ہوں، تاکہ تو دو معشوقوں کے پاس اپنے آپ کو فروخت کرے۔ اور اسی طرح سب علماء اور ہنر مند ظاہر کرنے والے کو طلب کرتے ہیں:

کُنتُ کنزاً مخفیاً فاحببتُ ان اعرف۔ میں چھپا ہوا خزانہ تھا۔ پس میں نے پسند کیا کہ پہچانا جاؤں۔

اس نے خلق کو اپنی صورت پر پیدا کیا یعنی اپنے احکام کی صورت پر۔ اس کے احکام سب خلق میں ظاہر ہوئے۔ اس لیے کہ سب ہی خدا کا سایہ ہیں۔ اور سایہ جسم کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ اگر پانچ انگلیاں کھول دی جائیں تو ان کا سایہ بھی کھل جاتا ہے۔ اگر

کوئی رکوع میں جائے تو سایہ بھی رکوع میں جاتا ہے۔ اور اگر وہ دراز ہو تو سایہ بھی دراز ہوتا ہے۔ پس خلق ایک مطلوب ہے اور محبوب کی طالب ہے۔ کیونکہ وہ سب چاہتے ہیں کہ اس کے محب بنیں۔ اور اس کے سامنے عاجزی کرنے والے بنیں۔ اور اس کے دشمنوں کے دشمن اور دوستوں کے دوست بنیں۔ یہ سب خدا کے احکام اور صفات ہیں۔ جو وہ سایہ میں ظاہر کرتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمارا سایہ ہم سے بے خبر ہے۔ لیکن ہم باخبر ہیں۔ تاہم ہماری یہ بے خبری خدا کے علم کی نسبت سے بے خبری کا حکم رکھتی ہے۔ جو کچھ جسم میں ہوتا ہے، وہ سب کا سب سایہ میں ظاہر نہیں ہوتا۔ صرف بعض چیزیں ظاہر ہوتی ہیں۔ خدا کی ساری صفات ہمارے اس سایہ میں ظاہر نہیں۔ صرف بعض صفات ظاہر ہیں، کیونکہ :

وما اوتیتم من العلم الا قلیلا. (سورۂ بنی اسرائیل : ع ۱۰) — ہم نے تم کو بہت ہی تھوڑا علم دیا ہے۔

شکایت کی بجائے شکریہ ادا کرو

سئل عیسیٰ[1] علیه یا روح الله ایُّ شیٔ اعظمها اصعب فی الدنیا والآخرة قال غضب الله قالوا وما ینجی عن ذٰلکَ قال ان تکسر غضبکِ وتکظم غَیظك.

(حضرت) عیسیٰؑ سے سوال کیا گیا کہ روح اللہ! دنیا میں کون سی بات سب سے زیادہ مشکل ہے۔ کہا خدا کا غصہ۔ بولے اور کون سی بات اس سے نجات دلاتی ہے؟ کہا کہ تو اپنے

---

[1] گفت عیسیٰ را یکے ہشیار سر — چیست در ہستی ز جملہ صعب تر
گفت اے جاں صعب تر خشم خدا — کز ہماں دوزخ ہمی سرزد چھا
گفت ازاں خشم خدا چہ بود اماں — گفت خشم خویش اندر جہاں
(مثنوی مولانا روم)

غصے کو مارے اور پی جائے۔

اس کا یہ طریق ہوتا ہے کہ جب نفس چاہے کہ شکایت کرے، تو آدمی اس کے خلاف کرے اور شکریہ ادا کرے۔ اور اس کی تعریف میں اتنا مبالغہ کرے کہ اس کی محبت اپنے اندر پیدا کرلے۔ اس لیے کہ جھوٹ موٹ شکریہ ادا کرنا خدا سے محبت کی جستجو کرنا ہے۔ بڑے مولانا قدس اللہ سرہٗ اس طرح فرماتے ہیں کہ :

الشکایۃُ عنِ المخلوق شکایۃ عنِ الخالق. مخلوق سے شکایت گویا خدا سے شکایت ہے۔

اور فرمایا تیری عدم موجودگی میں دشمنی اور غصہ تجھ سے پنہاں ہے، جیسے آگ۔ جب تو دیکھے کہ ایک چنگاری نے جست کی ہے تو اسے وہیں جھادے، تاکہ وہ عدم کو لوٹ جائے، جہاں سے کہ وہ آئی ہے۔ اور اگر تو جوابی آگ سے اس کی مدد کرے تو اس کو ایک دوسرے عدم سے راہ مل جائے گی اور اس کو پھر عدم میں بھیجنا دشوار ہوگا۔

ادفع بالتی ھی احسن. (حم سجدہ: ع ۵) اس کو بہتر طریق سے دور کر۔

تاکہ دشمن کو دو طریق سے مغلوب کرے۔ ایک یوں کہ دشمن گوشت پوست نہیں ہے، بلکہ ایک خراب جذبے کا نام ہے۔ جب کثرتِ شکر سے وہ دُور ہو جائے گا تو اس دشمن سے بھی دُور ہو جائے گا۔ اس لیے ایک تو طبعًا ایسا ہوتا ہے کہ :

الانسان عبید الاحسان. انسان احسان کا بندہ ہوتا ہے۔

اور دوسرے جب وہ فائدہ نہیں دیکھتا، جیسے لڑکے کسی پر آوازہ کستے ہیں تو وہ گالی دیتا ہے۔ لڑکوں کی رغبت اور بڑھ جاتی ہے کہ ہماری بات اپنا کام کر گئی، اور اگر تغیر نہیں دیکھتا اور فائدہ نہیں دیکھتا تو اس کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ جب عفو کی یہ صفت تجھ میں ظاہر ہوتی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی مذمت جھوٹ ہے، غلط

بنی ہے۔ اس نے تجھے جیسا کہ تو ہے نہیں دیکھا۔ اور معلوم ہو جاتا ہے کہ مذموم وہ ہے، تُو نہیں۔ اور کوئی دلیل دشمن کو اس سے زیادہ شرمندہ نہیں کرتی کہ اس کا کوئی جھوٹ ظاہر ہو جائے۔ پس تو اس کا شکریہ ادا کر کے یا تعریف کی صورت میں اسے زہر دیتا ہے۔ اس لیے کہ وہ تیرے نقصان کا اظہار کرتا ہے۔ تو نے اپنا کمال ظاہر کر دیا۔ کیونکہ تو خدا کا محبوب ہے کہ:

والعافین عن الناس والله یحب المحسنین. (سورۂ آل عمران: ع ۱۴)	لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرنے اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

خدا کا محبوب ناقص نہیں ہوتا۔ اس کی اتنی تعریف کر کہ اس کے دوستوں کو یہ گمان ہو جائے کہ شاید اسے ہم سے اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ تجھ سے اس کا اتنا اتفاق ہے۔

ترجمہ شعر: ان کی مونچھیں نرمی سے اکھاڑ ڈال، اگرچہ وہ دولت مند ہیں۔
حکمت سے ان کی گردن توڑ دے۔ اگرچہ وہ کتنے ہی زبردست پہلوان کیوں نہ ہوں۔

وفقنا الله بهذا.	اس کی خدا ہمیں توفیق دے۔

صحت اور مال دو حجاب ہیں

بندے اور خدا کے درمیان یہی دو حجاب ہیں۔ اور باقی حجاب انہی دو سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ تندرستی اور مال ہیں۔ وہ شخص جو تندرست ہے، کہتا ہے خدا کہاں ہے؟ میں اسے نہیں جانتا، اور نہ اسے دیکھتا ہوں۔ اسی بندے کو جب تکلیف پہنچتی ہے، تو وہ

یااللہ! یااللہ پکارنا شروع کر دیتا ہے۔ اور خدا کا ہم راز اور ہم سخن بن جاتا ہے۔ پس تو نے دیکھ لیا کہ صحت اس کا ایک حجاب تھی۔ اور خدا اس درد کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ اور آدمی کے پاس جتنا مال اور سازوسامان ہو، وہ اتنے ہی اپنے مقاصد حاصل کر لیتا ہے۔ اور رات دن ان میں مصروف رہتا ہے۔ لیکن جب بے نوائی رونما ہو جاتی ہے۔ تو اسی آدمی کا نفس کمزور ہو جاتا ہے اور وہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔

ترجمہ شعر: مجھے مستی اور تہی دستی دی گئی۔ میں اس مستی اور تہی دستی کا غلام ہوں۔

خداوند تعالیٰ نے فرعون کو چار سو سال عمر، ملک، بادشاہی اور کامیابی دی۔ یہ سب حجاب تھے۔ انہوں نے اسے خدا کی حضوری سے دور رکھا۔ ایک دن بھی اسے نامرادی نہ دکھائی۔ اور دردِ سر تک نہ ہونے دیا۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ اسے خدا یاد آجائے۔ کہا تو اپنے مقصد میں مصروف رہ اور ہمیں یاد نہ کر۔ تیری راتیں اچھی رہیں۔

ترجمہ شعر: تیرے ملک سے حضرت سلیمانؑ خوش ہو گئے۔ لیکن حضرت ایوبؑ بلاؤں سے سیر نہ ہوئے۔

جتنی بڑی حقیقت اتنا بڑا حجاب

فرمایا، کہتے ہیں کہ آدمی کے نفس میں ایک شر ہے جو حیوانات اور درندوں میں نہیں ہے۔ یہ اس لحاظ سے نہیں ہے کہ آدمی ان سے بدتر ہے۔ یہ اس لحاظ سے ہے کہ خوئے بد، سرِ نفس اور نحوستیں جو آدمی میں ہیں، اس گوہر مخفی کے مطابق ہیں جو اس میں ہے۔ کیونکہ یہ اخلاقِ بد، نحوستیں اور شر اس گوہر کا حجاب بن گئے ہیں۔ یہ گوہر جتنا زیادہ نفیس، زیادہ بڑا اور زیادہ قدر و قیمت کا ہو اتنا ہی اس کا حجاب بڑا ہوتا ہے۔ پس نحوست، شر

اور اخلاقِ بد اس گوہر کے حجاب کا موجب بن گئے ہیں۔ اور اس حجاب کو دور کر سکنا ممکن نہیں ہوتا۔ بغیر بہت مجاہدات کے، اور مجاہدات کی قسمیں ہیں۔ ان مجاہدات میں سے سب سے بڑا مجاہدہ ان دوستوں میں گھل مل جانا ہے جو خداوند تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں اور اس دنیا سے منہ موڑ چکے ہیں۔ اس سے بڑا مجاہدہ کوئی نہیں کہ انسان صرف صالح دوستوں میں بیٹھے۔ کیونکہ صالح دوستوں کا دیکھنا، اس نفس کا گداز ہونا اور کرنا ہے۔ اسی وجہ سے لوگ کہتے ہیں کہ سانپ جب چالیس سال تک انسان کی شکل نہیں دیکھتا تو اژدہا بن جاتا ہے۔ یعنی اس نے کسی کو نہیں دیکھا جو اس کے شر اور نحوست کے گداز کا سبب ہو سکے۔

جس جگہ پر بھی بہت بڑا تالا لگا ہو، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہاں کوئی بڑی ہی نفیس اور قیمتی چیز ہے۔ اس طرح یہ کہ جہاں حجاب بڑا ہو، وہاں گوہر بھی بڑا ہی ہوتا ہے۔ جیسے سانپ خزانے پر ہوتا ہے۔ تو سانپ کی بدصورتی کو نہ دیکھ، خزانے کی نفیس چیزوں کو دیکھ۔

پرندوں کے بازو اور ہمت کے بازو

میرے دلدار نے کہا کہ فلاں کس چیز سے زندہ ہے۔ پرندوں اور ان کے بازوؤں اور عقلاء کی ہمتوں کے بازوؤں میں یہ فرق ہے کہ پرندے اپنے بازوؤں سے کسی جہت میں اڑتے ہیں اور عقلاء اپنی ہمتوں کے بازوؤں سے جہات سے ورے اڑ جاتے ہیں۔ ہر گھوڑے کے لیے ایک طویلہ ہوتا ہے اور ہر چوپائے کے لیے اصطبل اور ہر پرندے کے لیے آشیانہ۔

کمال عشق سے حاصل ہوتا ہے

کمال کا اقتضا اس کی طرف غیر کا میلان ہے۔ اور میلان ہمیشہ کمال کی طرف ہوتا ہے، نہ کہ کمال کا میلان نقصان کی طرف ہو۔ اللہ تعالیٰ کا کمال سب ہستیوں کا کمال ہے۔ اس کے لیے نقصان جائز قرار دینا گویا کمال اور دُنیا کے مصالح کو سلب کرنا اور جہان کو بیکار ٹھہرانا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو معدوم تجویز کرنا، دنیا کا ابطال ہے۔ تو خاص کر اللہ کی صورت گری کرتا ہے۔ اور اس کی کیفیت اور حدود طلب کرتا ہے۔ اس سے مزہ جاتا رہتا ہے۔ پس تو نے اللہ کے فعل اور کیفیت کا تصور کیا اور اللہ کا تصور کیا۔ تو نہیں جانتا کہ تجھے مزا حاصل نہیں ہوتا۔ اور اللہ کی وہ صورت اور وہ خیال نہیں ہے۔ یعنی تو طالب اور عاشق بن۔ تخیل، تصور، حدود اور کیفیت کو ترک کر اور خدا کی طرف منہ پھیر تاکہ تجھے کمال حاصل ہو۔

ظاہری اور باطنی تطہیر

آدمی ایک بہت بڑے پیالے کی طرح ہے، یا ایک برتن کی طرح۔ اس کو باہر سے غسل دینا لازم اور اندر سے غسل دینا لازم تر ہے۔ اس کے ظاہر کا غسل فرض اور باطن کا غسل فرض تر ہے۔ کیونکہ اللہ شراب پاک برتن کے سوا کہیں نہیں ڈالتے۔ پس اس نے برتن کی تطہیر کا حکم دیا۔ کیونکہ محلِ شراب اس کا باطن ہے نہ کہ ظاہر۔ ہر وہ شخص جس کا نفس تو مر گیا اور جو اخلاق ذمیمہ سے پاک ہو گیا۔ اللہ سے جاملا، خدا ہرگز نہیں۔ وہ اللہ کے راستہ سے واصل ہو گیا۔ جب اسے یہ کہہ کر پہچانتے ہیں کہ یہ وہ ہے جو اللہ سے جاملا تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے راستہ سے واصل ہو گیا۔ اس کے سوا اگر ہے

تو وہ اللہ کے راستہ سے بھٹکا ہوا ہے۔ وہ لوگوں کا اندازہ کرتا ہے خطرات میں۔ اپنے امام کے علاوہ کسی دوسرے کا کلام سن کر خود اپنے ہاتھوں میں نہ پڑ۔ جبکہ اس نے یہ جائز قرار نہیں دیا کہ تو اپنے مرشد کے علاوہ کسی کا کلام سنے تو وسوسۂ باطلہ میں پڑنا انسان کو زیادہ رسوا، فضیح اور باطل کر دیتا ہے۔

معرفت جواں مردی کے مطابق ہے۔ جو زیادہ جواں مرد ہے، زیادہ عارف ہے۔ بات اس کے لیے جان ہے۔ اگرچہ وہ بات سچی کہتا ہے۔ جب کسی جان میں کجی ہو تو وہ کجی سے پیش آتا ہے۔ اور اگر بات کج ہو، مگر جان راست ہو تو وہ راستی سے پیش آتا ہے۔ اور اگر کوئی بے قول ہو تو وہ بھی اس سے بے قول ہو جاتا ہے۔

ایک خاص مصلحت

پوچھا کہ اعمال کا فائدہ یہاں کیوں نہیں ہوتا؟ فرمایا کہ تمہارے سب اعمال کا عوض ہے۔ لیکن مصلحت کی وجہ سے یہاں ظاہر نہیں کرتے۔ جیسے باپ بیٹی کے لیے جہیز بناتا ہے اور نگاہ رکھتا ہے۔ اور شادی تک گھر میں اسے معمولی کپڑے پہناتا ہے۔ اور شادی کا دن حشر کا دن ہے۔ دوسرے بیٹا کمائی کرتا ہے۔ اور کمائی لا کر باپ کے پاس رکھ دیتا ہے۔ باپ اسے جمع کر لیتا ہے۔ اور بیٹا اس جمع شدہ کمائی کو باپ سے مانگتا ہے۔ باپ کہتا ہے ابھی وقت نہیں، صبر کر۔ اگر میں تجھے اب دے دوں تو تو اسے ضائع کر دے گا۔ اسی طرح باپ نے جو کمایا تھا، وہ اس کے ہاتھ میں دے دیں تو وہ مغرور ہو جاتا ہے۔ اسے ضائع کر دیتا ہے۔ اور اپنے آپ کو بھی ہلاک کر ڈالتا ہے۔ ان میں سے بہت سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اب خداوند تعالیٰ تمہاری بہتری کی خاطر تمہارے اعمال کا فائدہ ظاہر نہیں کرتا تاکہ تم

مغرور نہ ہو جاؤ۔ اور ضائع نہ کر بیٹھو۔ اور کاہل نہ ہو جاؤ۔ اور کام سے نہ رہ جاؤ۔

سورۂ فتح کی تعبیر

سورۂ انا فتحنا کی تفسیر میں :

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

انا فتحنا لك فتحاً مبینا. تحقیق ہم نے فتح دی تجھ کو فتح مبین۔

مولانا نے فرمایا کہ اللہ تعالٰی نے مصطفٰے ﷺ کے لیے نعمتیں اور وعدے گنائے ہیں۔ اول یہ کہ جو دروازہ تُو کھولنے کو کہتا ہے، وہ ہم نے کھول دیا۔ کیونکہ ہمارے سامنے تیری دُعا مستجاب ہے اور دوسرے :

یغفر لك اللہ ماتقدم. تیرے واسطے بخشا جو پہلے ہوا۔

مغفرت کسی کے گناہ بخشنا ہے۔ کیونکہ یہ دوستی کی نشانی ہے کہ جس کو تو دوست رکھتا ہے، اس کا گناہ تجھے گناہ دکھائی نہیں دیتا۔ اور اس کا عیب تجھے عیب معلوم نہیں ہوتا۔ یہ ہے مغفرت کا راز۔ تیسرے :

ویتم نعمة. اور وہ تمام کرے اپنی نعمت کو۔

اتمامِ نعمت اس کی خصوصیت کا بیان ہے۔ اس لیے کہ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بعض کو پوری نعمتیں نہیں ملیں۔ پس ان کا نشان خاص الخاص ہوتا ہے۔ وہ دوسروں سے زیادہ راہ یافتہ ہوتے ہیں۔ زیادہ حقیقت رسیدہ ہوتے ہیں۔ اور حق پر زیادہ قائم ہوتے ہیں۔ اور چوتھے :

وینصرك اللہ نصراً عزیزاً. اور اللہ مدد کرے تیری مدد غالب۔

سلطنت ولایت پر دلالت کرتی ہے اور یہ ولایت کہاں ہے؟ یہ نظر کی قوت ہے کہ سب چیزوں کو دیکھتی ہے کہ منجانب اللہ ہیں۔ جیسا حضرت ابراہیمؑ نے آگ پر قدم رکھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام نے دریا پر پاؤں دھرے۔ حضرت سلیمانؑ کی طرح کہ انہوں نے طوفان کو حکم دیا۔ اور حضرت داؤدؑ کی طرح کہ انہوں نے لوہے کو خمیر بنادیا۔ اور پہاڑ کو مغنی بنا دیا۔ اور حضرت عیسیٰؑ کی طرح کہ انہوں نے حیوانی ارواح پر حکومت کی اور محمد ﷺ کی طرح کہ آپ نے آسمانوں کے طبقات کے پردے پھاڑ ڈالے اور ان میں سے گزر گئے۔ ان مثالوں کا کوئی شمار نہیں۔ جب انہوں نے سب کو مامور من اللہ اور بندۂ حق سمجھا اور ہر بات خدا کی طرف دیکھی۔ تو سب ان کے مسخر ہو گئے۔ اور یہ خدا کے مسخر:

یغفرلك الله ماتقدم من ذنبك وما تاخّر. خدا تیرے لیے بخش دے جو کچھ پہلے ہوا تیرے گناہوں سے اور جو کچھ بعد میں ہوا۔

ابن عطا کہتا ہے کہ مصطفےٰ ﷺ معراج کے دوران میں سدرۃ المنتہیٰ کے درخت تک پہنچے جو عرش پر ہے، اور جس پر حضرت جبرائیل علیہ السلام کا ایک آشیانہ ہے۔ اور وہاں سے گذرے تو حضرت جبرائیلؑ نے، جو ان کے ساتھ تھے، انہیں وہاں چھوڑ دیا۔ اور جبرائیل خود واپس لوٹ پڑے۔ کہا اے میرے بھائی جبرائیل! تو نے خداوند تعالیٰ کی اس باہیبت جگہ پر مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ ندا آئی کہ کیا ان دو تین دنوں میں اس سے تجھے محبت ہو گئی؟ اس گناہ سے مراد کہ **یغفرلك الله** وہ گناہ ہے، یعنی ہم نے تجھ سے وہ پاک محبت کی اور تجھے غیر سے مستغنی کر دیا۔

ابنِ عطا کہتا ہے، انبیاء اور اولیاء کو گناہ میں مبتلا کر دیا، یہاں تک کہ انہوں نے حضوری میں گریہ زاری کی۔ جب جا کر ان کے گناہ بخشے گئے۔ لیکن مصطفےٰ ﷺ عنایتِ ایزدی کے پردے میں اس حالت سے مستور ہے کہ آپ کیے ہوئے گناہوں کے لیے

خوشامد کریں، بلحہ پہلے اور بعد کے گناہوں کو بھی معاف کر دیا۔ نام نہیں لیا کہ وہ گناہ کیا ہے۔ اس سے غرض محبت کا مرتبہ ہے کہ اس کی محبت کا مرتبہ دوسروں کی محبت کے مرتبہ سے بالا تھا۔ ابن عطاءؒ کہتا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا، میں نے تیرا گناہ بخشا جو تو نے پہلے کیا، یعنی آدم علیہ السلام کی لغزش کو۔

وما تاخر۔ اور جو تو نے بعد میں کیا۔

یعنی امت کے گناہوں کو۔ کیونکہ وہ تجھ سے امید لگائے ہیں کہ ان کی رہبری کا مقصود یہ ہے۔ کیونکہ تیرے ذریعہ کے بغیر اوّلین اور آخرین کی پہنچ نہیں۔ کہتے ہیں کہ پیغمبر علیہ السلام کا استغفار ہوشیاری میں مستی کی حالت سے تھا۔ اور بعض کہتے ہیں بلحہ مستی میں انہوں نے استغفار کیا ہوشیاری کی حالت سے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ دونوں حالتوں میں استغفار کرنے والے تھے، اس لیے کہ آپ کی نظر خدا پر تھی۔ سکر[1] اور صحو[2] بندوں سے نسبت ہے۔ کیونکہ وہ قابلِ تلوین ہیں۔ آنحضرت کی نسبت نہ سکر ہے، نہ صحو۔ پس جب آپ ناظرِ حق تھے، تو ہر دو سے استغفار کرنے والے تھے۔ اس لیے کہ مستی اور ہوشیاری دو رنگ ہیں۔ چونکہ وہ ایک بے رنگ ہستی میں محو تھے۔ دونوں سے استغفار کرنے والے ہوئے۔ یہ آپ کے قبضۂ قدرت میں تھا کہ اس لوح و قلم کی آپ شرح کرسکتے۔ شاید وہ لوح خدا کی صفت ہے۔ اس صفت کا نام لوح ہے۔ وہ درحقیقت ایک بے انتہا صفت ہے۔

ترجمہ شعر: یار کی پیشانی لوحِ محفوظ ہے۔ اس میں دونوں جہانوں کا راز ظاہر ہے۔

ترجمہ شعر: گھومنے والے گنبد کے نیچے خلق کی آنکھیں درد کرتی ہیں اور دیکھنے کے

---

[1] سکر۔ ہوش سے مستی کی حالت طاری ہونا۔

[2] صحو۔ مستی کی حالت سے ہوش میں آنا۔

قابل چیزیں بہت ہیں۔

شاید اللہ کی عنایت آشامل ہو اور اللہ ہر مشکل کو آسان کر دے۔ ہم نے کتنی چیزیں دیکھیں جو اگر طفولیت کے زمانہ میں ہم سے کہی جاتیں تو ہم نہ سمجھ سکتے۔

ترجمہ شعر: جو وقت گزر گیا، اس میں اللہ نے اچھا کیا۔ اسی طرح جو وقت باقی ہے، اس میں وہ اچھا کرے گا۔

یہ اتنی چیزیں کہ جن کے ظاہر پاک نشان مشاہدہ میں آتے ہیں، شکریہ کی مستحق ہیں۔ ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ شکریہ زیادتی کا سبب ہے۔ اگر خدا چاہے تو وہ تجھ پر اپنی نعمتیں تمام کر دیتا ہے۔ تمام نعمت محبت کی ملکیت ہے۔ اوّلین نعمت طالبِ محبت کی توفیق ہے۔ تُو محبّ ہو تو محبوب بن جاتا ہے۔ تابع ہو تو متبوع ہو جاتا ہے۔ محتاج ہو تو معراج مل جاتی ہے۔ سیاہ اور سفید سے تجھے مخلصی ہو جاتی ہے۔ تو سیاہ وسفید کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ ذاکر ہو تو مذکور بن جاتا ہے۔ منبروں پر محرابوں پر اور سکوں پر تیرا نام ہو جاتا ہے۔ خداوند تعالیٰ کا قول ہے، کہ وہ تجھے سیدھا راستہ دکھاتا ہے، یعنی وہ راستہ خدا تک پہنچا دیتا ہے۔

وینصرك الله نصراً عزیزاً۔ اللہ تیری مدد کرے، مدد غالب۔

شیاطین، جن اور وساوس پر تُو مظفر و منصور ہوتا ہے۔ اور انسان شیطانوں پر بھی جو کافر اور منافق ہیں۔ اور مظفر و منصور بھی ایسا ہوتا ہے کہ اس دولت کے زوال کا خوف تک نہیں رہتا۔

وانزل السکینہ۔ اُتاری تسکین۔

اور تسکین وہ ہوتی ہے کہ اس سے نصرت ظاہر ہو۔ تسکین یہ ہوتی ہے کہ دنیا کے اسباب میں سے جو کچھ نہ ہو خدا کے کرم پر انتہائی اعتماد سے یوں سمجھے کہ وہ سب کچھ

اس کے پاس ہے۔ کہتے ہیں تسکین وہ ہوتی ہے جو جس طرح چیزوں کے ظاہر میں فرق کیا جاتا ہے، چیزوں کے باطن میں فرق کرتی ہے۔

لیزدادُوا ایماناً. تاکہ بڑھ جائیں ایمان میں۔

یعنی ان کے دل میں ایمان کا نور روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ نئے چاند کی طرح۔

ولله جنود السموات والارض. اور اللہ کے واسطے ہیں لشکر آسمانوں کے اور زمینوں کے۔

آسمانوں کے لشکر فرشتے ہیں اور اس زمین کے مختلف قالب ہوتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ شیاطین بھی اس کے لشکر میں ہیں۔ چاہتا ہے تو اِسے غالب کرتا ہے، چاہتا ہے تو اُسے غالب کرتا ہے۔

انا ارسلناك شاهداً. ہم نے بھیجا تجھے گواہ بنا کر

قول سے، فعل سے، حال سے، اس کی توحید پر گواہ ہے۔ اس کے فعل پر گواہ ہے۔ اس کے حال پر گواہ ہے۔

وَ مُبشِراً. اور بشارت دینے والا۔

یعنی گناہ کی بخشش سے۔

و نذیراً. اور ڈرانے والا۔

ڈرانے والا بدعت اور گمراہی سے۔ وہ خدا کے دستور کے مطابق بشارت دینے والا ہے اور ڈرانے والا ہے۔ اپنی خواہش سے نہیں۔

لتومنو بالله. تاکہ تم ایمان لاؤ ساتھ اللہ کے۔

تاکہ تم راست گو کو راست گو سمجھو۔

وتعذروہ. اور اس کو طاقت دو۔

وہ جنہیں میں بزرگ اور محترم سمجھتا ہوں تم بھی ان کی عزت کرو۔ دل سے بھی، خدمت سے بھی، اور زبان سے بھی۔ خلق سے ان کی صفت کرنا اس کی بندگی ہے۔

ان الذین یبایعونك. تحقیق وہ لوگ جو تیری بیعت کرتے ہیں۔

وہ جو تیرے ساتھ پیمان استوار کرتے ہیں، ان کے متعلق کہتا ہے یعنی تجھ میں بشریت عاریتاً ہے اور واسطۂ عاریت کو بے واسطہ دیکھنا چاہئے۔

یداللہ فوق ایدیھم. اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔

یعنی اس بیعت میں خدا کا احسان ان پر ہے۔ نہ کہ ان کا احسان خدا پر۔ بعض کہتے ہیں یعنی ان کی بیعت اور ان کی قوت خدا کی قوت کے ماتحت ہے۔ اگر ان کے کام میں ان کو نہ کھینچ لاتا تو وہ بھی اس کام میں نہ پڑتے۔

ولولا رجال مؤمنون. اور اگر نہ ہوتے مرد مومن۔

سہیل عبداللہ تستریؒ نے کہا مومن راستی میں وہ شخص ہے جو اپنے نفس اور اپنے دل سے غافل نہیں ہے اور اپنے احوال کی جستجو کرتا رہتا ہے کہ فلاں وقت میں نے کیا کیا اور کیا کہا اور میں کیسے ہوا جب وہ تغیر دیکھتا ہے اس سے آغاز کرتا ہے۔ جیسا کہ چاند اور سورج کو گہن لگنے سے زمین پر مصیبت آتی ہے۔ زلزلہ سے، بادل اور بارش سے ٹڈی کے شور سے اور اس کے علاوہ کئی اور باتوں سے۔ اہل زمین کو چاہیے کہ اس حقیقت کو سمجھیں کہ یہ ان کے گناہوں کی وجہ سے ہے۔ گریہ زاری کریں تاکہ خیر گزرے اور مصیبت لوٹ جائے اور عدم کو چلی جائے۔ مومن بھی جب نور یقین کو کم دیکھتا ہے اور آنکھ سے پانی کو خشک دیکھتا ہے، تو جان لیتا ہے کہ اس کے اوقات مردہ ہیں، گریہ زاری شروع کردیتا ہے تاکہ دریائے رحمت جوش میں آجائے۔

ترجمہ شعر: جب تک حلوہ فروش کا لڑکا نہ روئے، رحمت کا سمندر جوش میں نہیں آتا۔

ترجمہ شعر: اے بھائی! طفل تیری آنکھ کا طفل ہے۔ اپنی کامیابی کو پہلے گریہ وزاری پر موقوف سمجھ۔

دنیا کی مصیبتیں، فراق کی نشانی اور خدا سے محجوب ہوجانا ہے اور یہ تغیرات اور مصیبتیں دل میں خدا کے فراق کا نشان ہیں۔ پس وہ نقصان میں زیادتی دیکھتا ہے اور زیادتی میں نقصان۔ جس طرح دوسرے لوگ دنیا کے نقصان سے ڈرتے ہیں، وہ دنیا کے زیادہ ہونے سے ڈرتا ہے۔

ترجمہ شعر: عاقل کے دل میں ہزاروں غم ہوتے ہیں اگر باغ سے ایک بھی تنکا کم ہوجائے۔

اس لیے کہ زیادہ کم کو مار ڈالتا ہے۔

اذجعل الذین کفروا فی قلوبھم الحمیة۔ یعنی متابعت کرتے ہیں نفس کی۔

مومنوں کو دکھ دے کر اور ان کے ایمان سے حسد کر کے انہیں رنجیدہ کرتے ہیں اور اپنے عیش اور نفس کی خواہش یاد دلاتے ہیں۔ اور آخر جانتے ہیں کہ مومنوں کے عیش کو نہ تو منغض کرتے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں۔ اور مومن چاہتے ہیں کہ عیشِ فانی کو عیشِ باقی سے پیوست کر کے ہمیشہ کے لیے ان کا ایک دوسرے سے پیوند لگادیں۔

وہ عیش عیش نہیں ہوتا جس میں دل گرفتگی ہو۔ ایک لحہ تو خوش ہیں اور دوسرے لحہ طبیعت پر بوجھ ہے۔

ترجمہ شعر: اے عیش سے بے خبر! آ تاکہ تو دیکھے ایسا عیش جو ازل سے ہے اور ابد سے

پیوست ہو چکا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے چالیس من گندم لے جاتا ہے۔ اور اس کے لیے بو دیتا ہے۔ اور وہ چیختا ہے کہ یہ کیا ظلم ہے۔ حالانکہ اس نے محبت سے گندم بو دی تاکہ بیج کا سلسلہ منقطع نہ ہو جائے۔

ایسی ہی ایک اور نظیر ہے۔ ایک لوہے کی انگوٹھی پر بادشاہ کا نام نقش تھا۔ اس نے سونے کی انگوٹھی سے کہا، کیا تجھ میں یہ نقش ہے؟ اس نے کہا، نہیں۔ لوہے کی انگوٹھی نے کہا، پھر میں تجھ سے بہتر ہوں۔ اس نے کہا، تیرا کیا نام ہے؟ لوہے کی انگوٹھی بولی، آہن۔ سونے کی انگوٹھی نے پوچھا۔ کیا اس نقش نے تیری آہنیت کو دور کر دیا؟ اس نے کہا، نہیں۔ سونے کی انگوٹھی نے پھر پوچھا۔ کیا میری اس بے نقشی نے مجھے سونا ہونے سے گرا دیا ہے؟ اس نے کہا، نہیں۔

سونے کی انگوٹھی بولی، بیٹھ جا اور سوچ کہ نقد کس کے پاس ہے اور مستعار کس کے پاس۔

تمام شد

"فیہ مافیہ" (جس کا اردو ترجمہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے) مولانا روم کی کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں بلکہ ان کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ آپ کے تبحر علمی کی شہرت آپ کے حینِ حیات ہی میں دُور دُور تک پہنچ چکی تھی۔ نزدیک و دُور سے اہلِ علم آپ کی مجلس میں کھنچے چلے آتے اور اپنے اپنے مسائل پیش کرتے۔ مولانا ان مسائل پر روشنی ڈالتے جس سے نہ صرف سائل ہی مطمئن ہو تا بلکہ دوسرے حاضرینِ مجلس بھی بہت کچھ استفادہ کرتے۔ ان مجالس میں مولانا جو ارشاد فرماتے آپ کے صاحبزادے سلطان بہاء الدین انہیں محفوظ کر لیتے۔ "فیہ مافیہ" انہی ارشادات کا مجموعہ ہے۔

"فیہ مافیہ" میں بیان کردہ مسائل تقریباً وہی ہیں جنہیں مولانا نے اپنی ضخیم مثنوی میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے۔ پھر 'دیوانِ شمس تبریز' میں جو تغزل ہے، وہ بھی انہی رموز و اسرار سے مملو ہے۔ یہ تمام صورتِ حال اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ 'مثنوی' اور 'دیوان شمس تبریز' کو سمجھنے کے لیے "فیہ مافیہ" کا مطالعہ بے حد مُفید ہے۔ اس کے مطالعے سے مولانا کے بنیادی تصورات سے بڑی حد تک رُوشناس ہوا جا سکتا ہے۔